آدان پردان

ہندوستانی کتابوں کا سلسلہ

سفید خون

نانک سنگھ

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

سفید خون

ہندوستانی کتابوں کا سلسلہ

سفید خون

مصنف :- نانک سنگھ
مترجم :- رتن سنگھ

UNIVERSITY LIBRARY
22 JUL 1975
ALLAHABAD.

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا
نئی دہلی

ستمبر ۱۹۷۱ء (بھدرا ۱۸۹۲)

© نانک سنگھ

قیمت ۸/۰۰

ALLAHABAD
JUL 1975
308136

Original Title : CHITTA LAHU (Punjabi)

Urdu Translation : SUFAID KHOON

844-U
251

ڈائرکٹر نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا، نئی دہلی ۱۶ نے
لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) دریا گنج دہلی ۶ سے چھپوا کر شایع کیا۔

UNI... LIBRA...
24 JUL 1975
ALLAHABAD

پیش لفظ

ہندوستان ایک وسیع مُلک ہے، جو اگرچہ تہذیبی حیثیت سے متحد ہے مگر پھر بھی اُن رشتوں کو مضبوط تر بنانے کی ضرورت ہے جن سے وہ ایک واحد، طاقتور اور ترقی پسند قوم بن سکے۔

ہمارے مُلک میں متعدد زبانیں ہیں جو تعداد میں دُنیا کے کسی بھی مُلک میں رائج زبانوں سے زیادہ ہیں مگر بدقسمتی سے ہمیں اپنی پڑوسی زبان یا زبانوں سے نہ دل چسپی ہے نہ اُن کی معلومات، بلکہ اپنی زبانوں سے زیادہ ہمیں مغرب کی زبانوں مثلاً انگریزی، فرانسیسی، جرمنی وغیرہ کے سماجی و ادبی پس منظر سے واقفیت ہے۔

مُلک کے جذباتی و تہذیبی اتحاد و یک جہتی کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ ہمارے شہری ایک دوسرے کی زبانوں کی بہترین تصنیفات سے آشنا ہوں، اور اس طرح ایک دوسرے کے طرزِ زندگی اور ادبی حصول کو قریب سے جانیں اور سمجھیں۔

مغرب میں بھی بہت سی قومیں ہیں، ہر ایک کی اپنی الگ زبان ہے مگر وہ لوگ ایک دوسرے کے فکر و ادب کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہمارے مُلک میں حالات اس کے متضاد ہیں — کسی مغربی زبان میں کوئی اچھی کتاب شایع ہوتی ہے تو وہ فوراً دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو جاتی ہے، لیکن ہندوستان میں ہم، ایک قوم ہوتے ہوئے، یہ تک نہیں جانتے کہ پڑوس کی زبان میں کیا لکھا جا رہا ہے۔ ویسے حالات بدل تو رہے ہیں مگر اس تبدیلی کی رفتار نہایت سُست ہے۔

اس صورتِ حال کے مدِّنظر، حکومت نے ایک اسکیم بنائی ہے کہ ہر زبان سے موجودہ یا تقریباً موجودہ زمانے کی چنندہ کتابیں دوسری زبانوں میں ترجمہ کی جائیں، یہ کتابیں عام دل چسپی کی ہوں گی۔ مثلاً مختصر افسانے، ناول، دل چسپ سفرنامے یا سوانح حیات وغیرہ — ایسی مقبول تصنیفات کو ترجمہ کیا جائے گا جو کسی بھی لسانی علاقے کی طرزِ زندگی، سماجی و تہذیبی سرگرمیوں، جذباتی کیفیتوں اور ارمانوں کی نقاب کشائی کر سکے۔

اُمّید کی جاتی ہے کہ یہ پروجیکٹ، ہمارے مُلک کے، مختلف الزبان سماج میں، علاقائی مفاہمت اور جذباتی یک جہتی کا کام کرے گا اور اِس مقصد میں کافی مدد دے گا۔

مختلف ہندوستانی زبانوں سے نُمایاں و مفید و دِل چسپ کتابوں کا انتخاب اور پھر ترجمہ آسان کام نہیں ہے — ہم اپنی اُن کمیٹیوں، اپنے صلاح کاروں و ترجمانوں کے مشکور ہیں جن کی رہنمائی اور تعاون کے بغیر اِس قسم کا کوئی پلان عملی طور پر بار آور نہیں ہو سکتا تھا۔

بالکرشن کیسکر

دیباچہ

ادب کی تاریخ میں پہلے نظم کی تخلیق ہوئی، بعد میں نثر کی۔ اور نثر میں پہلے مذہبی تعلیم اور مذہبی کہانیوں نے جنم لیا۔ پھر حکایت نما تاریخ اور اس کے بعد خالص ادب اور ناول نے۔ ادب میں ناول اُس وقت تخلیق ہوتا ہے جب سماج کا شعور بیدار ہوجاتا ہے اور اُسے اپنے سارے اجزا کو ساتھ لے کر چلنے اور اُن سے پورا پورا کام لینے کی اہمیت محسوس ہوتی ہے۔

پہلے تو مذہبی پیشواؤں کی انوکھی اور بے داغ زندگیاں تمام انسانوں کے لیے نمونے کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔ اُن کی باطنی طاقتوں کے بل پر سارے گناہوں سے بری ہونے کا کام لیا جاتا ہے۔ عام انسان اِن کتابوں کو مذہبی تعلیم اور روشنی حاصل کرنے کے لیے پڑھتے ہیں، ادب سمجھ کر نہیں۔ یہ حالت ناول کے پیدا ہونے سے پہلے کی ہے۔ اِسے ہم مذہبی کہانیوں کا دور کہہ سکتے ہیں۔ مغربی تعلیم کے پھیلنے سے پہلے پنجابی ادب کی یہی حالت تھی۔

اِس کے بعد ادیب زیادہ غور وخوض کے ساتھ تاریخی واقعات کو، مذہبی کہانیوں کے سے احترام کے ساتھ لکھنا شروع کرتے ہیں۔ مطلب وہی ہوتا ہے جو پہلے تھا۔ یعنی نمونے والی زندگیاں پیش کر کے سماج کو اُونچا اُٹھانا۔ "گورو نانک چمتکار" "کلغی دھار چمتکار" وغیرہ کتابیں اسی عہد کی ہیں۔

بعد میں تاریخی شکل والی لیکن تصوراتی کہانیاں شروع ہوتی ہیں۔ یہ ہے ناول کی اصل ابتدا کیونکہ اِس میں خام مواد سب کا سب تصوراتی ہوتا ہے لیکن اِس کا تعلق کسی تاریخی واقعے یا کسی تاریخی زندگی سے جڑا ہوتا ہے تاکہ پڑھنے والے اس سے زیادہ متاثر ہوں۔ اِس حالت میں مقصد یہی ہوتا ہے کہ نمونے کی زندگیاں پیش کر کے پرانے سماج کے لیے عزت اور احترام پیدا کیا جائے۔ اِس کو بھی ناول کی اِبتدا نہیں کہا جاسکتا کیونکہ اس میں مثالی زندگیوں اور مثالی باتوں کا ہی ذِکر ہوتا ہے۔ سماج کی ہو بہو حالت نہیں بیان کی جاتی اور

نہ ہی عام انسانی زندگی کے ڈھانچے کو لے کر کسی کردار کو اُبھارنے کی کوشش ہوتی ہے۔

"سُندری" "بجے سنگھ" وغیرہ کتابیں اِس دور کے نمونے ہیں۔ یہ کتابیں سکھ تاریخ کے رنگ میں رنگی ہوئی ہیں اور سکھ دھرم اور پنتھ میں عقیدہ بڑھانے کے لیے بہت کارآمد ہیں لیکن اِن میں کسی مرد یا عورت کے کردار کو حالات کے مطابق اُبھرتا ہوا نہیں دکھایا گیا بلکہ "سندری" "بجے سنگھ" وغیرہ کے کردار بنے بنائے مثالی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ اُن کے دِلوں پر حالات کے بگڑنے یا سنورنے پر کوئی اُتار چڑھاؤ نہیں آتا۔ کوئی اخلاقی کشمکش پیدا نہیں ہوتی۔ سکھ، نمونے کے مثالی سکھ ہیں اور مسلمان عام طور سے سب ہی ظالم اور عیبی دِکھائی گئے ہیں۔

ناول میں ہر ایک کردار کا اپنا اپنا کام ہوتا ہے اور اس کی شکل، حالات اور پیدائشی اوصاف کے مُطابق ہوتی ہے۔ کسی کا کام دُوسرے سے نہیں مِلتا۔ نہ ہی سب کو ایک ہی رسّی میں باندھا جا سکتا ہے انسانی کردار ایک مِلی جلی سی چیز ہے۔ اِس میں اچھے اور بُرے دونوں گُن مِلے ہوتے ہیں۔ اچھے سے اچھے آدمی میں بھی کبھی سستی یا کاہلی اور کمزوری آجاتی ہے اور بُرے سے بُرے آدمی پر بھی کبھی نیکی کا سایہ پڑ ہی جاتا ہے۔ نہ تو کوئی مکمل طور سے اچھا ہے اور نہ برا۔ چور اور ڈاکو بھی کبھی کبھی اپنے بال بچوں میں بیٹھ کر نیکی کا جذبہ محسوس کرتے ہیں اور اپنے دِل کی معمولی سی پاکیزگی کے نشے میں ہی جھوم اُٹھتے ہیں۔ کبھی کبھی بڑے سنجیدہ اور فیاض لوگ کسی انجان یا کسی معمولی سی بخشش کے سوال پر جھنجھلا اُٹھتے ہیں۔ بڑے بڑے بہادر سورما دانت کے درد سے روتے اور چیختے ہیں!

جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے، اِنسانی کردار کی بناوٹ میں جستجو بڑھتی جاتی ہے۔ پہلے ادیبوں کے سامنے بڑے بڑے مسائل یہی ہوتے تھے کہ ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ زیادتی کرنا چاہتی ہے، یا کوئی مرد کسی عورت کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر اُس کی عصمت دری کرنا چاہتا ہے۔ اور دوسرا محض نیکی کے جذبے کے تحت اُس کی حفاظت کے لیے اپنی جان کی بازی لگانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے وغیرہ لیکن اب سماجی زِندگی اِس قدر سادہ نہیں رہی۔ اِس کی گتھیاں آسانی سے سمجھ میں آنے والی نہیں ہیں۔ اب تو تعلیم اور آپسی میل جول کے بڑھنے سے کئی طرح کی بُرائیاں گھُل مِل گئی ہیں اور انسانی کردار ایک بہت بڑا گورکھ دھندا بن کر رہ گیا ہے۔

ناول نگار کا کام محض کہانی کو بننا ہی نہیں بلکہ کہانی کی ضرورت کے مطابق ہر ایک کردار کو اُبھارنا

ہے۔ اگر سماج کا کردار اور اِس کے ساتھ اُس میں آنے والے آدمیوں، عورتوں کی ذاتی زندگیاں بہت اُلجھ گئی ہیں تو ناول نگار کا کام بھی بہت مُشکل ہو گیا ہے۔ ایک اچھے ناول نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ کردار کو سمجھنے کی قابلیت رکھتا ہو۔ اُسے سارے ہندو بُزدِل، مُسلمان ظالم اور عیبی اور سارے سِکھ "گور مکھ پیارے" ہی نہ دِکھائی دیں۔ اُسے پتہ ہو کہ ہندو، مسلمانوں میں بھی نیک آدمی ہو سکتے ہیں اور سکھوں میں بھی بُرے آدمی ہو سکتے ہیں۔ دوسرے ادیبوں کے لیے ممکن ہے تھوڑی بہت تعلیم ہی کی ضرورت ہو لیکن ناول نگار کے لیے ضروری ہے کہ اُسے مذہب، فلسفہ، خاص کر نفسیات، تاریخ، جغرافیہ، سائنس، ادب، اپنے سماج کی عام واقفیت اور اپنے پڑوسیوں اور ہمسایوں کے متعلق بھی ہمدردی کے جذبے کے ساتھ واقفیت ہو۔

اِتنی واقفیت جلدی نہیں آتی۔ اسی لیے ناول، ادب کی کئی قسموں کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ اِس کے علاوہ ناول کی تخلیق کے لیے یہ ضروری ہے کہ سماج کی حالت کِسی خاص مقام تک پہنچ چکی ہو۔ جس قوم میں ابھی سماجی حالت ہی نہ آئی ہو اُس میں ناول کیسے پیدا ہو؟ سماجی حالت کے لیے ضروری ہے کہ آدمیوں اور عورتوں کا رشتہ مالِک اور غلام والا نہ ہو۔ اُن کے باہمی حقوق میں کچھ برابری ہو اور جو کچھ خامیاں رہ گئی ہوں اُن کے سدھار کی گنجایش ہو۔ ساتھ ہی ایک قوم کی دوسری قوم پر زیادتی ہمیشہ کے لیے قائم نہ رہ سکے۔ آزادی کی گنجایش ہو یا کم از کم اِس کی اُمید ہی سارے سماج کو بیدار رکھے ہوئے ہو۔

یہ حالت ہمارے مُلک میں ابھی تک نہیں تھی۔ اب آہستہ آہستہ آ رہی ہے۔ اِس لیے ناول بھی آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہے۔ سماجی خامیوں کے وقت جو ناول لکھے جاتے ہیں وہ سماجی سدھار کے ہوتے ہیں، جیسے بھائی ویر سنگھ جی کا ناول "سبھاگ جی دا سدھار" ہے۔ اس میں عورت ذات کی مصیبتیں پیش کی گئی ہیں۔ بابا نودھ سنگھ کا کردار محض مِثالی کِردار ہی نہیں اس میں ایک خاص برابری اور عام ہمدردی دِکھائی گئی ہے کہ بابا سب کا بابا دِکھائی دینے لگتا ہے۔ اُس کی شخصیت میں ایسے انوکھے گُن ہیں جو اُسے اپنے ایسے دوسرے کرداروں میں ممتاز کرتے ہیں۔ اِسی لیے یہ ناول بھائی صاحب (ویر سنگھ) کے پچھلے دوسرے ناولوں سے بہتر اور صحیح معنوں میں ناول ہے!

بھائی نانک سنگھ کے ناول بھی سماجک سدھار والے ہیں۔ اِنہوں نے اِس سے پہلے 'مٹھا موہرا' 'پریم سنگیت'، 'کال چکّر' وغیرہ کئی ناول لکھے ہیں اور وہ پنجابی ادب کے قارئین میں اچھی طرح جانے پہچانے

ہیں۔ لیکن جو کمال انھوں نے یہ ناول "چٹا لہو" (سفید خون) لکھنے میں دِکھایا ہے وہ پہلے نہیں دِکھایا تھا۔ پہلے تو وہ معاشرے کی کوئی ایک دو خامیوں کو لے کر ہی ناول لکھتے تھے لیکن اس بار تو سارے کے سارے معاشرے کو مضبوط ہاتھ سے جھنجھوڑا ہے اور ہر طرف سے وہ چوٹیں لگائی ہیں کہ اس ناول کو ملک کے کونے کونے تک پہنچایا جائے تو بڑے سُدھار کی اُمید کی جا سکتی ہے۔ جہالت، چھوت چھات، منشیات کا استعمال، بیاہ شادی سے متعلق بُری رسمیں، عورت ذات، خاص کر بیوہ پر ظلم، گوردواروں کی طرف سے لاپرواہی۔ بات بات پر جھگڑے، مقدمے بازی وغیرہ کی علّتیں اور بھیڑ چال، یہ سب اِس خوبصورتی سے اس ناول میں گندھے ہیں کہ پڑھنے والے کے دِل پر بہت جلد اور گہرا اثر پڑتا ہے۔

اِس میں ہیرو، ہیروئن اور دوسرے کرداروں کی کردارنگاری، بڑی عقلمندی، تجربے، مشاہدے اور فن کارانہ طریقے سے کی گئی ہے۔

سندری ایک قلندر کی پالتو بیٹی، گورمکھی کی تعلیم لے کر اور بچن سنگھ کی صحبت میں رہ کر ایک بہت اونچی شخصیت میں ڈھل جاتی ہے۔ لیکن قلندروں اور بندروں کا بچپن کا ساتھ اُسے بار بار پیچھے کی طرف کھینچتا رہتا ہے۔ بچن سنگھ کا اثر اُسے سماج کی سیوا کے لیے تیار کرتا ہے لیکن اُس کے پچھلے طور طریقے اور سماج کے ظلموں کی یاد اسے بار بار بدلہ لینے کے لیے اُکساتی ہے۔ یہ اچھے اور بُرے جذبات کی اندرونی کشمکش بہت خوب صورت ہے!

پنڈت رادھے کشن کی تصویر بہت ہی دانشمندی سے مضحکہ خیز بنائی گئی ہے۔ وہ دوسرے لوگوں پر ایک بار ہے، کیونکہ وہ ان سے ہی کھاتا پیتا ہے۔ لوگوں کے سامنے چھوت چھات کا ماننے والا ہے لیکن اندر بیٹھ کر وہ مسلمانوں کی رکابی میں کھانے سے بھی پرہیز نہیں کرتا۔ گاؤں میں جو بھی دھوکے دہی کا کام ہوتا ہے یا چوری چکاری کی نوبت آتی ہے، سب کام اس کے مشورے سے ہوتے ہیں پھر بھی وہ چودھری کا چودھری بنا رہتا ہے۔!

دسوندھا سنگھ گرنتھی کی جسمانی بناوٹ، اُس کی کمزوری اور حماقت بڑے مزے مزے لے کر بیان کی گئی ہے۔

سب سے زیادہ ہمدردی بوڑھے قلندر رو ڈُو کے ساتھ دکھائی ہے۔ وہ اس قدرتی پیار کا نمونہ ہے جو نیچی ذات والوں میں زیادہ ہوتا ہے۔ کبھی وقت تھا جب وہ لوگوں کو بچوں سے پیار کرتے

دیکھ کر ہنستا تھا یا مذاق کرتا تھا۔ لیکن جب اُسے ایک معصوم بچی جھاڑی میں پڑی ہوئی مل گئی تو وہ کتنی جلدی اُس سے پیار بڑھا لیتا ہے اور آخر اُس کے پیار میں جذب ہو کر رہ جاتا ہے۔ ناول نگار نے بڑی خوبصورتی سے ظاہر کیا ہے کہ کیسے اِس پیار نے اُس کی کایا ہی پلٹ دی اور اُس کی حیوانیت کی جگہ اُونچے جذبات اور ذِمے داریوں کے احساس نے لے لی۔ یہی خوبی ناول نگار نے دوسرے کرداروں کے اُبھارنے میں بھی دکھائی ہے۔

ناول میں منظر نگاری بھی بڑی چابکدستی سے کی گئی ہے۔ مُلک کے ادیبوں کی ابتر حالت، قلندر کے معصوم سندری کے لیے ترے اور لوریاں، بالا سنگھ کی ٹولی کا نشہ گھوٹنا، جاٹوں کا گوردوارے میں چھوٹی سی بات پر آپس میں دھینگا مُشتی پر اُتر آنا، انور کا مُجرا، اور خاص کر سُندری کا انور کے پاس جاکر صرف دو لفظ ’ماں جی‘ ’ماں جی‘ بول کر اُس کی زِندگی کا رُخ پلٹ دینا، یہ منظر ایسے خوب صورت انداز سے کھینچے ہیں کہ اب تک پنجابی ادب میں پڑھنے کو نہیں مِلے تھے۔

زبان اور لکھنے کا ڈھنگ بھی اِسی اونچے ہُنر کے مطابق ہے۔ ناول کی شروعات عجیب طریقے سے کی گئی ہے۔ ہنسی کے موقعوں پر تحریر ہلکی پھلکی اور اِٹھلاتی ہوئی سی معلوم ہوتی ہے۔ دُکھ اور درد کے بیان کے وقت بڑی سنجیدہ، پرجوش اور درد بھری ہو جاتی ہے۔ اگر پنڈتوں کی زبان لکھنے میں کمال کر دِکھایا ہے تو جاٹوں کسانوں کی گھریلو زبان لِکھنے میں بھی کوئی کمی نہیں رہی۔ ہاں کہیں کہیں پوٹھوہاری (راولپنڈی کے علاقے کی زبان) طرزِ بیان اس طرح واضح ہو گیا ہے کہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ادیب کا وطن کون سا ہے؟

نانک سنگھ کے اندازِ تحریر کی ایک خوبی اور بھی ہے جو اِن کے فن کو بامِ عروج تک پہنچانے کی نِشانی ہے۔ وہ ہے ڈراماٹک آیرانی (DRAMATIC IRONY) یا ڈھکے چھپے طنز کا اِستعمال۔ اِس سے بات زیادہ پُر اثر ہو جاتی ہے۔ دیکھیے :۔ رادھے کشن چھوت چھات ماننے والے پنڈت مسلمانوں کے ہاتھوں سے تو کیا، اُن کے باورچیوں کے ہاتھ سے تیار کی ہوئی چیزیں کھا رہے ہیں۔ اُن کے جھوٹے گلاس میں شراب پی رہے ہیں۔ اپنی بہو بیٹی بیوہ ہو جائے تو اُس کے لیے گھر میں کوئی جگہ نہیں، سماج میں کوئی عزت نہیں، لیکن جب وہی بیوہ، مسلمان رنڈی بن کر کسی شادی میں مُجرا کرنے آئے تو پنڈت جی جیسے سماج کے لیڈر اُس کی دہلیز پر جاکر ماتھا رگڑتے ہیں۔ اچھوت آدمی کے ماتھا ٹیکنے سے گوردوارے میں رکھا، کڑاہ پرشاد کھانے کے قابل نہیں رہتا لیکن کُتّے کے اندر آجانے

اور جھولی میں بیٹھ جانے سے بھی کچھ نہیں بگڑتا۔ بالا سنگھ، بچن سنگھ کی مخالفت اِس لیے کرتا اور دوسروں سے کراتا ہے کہ اُس کے ایک اچھوت لڑکی (سُندری) سے مراسم ہیں۔ لیکن جب وہ سُندری کو گھر میں بیوی بنا کر ڈالنا چاہتا ہے تو دلیل دیتا ہے:" اوچھوڑ وبھی بیکار کی گلاں۔ سِکھوں کو کیا لینا ایسے دھموں سے"

یہ ناول ایک المیہ ہے جس کے پڑھنے سے دل پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ کہتے ہیں ڈکنز کی ناولوں نے سدھار کے اِتنے کام کئے ہیں جو پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قوانین نے نہیں کیے۔ دیکھئے یہ ناول ہمارے سماج کے سفید خون کو کہاں تک صاف کرتا اور اس میں صحت مند خون بھرتا ہے!

تیجا سنگھ (پرنسپل)

۱۸ر جولائی ۱۹۳۲ء

ادھورا باب

"سنتری؟ اِس بدمعاش کو کھڑا رکھ۔"

یہ کہتے ہوئے بابو دوسرے مسافروں کے ٹکٹ دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ شام کے سات بجے کا وقت تھا۔ لوگ ٹکٹ دے کر پھاٹک میں سے گزرتے جا رہے تھے۔ سپاہی نے مسافر کو بازو سے پکڑ کر اُسے ایک زور کا جھٹکا دیتے ہوئے ایک طرف کھڑا کر دیا۔ اُس وقت مسافر کے لمبے میلے کوٹ کی جیب میں سے لپٹے ہوئے کاغذوں کا ایک پلندہ نیچے گر پڑا، جسے اُس نے فوراً اُٹھا کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔

نوجوان مسافر کے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ دیکھنے میں وہ سِکھ معلوم ہوتا تھا۔ عمر اُس کی اٹھارہ سال کے لگ بھگ ہو گی۔ ابھی اُس کی داڑھی کے روئیں بھی نہیں نکلے تھے۔ اُس کا کرتہ گلے کے پاس سے تھوڑا پھٹا ہوا تھا۔ اور اُس نے جو کالا کوٹ پہنا ہوا تھا، اُس کی بھی یہی حالت تھی۔ کئی جگہوں پر پیوند لگے ہوئے تھے۔ کاجوں کے چھید پھٹتے پھٹتے کھلے ہو گئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا، اِنھیں موٹے سفید دھاگے سے کئی بار سیا گیا ہے۔ کوٹ پر کوئی بٹن نہیں تھا۔ سردی سے بچنے کے لیے مسافر نے کاجوں اور بٹن لگانے والی جگہوں میں دھاگے پرو کر کام چلایا ہوا تھا۔ کوٹ کی ایک جیب بالکل پھٹی ہوئی تھی۔ لیکن دوسری غنیمت تھی۔ مسافر کے سڈول گورے جسم کا انگ انگ غریبی، ناامیدی اور شرمندگی کی تصویر بنا ہوا تھا۔

سپاہی کا ہاتھ چھوتے ہی مسافر سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ اُس کے سامنے سے سینکڑوں مسافر ٹکٹ دے کر گزر گئے، لیکن بابو نے کسی کی طرف بھی ایسی بھیانک نظر سے نہیں دیکھا تھا جیسے اُس کی طرف۔ وہ لوگوں کی نظروں سے بچنے کی خاطر، دو قدم بڑھ کر پھاٹک کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو گیا۔ سپاہی نے غالباً اس خیال سے کہ مسافر بھاگنے کے لیے داؤ پیچ کھیل رہا ہے، قہر آلود نظروں سے اُس کی طرف دیکھا اور دھمکی دی: "اوئے کدھر جا رہیاں؟ اپنی جگہ پر کھڑا رہ۔ نہیں تو مار مار کر چمڑی اُدھیڑ دوں گا۔"

مسافر چوں چراں کیے بغیر دوبارہ اُسی جگہ پر آ کر کھڑا ہو گیا۔

قریباً پون گھنٹے کے بعد جب سارے مسافر چلے گئے تو بابو نے اُس کی طرف دھیان دیا اور کڑکتی آواز میں بولا "لاؤ ے نکال ایک روپیہ دس آنے" بابو کے کچھ کہنے سے پہلے ہی مسافر کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے کسی چیز کو ٹٹول رہا تھا۔ موٹے موٹے کناروں والا سفید تانبے کا ایک سکہ تھا یہ۔ اِس وقت اُس کی حالت ایک ایسے آدمی کی سی تھی، جس کا پیاس کے مارے دم نکل رہا ہو اور اُس کے سامنے پانی کی ایک چھوٹی سی کٹوری رکھی ہو اور وہ بھی کھارے پانی کی۔ اس کی جیب میں ایک کھوٹی چونی تھی۔

مسافر نے بڑی نرم آواز میں ڈرتے ڈرتے جواب دیا "بابوجی! مجھ پر رحم کیجیے۔ مَیں بہت غریب ہوں۔ کافی کوشش کے باوجود میں کرائے کے لیے پیسے نہیں جمع کر سکا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے بنا ٹکٹ سفر کرنا پڑا۔"

بابو نے تمسخر اور نفرت بھرے لہجے میں ہنستے ہوئے کہا "ٹھیک ہے؟ کرائے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ اور گاڑی تمہارے باپ کی جو ہے، مُفت سفر کرنے سے پہلے جیل کی دال روٹی کی یاد نہیں آئی تھی؟"

پاس سے سپاہی بولا "بابوجی! تو آپ کیا خیال کرتے ہیں۔ اِس کے پاس کرایہ نہیں ہے؟ میرا خیال ہے اِس کی تلاشی لی جائے تو آپ کو پتہ چلے کہ یہ غریب ہے یا چال باز۔"

سپاہی کی تائید کرتے ہوئے بابو نے کہا "تو یہ بات کیا مجھ سے بھولی ہوئی ہے؟ اِن لوگوں نے تو بس یہ پیشہ ہی بنا لیا ہے۔ گاڑی میں مُفت سفر کرتے پھرتے ہیں۔ جہاں کوئی عقل کا اندھا اور گانٹھ کا پورا مِلا اُسے ٹھگ لیا اور اپنا راستہ ناپا" پھر وہ مسافر کی طرف دیکھ کر بولا "کرایہ دیتے ہو یا میمو کاٹوں؟"

مُسافر کے جسم کا خون جم چکا تھا۔ چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ دو تین بار وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ آخر اُس نے ہمت کر کے کہا "بابوجی! میں چور اُچکا نہیں۔ ایک مصیبت زدہ غریب ہوں۔ مفت سفر کرنے کا مجرم ضرور ہوں۔ لے چلیے۔ جہاں آپ کا دل چاہے۔ لیکن خدا کے واسطے اِس قسم کے بول بول کر میرے کلیجے پر برچھیاں نہ چلائیے۔" یہ کہتے ہوئے مسافر کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

بغیر ٹکٹ مسافروں کی اِس طرح کی بلکہ اس سے بھی زیادہ باتیں سننے کے بابو اور سپاہی کے کان عادی ہو چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بڑی بے پرواہی سے مسافر کی باتیں سنیں، لیکن جیسے ہی بابو کی نظر اُس کی آنکھوں پر پڑی تو وہ حیران رہ گیا۔ مسافر کی موٹی آنکھوں سے جیسے خون ٹپک رہا تھا۔ غصے اور نفرت سے اُس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ اور اُس کے گورے چہرے پر لالی دوڑ رہی تھی۔

سپاہی شاید دِل کا زیادہ کڑا تھا۔ اِس لیے اُس نے اِس بات کی طرف کوئی دھیان نہیں دِیا۔ لیکن بابو کو اِس دُکھی آدمی کے چار لفظوں نے جیسے تڑپا سا دیا۔ وہ پچھتا رہا تھا کہ اس نے کیوں ایک

دکھی دِل کو ٹھیس پہنچائی۔ وہ کافی دیر تک ایک ٹک مسافر کی آنکھوں کی طرف دیکھتا رہا۔ یہ آنکھیں اُس کے دل پر نامعلوم طور سے اثر انداز ہو رہی تھیں۔

ہاتھ والے کاغذوں کے پُلندے کو مسافر کبھی بازو کے نیچے دبا لیتا، کبھی کوٹ کی جیب میں ڈال لیتا۔ اور پھر یہ سوچ کر کہ کہیں دوسری جیب کی طرح یہ بھی نہ پھٹ جائے، کاغذوں کے پلندے کو نکال کر بڑے دھیان سے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیتا۔

"میرے ساتھ آؤ"۔ یہ کہتے ہوئے اور اپنے کام کا چارج ایک اور بابو کو سونپتے ہوئے وہ سٹیشن کے باہر کی طرف چل پڑا۔ شاید اس کی ڈیوٹی ختم ہو گئی تھی۔ مسافر بھی اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

مسافر کو اب اِس بات کی فکر نہیں تھی کہ بابو اُسے سٹیشن ماسٹر کے پاس لے جائے گا یا پولیس افسر کے پاس۔ لیکن وہ حیران رہ گیا جب اُس نے دیکھا کہ بابو سٹیشن سے باہر نکل کر ایک گراؤنڈ میں پہنچ کر ہری گھاس پر بیٹھ گیا۔ اُس نے مسافر کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

بابو نے ایک نظر بھر کر مسافر کی طرف دیکھا اور پھر پوچھا "تم کہاں سے آرہے ہو؟"

"جی لاہور سے"

"گھر کہاں ہے؟"

"یہیں امرتسر میں"

"بڑی حیرانی کی بات ہے۔ امرتسر میں تمہارا گھر ہو اور جیب میں دس آنے کے پیسے بھی نہ ہوں۔ تُم کیا کام کرتے ہو؟"

مسافر کے لیے اس بات کا جواب دینا کافی مشکل تھا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر بولا "جی کچھ نہیں"

بابو نے حیرانی سے پوچھا "کچھ نہیں؟ تو کھاتے کہاں سے ہو؟" اِس کے ساتھ ہی بابو نے ایک بار شک بھری نظر سے اُس کی طرف دیکھا۔ لیکن وہاں شک کی کوئی گنجایش نہیں تھی۔ صرف مسافر کی آنکھوں میں کوئی پوشیدہ سی کشش تھی، جو بابو کی توجّہ کو بنا سوچے ہی کھینچ رہی تھی۔ اور اُس کے سوئے ہوئے جذبوں میں ہلکی ہلکی حرکت پیدا کر رہی تھی۔

مسافر بولا "جی کیا بتاؤں۔ کہاں سے کھاتا ہوں" (تھوڑی دیر رُک کر) "اصل میں بابو جی! موت بہت بُری چیز ہے۔ مرنے سے آدمی کس قدر ڈرتا ہے۔ سب کچھ تباہ ہو جانے کے باوجود بھی بے عزّتی اور ظلم کا شکار ہوتے ہوئے بھی میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ لعنت ہے مجھ پر اور میرے جینے پر" یہ کہتے ہوئے مسافر کا

گلا بھر آیا۔

اُس کی آخری دو باتیں بابو کے دل پر گہرا اثر کر گئیں۔ اُس نے مسافر کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا "سردار حوصلہ رکھ۔ میں سمجھتا ہوں کہ تو کسی بھاری مصیبت میں گھرا ہوا ہے۔ مجھ سے جہاں تک ہو سکے گا۔ تیری مدد کرنے کوشش کروں گا۔"

مسافر کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ بابو کی بات پر توجہ دیے بغیر ہی ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولا "جناب یہ میرے حق میں اچھا نہیں ہوا۔ آپ کو چاہیے تھا کہ مجھے پولیس کے حوالے کر دیتے۔ شام سے پہلے پہلے میں خود کو حوالات کی کوٹھڑی میں پاتا۔ یہ میرے حق میں ...... یہ میرے حق میں زیادہ اچھا ہوتا۔"

بابو نے اُس کی باتوں کا مطلب سمجھنے کے لیے ایک بار پھر اُس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ایک منٹ اُس کے دل میں خیال آیا کہ مسافر شاید پاگل ہے۔ اس کا دماغ چل گیا ہے۔ اُس نے پھر پوچھا "یہ تیرے حق میں اچھا ہوتا۔ اِس کا مطلب ؟"

مسافر نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذوں کے پُلندے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔" میرے ناول کا ادھورا باب مکمل ہو جاتا۔"

بابو نے پوچھا "بھئی اِس بات کے معنی کھول کر بتاؤ ذرا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔"

مسافر بولا "جناب میں اِس شہر میں بھگتاں والے دروازے کے اندر ایک ٹوٹی پھوٹی کوٹھڑی میں رہتا ہوں، جس کا کرایہ چاہے صرف آٹھ آنے مہینہ ہے لیکن میرے لیے جیسے یہ آٹھ روپے ہیں۔ میں ایک ادنیٰ ادیب ہوں۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا میرا پیشہ نہیں ہے اور یہ بھی بہت پرانا نہیں ہے۔ کچھ ہی دنوں سے مجھے لکھنے لکھانے کا شوق ہوا ہے۔ اِس سے پہلے بھی میں کچھ کتابیں لکھ کر ناشروں کو دے چکا ہوں اور وہ چھپ بھی چکی ہیں۔ اِس کے علاوہ بھی میری کچھ مختصر کہانیاں رسائل میں چھپی ہیں۔ بے شک لوگوں نے اُن کی کافی تعریف کی ہے لیکن میں محض تعریف کو کیا کروں۔ جبکہ کسی نے بھی چند پیسوں سے زیادہ میری ہتھیلی پر کبھی کچھ نہیں رکھا، اور جو کچھ ملتا ہے وہ میری ضرورت سے کہیں کم ہوتا ہے۔"

تھوڑی دیر ٹھہر کر مسافر بولا "بابو جی کچھ دن پہلے میں اِس (ہاتھ والے مسودے) کو لکھ رہا تھا۔ میں آج کی طرح ہی غریب تھا۔ میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ کوئی اُدھار بھی نہیں دیتا تھا۔ پرسوں کی بات ہے جب میرے کاغذ ختم ہو گئے تو میرے ہوش اُڑنے لگے۔ مجھے اِس ناول کا آخری باب ابھی لکھنا تھا۔ میں پیٹ سے بھوکا اور جسم سے ننگا رہ کر گزر کر سکتا ہوں لیکن کاغذوں کے بغیر میرا گزارہ کیسے چل سکتا ہے۔ میں سارا دن سر پٹکتا رہا لیکن نہ تو کسی نے مجھے ایک چونی اُدھار دی اور نہ ہی کاغذ!

"میں بہت نا اُمید ہوگیا۔ اُس وقت میں نے مرجانے کی بات سوچی۔ لیکن پتہ نہیں اس خیال سے کہ کتاب ادھوری رہ جائے گی یا شاید کسی اور چیز کی محبت کی وجہ سے میں مر بھی نہ سکا۔

"میں بازار میں چلا جا رہا تھا کہ کوڑے کے ایک ڈھیر پر کچھ میلے کچیلے کاغذ دکھائی دیے۔ شاید کسی سکول کے بچّے نے ردی کاپی پھینک دی تھی۔ میں نے جب اُنہیں اُٹھا کر دیکھا تو سب کاغذ گیلے گیلے سے تھے۔ اُن کاغذوں کے ایک طرف سکول کی تحریر تھی۔ دوسری طرف سے خالی تھے لیکن سیاہی کے پھیل جانے کی وجہ سے وہ کائی رنگے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

"میں نے سارے کاغذ اُٹھا لیے۔ اور اپنی کوٹھری میں جا کر آگ کی سینک سے اُنہیں سُکھا لیا۔ میرے لیے یہ بھی غنیمت تھا۔

"اُن کاغذوں پر میں لگاتار چھ سات گھنٹے لکھتا رہا۔ دوسرے دن میرے لکھنے کے لیے کوئی کاغذ نہیں بچا تھا۔ اُس وقت تک میرا ناول قریب قریب ختم ہو چکا تھا۔ اور اس کا آخری باب بھی تقریباً آدھا لکھا جا چکا تھا۔ مجھے اِس کے بیچنے کی بڑی جلدی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد مجھے اس کے عوض بہت سا روپیہ مل جائے اور میں اپنے فرض کو پورا کروں۔ یہ فرض کیا ہے؟ یہ میں بتا نہیں سکتا۔ اتنی ہمت مجھ میں نہیں ہے۔

"میرا خیال تھا، میری یہ تخلیق میری پچھلی کتابوں سے بہتر ہے اور میں اِسے لاہور کے کسی اچھے پبلشر کو جا کر دوں گا لیکن پیسوں کے بغیر لاہور جانا بھی میرے لیے جیسے کلکتے جانے کے برابر تھا۔

"کل مَیں نے کِسی نہ کِسی طرح ایک روپے کا بندوبست کر ہی لیا۔ لیکن جس نے مجھے روپیہ دیا تھا وہ جواریوں کا ساہوکار تھا۔ اُس نے مجھ سے دو روپے کی رسید لکھوالی۔

"میں آج صبح پیٹ سے بھوکا ہی یہ ادھورے باب والا ناول لے کر لاہور کی طرف چل پڑا۔ میرا خیال تھا کہ جب کسی سے سودا پٹ جائے گا تو اُس سے کاغذ لے کر آخری باب کا باقی حصہ وہیں کسی باغ میں بیٹھ کر پورا کر دوں گا۔ اور روٹی بھی تب ہی کھاؤں گا۔

"ریل کا ٹکٹ لے کر میں لاہور پہنچا۔ وہاں جا کر کئی ناشروں کے پاس گیا۔ میرا خیال تھا کہ میں جس کو بھی یہ ناول دوں گا، ایک بار میں ہی شروع سے آخر تک سُنا کر دوں گا تاکہ پبلشر کے دِل پر اِس کا گہرا اثر پڑے اور مجھے اچھے پیسے ملیں۔ لیکن وُہ میرے کوڑے کا پلندہ دیکھ کر ہی گھبرا جاتے اور زیادہ سے زیادہ دس پندرہ روپے کا معاوضہ سنا دیتے تھے اور میری ضرورت اِتنے سے پوری نہیں ہو سکتی تھی۔

"مطلب یہ کہ میں سارا دن پھرتا رہا لیکن میری محنت کی کہیں بھی قیمت نہ ملی۔ تب مجھے امرتسر لوٹنے

کی فکر ہوئی۔ بھوک کے مارے میری جان نکل رہی تھی۔ اس وقت میرے پاس ایک چونّی تھی۔ میں نے ایک تندور پر جاکر دو آنے کی روٹی کھائی۔ جب پیسے دینے لگا تو میرا رنگ فق ہوگیا۔ چونی کھوٹی تھی جو تندور کے مالک جھیور نے پلٹ کر میرے مُنہ پر دے ماری۔ اُس کے تندور پر اور کئی آدمی روٹی کھا رہے تھے۔ میری حالت پر ترس کھانے کی بجائے وہ میری طرف دیکھتے ہوئے مذاق کرتے اور طرح طرح کے آوازے کس رہے تھے۔

"جھیور نے مجھے دو چار سخت سست سنائیں۔ میرے لیے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ میری جیب میں ایک ریشمی رومال تھا۔ یہ میرے لیے کتنی قیمتی چیز تھی؟ اِس کا حال میں آپ کو کیا بتاؤں۔ (یہ کہتے ہوئے مسافر کا گلا بھر آیا) یہ میری زندگی کی پہلی کمائی کا بچا کھچا حصہ تھا۔ کلیجے پر پتھر رکھ کر میں نے دو آنے میں وہ رومال جھیور کے حوالے کردیا۔ رومال ہاتھ سے چھوڑتے ہوئے میری آنکھوں کے سامنے ایک پیاری سی صورت گھوم گئی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی آنکھوں میں آنسو بھر کر کہہ رہا ہو۔ او ظالم! تیرا لہو بھی سفید ہوگیا؟

"میں دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھامے وہاں سے سیدھا سٹیشن پر آیا اور بنا ٹکٹ گاڑی میں چڑھ گیا۔ گاڑی میں بیٹھ کر میں نے اخباروں کے کچھ ردی کاغذوں پر اپنے ادھورے باب کا باقی حِصہ لکھنا شروع کیا۔ لیکن ابھی یہ پورا نہیں ہوسکا ہے اور جب میں یہاں پہنچا تو آپ کے ہاتھ پڑ گیا۔

"جناب اِسی لیے میں نے آپ سے کہا ہے کہ مجھے جیل میں بھیج دیتے تو میرے اس ناول کا ادھورا باب بڑی خوب صورتی سے ختم ہوتا۔ کیونکہ ناول کا نام ہے سفید خون۔ اِس میں جتنے کرداروں کا ذکر آیا ہے، اُن میں سے ایک دو کو چھوڑ کر سب کا لہو سفید ہی ظاہر کیا گیا ہے۔ اگر آپ کا بھی ..... ایک جو میرے ناول کا آخری کردار ہیں، سفید لہو ہوتا تو یہ ایک بڑا مزیدار المیہ بن جاتا۔ اِس کے اختتام میں اب ایک بھاری کمی رہ جائیگی اور یہ بنا بنایا افسانہ چھوڑ کر مجھے کوئی اور پلاٹ تلاش کرنا پڑے گا۔"

مسافر کے ناول کا آخری باب ہی جب اِس قدر درد بھرا ہے تو اِس کا باقی حِصّہ کیسا ہوگا؟ اِس خیال سے اور دوسرے اُس کی آپ بیتی سُن کر بابو کا دل بیٹھنے لگا۔ اُس نے بڑے احترام، ہمدردی اور پیار بھری نظر سے ایک بار پھر اُس کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اُس کا ہاتھ پکڑ کر بوسہ دیا اور احترام سے بولا:۔

"سردار جی! معاف کیجیے گا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ اتنی بڑی ہستی ہیں۔ آیئے آج کی رات اِس غریب کی جھونپڑی میں گزاریے اور اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو یہ ناول بھی سنانے کی مہربانی کیجیے گا۔ مجھے بھی ناول پڑھنے کا بڑا شوق ہے۔ شاید میں ہی اِسے چھپوانے کا کوئی انتظام کروادوں۔ یہاں کے کئی ناشر میرے واقف کار ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد وہ بابو کے مکان پر جا پہنچے۔

جاتے ہی بابو نے سب سے پہلے نوکر سے کہہ کر اُس کے لیے روٹی کا انتظام کیا۔ کیونکہ وہ گھر میں اکیلا ہی رہتا تھا۔ روٹی کھا لینے کے بعد جب دونوں سونے کے کمرے میں پہنچے تو بابو نے اُسے ایک بستر پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "لیجیے۔ سردار صاحب! تشریف رکھیے اور سب سے پہلے اپنا یہ ناول سنائیے۔"

رات کے نو بج چکے تھے۔ مسافر نے بیٹھ کر پلندے کے اُوپر جو ایک میلا سا چیتھڑا بندھا ہوا تھا، کھولا۔ پلندہ کھولتے ہی اس کے چھوٹے چھوٹے بے ترتیب سے کاغذ اُس کے ہاتھوں سے پھسل کر فرش پر بکھر گئے۔ وہ تھوڑی دیر اُن کو اکٹھا کر کے ترتیب دیتا رہا۔ جب سارے ورق ترتیب وار ہو گئے تو سب سے پہلا سرِ ورق اٹھا کر اُس نے سامنے تپائی پر رکھ دیا۔ اِس پر جیسے ہی بابو کی نظر پڑی، وہ اِس طرح بھونچکا سا کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا جیسے کبھی کبھی اچانک کسی افسر کے آجانے پر ادب سے کھڑا ہو جاتا تھا۔ سرورق پر زیادہ تحریر نہیں تھی۔ صرف اتنا ہی لکھا ہوا تھا......

"سفید خون"

مُصنّف

'گیتیشور'

یہ گیتیشور وہ نام تھا جو بابو کے روم روم میں بسا ہوا تھا۔ وہ گیتیشور کی کتابوں کو کتنی عقیدت، کتنے پیار اور کتنی اُمنگ سے پڑھا کرتا تھا۔ اُن میں اُسے کتنا سُکھ اور کتنی تسکین ملتی تھی۔ گیتیشور کی کتابیں وہ مذہبی کتابوں کی طرح رومال میں باندھ کر رکھا کرتا تھا۔

کیا یہی گیتیشور ہے؟ کیا وہ سچ مچ آج اُسی ہستی کے درشن کر رہا ہے جس کا ایک ایک جُملہ اُس کے لیے آسمانی آواز سے کم نہیں۔ اور اتنی بڑی ہستی کا یہ حال؟ اِس قسم کے کتنے ہی سوال اُس کے ذہن میں اُٹھ رہے تھے۔

وہ کرسی سے اٹھا اور زمین پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے مسافر کے پاؤں چھوتے ہوئے بولا۔

"کیا آپ ہی گیتیشور ہیں؟ جو عظیم ہستی میری نس نس میں بسی ہوئی ہے۔ کیا وہ آپ ہی ہیں؟"

یہ کہتے کہتے وہ جلدی سے الماری کھول کر رومال میں بندھا ہوا ایک بستہ اُٹھا لایا اور اُسے اُس کے سامنے کھولتے ہوئے بولا:-

"یہ سب آپ کی ہی تخلیقات ہیں؟"

یہ گپتیشور کی لکھی ہوئی اب تک کی تصنیفات تھیں۔ کچھ کتابیں اور اُن کے نیچے رسائل میں سے کاٹے گئے کچھ تراشے۔

مسافر کے دل پر اس تعریف کا کچھ بھی اثر نہ ہوا جو کہ ادیبوں پر عام طور پر ہو جاتا ہے۔ وہ اسی سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "جی ہاں۔ یہ سب اُس پرماتما کا ہی کرم ہے۔"

بابو شام داس چاہتا تھا کہ اپنے احترام کا سارا جذبہ ایک ساتھ اس پر ظاہر کر دے۔ وہ گڑگڑا کر بولا "اے، میرے پیارے گپتیشور صاحب سچ مچ میں بہت خوش قسمت ہوں۔ جسے آج وہ چیز مل گئی ہے جس کے نام کی وہ ہمیشہ مالا پھیرا کرتا تھا۔ میرے کرم فرما۔ میں کیا بتاؤں کہ آپ نے مجھ پر کتنے کرم کئے ہیں۔ آج سے کچھ سال پہلے میری کُتّے کی سی زندگی تھی۔ ساری دنیا کے عیب اور برائیاں مجھ میں تھیں اور میں چھاتی تان کر اُن پر فخر بھی کیا کرتا تھا۔ لیکن جب سے میں نے آپ کی تصنیفات پڑھنی شروع کیں۔ میری زندگی میں خود بخود تبدیلی رونما ہونے لگی۔ میں نے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر آپ کی تخلیقات اکٹھی کریں۔ جن رسائل میں آپ کے مضمون اور کہانیاں شائع ہوتی تھیں، انھیں اپنے نام جاری کروالیا۔ ان میں اتنی رُوحانیت اِتنا درد اور اتنی عبرت ناک نصیحتیں ہوتی ہیں کہ انھوں نے کتنی جلدی میری زندگی کو بدل کر رکھ دیا یہ میں بتا نہیں سکتا۔ کئی بار آپ کے درشن حاصل کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کی۔ لیکن آپ کا پتہ نہ چل سکا۔ ہر کسی سے یہی جواب ملتا کہ تھوڑے ہی دنوں میں مشہور ہو جانے والے اس گمنام ادیب کو کبھی کسی نے نہیں دیکھا۔

"گپتیشور صاحب! اسی بیٹھک میں آج سے کچھ عرصے پہلے شرابیوں، جواریوں اور کئی طرح کے بُرے آدمیوں کا جمگھٹا رہتا تھا اور میں اُن سب کا سردار تھا۔ یہاں ایسے ایسے گناہ اور برے کرم کئے گئے ہیں جنھیں یاد کرتے ہوئے۔۔۔"

گپتیشور صاحب کو اُس کی حالت پر بہت رحم آیا۔ اور پھر یہ دیکھ کر کہ اِتنا بڑا گناہ گار خود کو اتنی جلدی راہِ راست پر لے آیا ہے، اس کے دل میں شام داس کے لیے محبت اور ہمدردی پیدا ہو گئی۔ اس نے پیار سے بازو سے پکڑ کر اُٹھایا اور کرسی پر بٹھاتے ہوئے بولا:۔

"میرے بزرگ! میں آپ جیسے خوش قسمت انسان کو دیکھ کر بہت خوش ہوا ہوں کہ آپ نے خود کو گناہوں کے اُن گڑھوں سے نکال لیا ہے، جہاں سے نکلنا ناممکن ہوتا ہے۔ شکر ہے پرماتما کا جس نے آپ پر اتنا کرم کیا ہے۔"

بابو شام داس کا دل خوشی سے چھلک رہا تھا۔ لیکن پھر اُسے یاد آیا کہ ابھی ابھی اُس نے اِس نیک انسان کی کتنی بے عزتی کی تھی اور وہ مارے شرم کے پانی پانی ہو گیا۔ گپتیشور کے پاؤں پکڑ کر وہ بولا:۔

"مجھے بخش دیجیے۔ مجھ سے آج کبھی نہ بخشا جانے والا گناہ سرزد ہوا ہے۔"
اپنے پاؤں سے اس کے ہاتھ اُٹھاتے ہُوئے گپتشور بولا:۔
"اے بزرگوار۔ اس طرح آپ مجھے دوزخ کا حقدار نہ بنایئے۔ آپ عمر میں میرے باپ کے برابر ہیں۔"
بابو بولا "یہ ٹھیک ہے لیکن عقل بڑی کہ بھینس" اس کے بعد اُس نے باقی باتوں کو کسی اور وقت کے لیے اُٹھا رکھا اور سب سے پہلے گپتشور سے ناول سنانے کی گزارش کی۔
گپتشور نے کہا "سناتا ہوں۔ لیکن یہ کافی بڑی کتاب ہے۔ میرا خیال ہے آپ اسے سنتے سنتے اُوب جائیں گے۔"
"کیا کہا؟ میں اُوب جاؤں گا؟ نہیں، لیکن کہیں آپ سناتے سناتے نہ اُوب جائیں، میرے لیے تو پانی تک پینا حرام ہے، جب تک ساری کی ساری کتاب نہ سن لوں۔"
تب تو آج کی رات آپ کو جاگتے رہنا پڑے گا۔ بے شک میں اِسے کافی تیزی سے پڑھ لوں گا، تب بھی آٹھ دس گھنٹے تو اِسے پڑھنے میں لگیں گے ہی۔"
"آپ چاہے دس دِن سناتے رہیں۔ میں پلک نہیں جھپکاؤں گا۔"
"اچھا تو سنیئے پھر۔"
بابو نے بجلی کا بلب اُس کے سامنے لاکر لٹکا دیا اور پھر بولا: "ہاں جی کیجیے شروع"
گپتشور نے ٹائیل والا ورق اُٹھا کر سامنے والی تپائی پر رکھا اور ناول سنانا شروع کیا۔

(۱)

پت جھڑ کے موسم میں جس طرح جنگل کی خاموشی میں درخت کا سوکھا پتہ کھڑکھڑ کرتا ہوا گر پڑتا ہے اور اور پھر اُس کی آواز اُس کی خاموشی میں ہی ڈوب جاتی ہے، اِسی طرح اِس آدھی رات کے وقت گھاس پھوس کی ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی میں بیٹھی ہوئی ایک دُکھیا مٹیار (دُکھی جوان لڑکی) جب کسی وقت ٹھنڈی سانس بھرتی ہے تو اُس اندھیری اور ڈراؤنی جھونپڑی میں اس کی گرم سانس میں لپٹی ہوئی آواز ایک ہلکی سی گونج پیدا کرکے وہیں گم ہو جاتی ہے۔
ایک تو بے جان اندھیرے میں اور پھر گاؤں سے باہر وہ مصیبت زدہ دُکھیا اکیلی ہی تھی۔ اُس

کے قریب وہاں کوئی نہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ نزدیک والے کنوئیں کے ارائیوں (کسانوں کا وہ طبقہ جو زیادہ تر سبزیاں ہی بوتا ہے) کی یہ جھونپڑی ہے جس میں وہ دِن کے وقت بیٹھے حقّہ تمباکو پیا کرتے ہیں۔ مٹیار (لڑکی) کی عمر اٹھارہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ جس طرح کالنے کا چمکتا برتن دھوئیں والے باورچی خانے میں رکھے رکھے کالا پڑ جاتا ہے، اسی طرح بے حد خوبصورت ہونے کے باوجود اس کے حسن کو دکھوں کے سائے نے ڈھک لیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد کالے حلقے تھے۔ اُلجھے ہوئے بال اور پھٹے ہوئے چیتھڑا چیتھڑا کپڑوں کو دیکھنے سے پتہ چلتا تھا کہ وقت کی گردش نے اُس کے سر پر جوانی میں ہی دکھوں کا پہاڑ لاد دیا ہے۔

اماوس کی کالی بہری رات اور اُوپر سے سردیوں کا موسم۔ ماگھ کا مہینہ، جھکڑ کی شائیں شائیں اور سوکھے درختوں کی تلخ آوازوں نے مل کر اُس کے دُکھی دل پر جیسے قیامت ڈھا رکھی تھی۔ اور سردی کے حملے نے تو اس کے جسم کو توڑ کر رکھ دیا تھا لیکن اُس کے دل کی آگ کوئی لکڑی کے کوئلوں کی آگ نہیں تھی، جس کو قدرت کی یہ ٹھنڈک بجھا سکتی۔

شکھوں کی یاد کی طرح رات آہستہ آہستہ بیت رہی تھی، لیکن مستقبل میں آنے والے دُکھ کے تصور کی طرح سردی اور اندھیرا ہر لمحے بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

جب اُس کا جسم پوری طرح سُن ہو گیا اور اُس کے ہوش و حواس جواب دے چکے تو وہ وہیں گوبر، بھوسے اور نمی والی زمین پر منہ کے بل گر پڑی اور گرتے ہی بے ہوش ہو گئی۔ اُس کی ناقابلِ برداشت حالت دیکھ کر آسمان میں چمکتے ہوئے ستاروں نے بھی آنکھیں موند لی تھیں، اور بادل ماتمی لباس پہنے اُس کے دُکھ میں آنسو بہا رہے تھے۔

بارش اور آندھی نے طوفان کی صورت اختیار کر لی۔ دُکھیا اسی طرح بے ہوش پڑی تھی۔ اِس کے بعد آندھی کے ایک زوردار حملے نے اس ٹوٹی ہوئی جھونپڑی کو بھی اُس کے سر سے اُڑا کر اُس کی قسمت کی طرح کہیں دُور لے جا کر پھینک دیا۔ اِس پر بھی تھوڑے بہت گھاس پھوس کے تنکے اور ٹکڑے اُس بدقسمت کے سر پر سہارا بنے کھڑے تھے، لیکن مصیبت کے وقت کے دوستوں کی طرح اُن کا بھی اُڑتے پتہ نہ چلا۔

اب اُس دکھیاری کے سر پر وسیع آسمان کے سوا کچھ نہیں تھا۔

برف سی ٹھنڈی ہوا اُس کے ادھ مرے جسم پر موٹے موٹے بارش کے قطروں کے تیروں سے حملہ کر رہی تھی۔ اُس کے روکھے لمبے بال پانی سے بھیگ کر گناہ گار کے دل کی طرح سخت ہو کر کسی بے درد رکھوالے کے چابکوں کی طرح اُس کے جسم پر پڑ رہے تھے۔

ادھ مری ابلا اب کھلے میدان میں تھی!

(۲)

اُس کی بے ہوشی دور ہونی شروع ہو گئی۔ جسم میں کچھ حرارت محسوس ہونے لگی اور اب وہ اپنے وجود میں کچھ طاقت محسوس کر رہی تھی۔ اس کی پلکیں ہلیں اور آہستہ آہستہ اس نے آنکھیں کھولیں۔ اپنے اِرد گرد اس نے جو کچھ دیکھا، اُسے ایسا لگتا تھا جیسے ہر چیز دُھند میں گھوم رہی ہے۔ اُس کی نظر کسی چیز پر نہیں ٹھہر رہی تھی۔ اُس کا ہاتھ اپنے آپ ہی سر کے پچھلی طرف چلا گیا اور اُس کی انگلیاں اُس جگہ کو ٹٹولنے لگیں۔ جہاں اُسے درد محسوس ہو رہا تھا اور یہ بھی پتہ چلتا تھا کہ بال لہو سے چپکے ہوئے ہیں اور سر کے اِرد گرد پٹی بندھی ہوئی ہے۔

آہستہ آہستہ اس کے حواس اور بیدار ہوئے۔ اب وہ اپنی اصلی حالت کو اچھی طرح محسوس کر سکتی تھی، اور اِس کے ساتھ ہی اُسے کسی حالیہ واقعے کی یاد بھی آنے لگی۔ اِس وقت اُس کے مُنہ سے ہائے نکلی اور وہ پھر بے ہوش ہو گئی۔ لیکن اِس بار بے ہوشی زیادہ دیر نہ رہی۔ وہ دوبارہ ہوش میں آئی تو جلدی سے اُٹھنے کے لیے چارپائی کی پٹی ٹٹولنے لگی۔

بڑی نرم و کومل آواز کے ساتھ کسی نے اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر پیار اور ہمدردی بھرے لہجے میں کہا: "میری اچھی بیٹی! ابھی نہ اُٹھنا۔"

اُس نے اِن الفاظ کو کہنے والی عورت کی طرف دیکھا اور پھر اسے پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن اُسے کچھ یاد نہ آیا کہ اس نے اُس عورت کو کبھی دیکھا ہے۔ اِسی وقت پھر آواز آئی "یہ بھی خدا کا شکر ہے، جس نے تجھے نئی زندگی بخشی ہے۔ مجھے تو بڑی فکر لگی ہوئی تھی۔ سوچتی تھی، اللہ جانے کیا ہوگا۔"

بیمار اُس کے کہے ہوئے الفاظ کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ لیکن "خدا کا شکر" اور "اللہ" کے الفاظ تو لاؤڈ سپیکر کی طرح اپنی اصلی آواز سے سوگنا زیادہ ہو کر اُس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ کیا میں مسلمانوں کے گھر میں ہوں؟ یہ سوچ کر اُس کی گھبراہٹ اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ شاید وہ پھر بے ہوش ہو جاتی لیکن جلدی ہی اُسے پتہ چلا کہ وہ عورت اُس کے سرہانے بیٹھی زار زار رو رہی ہے اور اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی بہہ رہی ہے۔ بیمار کا سر اپنی گود میں لے کر بار بار وہ اُس کا ماتھا چومتی ہوئی کہہ رہی تھی "میری بچی! ڈر نہیں — میں تیرے صدقے۔ دِل میں رتی بھر بھی فکر نہ کر۔ اب تو ٹھیک ہو رہی ہے۔"

مریضہ کو ایک پرانا واقعہ یاد آگیا۔ ایک بار جب بچپن میں وہ ملیریا بخار میں تڑپ رہی تھی، اُس وقت اُس کی ماں بھی جو کہیں باہر گئی ہوئی تھی، آکر بیٹی کے سرہانے بیٹھ گئی اور پیار سے اُس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا پھر اُس کا ماتھا چوم کر کچھ ایسے ہی جملے بولے تھے۔ اِس کے بعد فوراً ہی اُس کا بخار اُتر گیا تھا۔

اُس کے ہوش کی آڑ میں بے ہوشی کام کر گئی۔ اُسے یہ گھر اِس کی دیواریں، اور ہر ایک سامان اپنے گھر جیسا ہی محسوس ہونے لگا۔ جیسے وُہ وہاں آٹھ برس کی عمر سے ہی رہ رہی ہے، اور اُس کی ماں در حقیقت اُس کے سرہانے بیٹھی ممتا بھری نظر سے اُس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ ماں کی بھُولی ہوئی محبت، اُس کے دل میں پھر تازہ ہو گئی۔ وہ سارے دکھ درد بھول گئی اور اس کا دل ماں کے پیار سے لبریز ہو گیا۔

اُس نے لیٹے لیٹے ہی سر پیچھے کر کے سرہانے بیٹھی عورت کی طرف دیکھا۔ پھر دونوں بازو پیچھے لے جا کر آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی: "ماں تم مجھے چھوڑ کر کہاں چلی گئی تھیں۔ مجھے اپنے ساتھ چمٹا لو۔ ماں تم تو مر گئی تھیں۔ لوگ کہتے تھے کہ تم مر گئی ہو۔ (کچھ سوچ کر) ہاں! میں نے خود باپو جی کو تمہیں آگ لگاتے ہوئے دیکھا تھا تم مجھے بھی ......" یہاں آ کر ماں کی محبت سے اس کا گلا بھر گیا اور وہ ہچکیاں لینے لگی۔

سرہانے بیٹھی عورت سے برداشت نہ ہو سکا۔ اُس نے مریضہ کو اُٹھا کر گلے سے لگا لیا اور اُسے سینے سے لپٹا کر بولی: "میری بچی۔ میں ہمیشہ کے لیے تیرے پاس رہوں گی۔ خدا...... پرمیشور کرے تو تندرست ہو جائے۔"

مریضہ اب پوری طرح ہوش میں تھی۔ اِس کے ساتھ ہی اُس نے دیکھا کہ اس گھر کی ہر چیز اور پھر اُس عورت کا، جسے وُہ ماں سمجھ رہی تھی، حلیہ بدل کر اور کا اور ہو گیا۔ اُسے پتہ چلا کہ جس گھر کو وہ ماں کا گھر سمجھ رہی تھی، وہ اصل میں کسی مسلمان کا گھر تھا۔ اپنے اُول جلول بولنے پر وہ شرمندہ سی ہو گئی اور حیران ہو کر بولی: "میں کہاں ہوں؟" اور گلا سوکھنے کی وجہ سے اس نے پانی مانگا۔

بوڑھی نے آہستہ سے اُسے چارپائی پر لِٹا دیا اور خود "لے بچّی میں لائی پانی" کہتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

مریضہ اب ہوش میں آ چکی تھی۔ وہ سوچنے لگی: "یہ تو مسلمان ہے۔ میں اِس کے ہاتھ کا پانی کیسے پی سکتی ہوں۔ میں کبھی نہیں پیوں گی۔"

اِتنے میں عورت اندر آئی۔ اور اُس کے ساتھ ایک ہندو لڑکا تھا۔ جس کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا۔ پانی پی کر اُس کے سوچنے کی طاقت پُوری طرح لوٹ آئی اور اُس نے پوچھا: "میں یہاں کیسے آ گئی۔ میں تو......"

بیچ میں ہی اُس عورت نے ٹوکتے ہوئے کہا: "بی بی بیٹی۔ میں بتاتی ہوں۔ لیکن تو کوئی فکر نہ کر۔ اِس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھ۔ ہم بے شک مسلمان ہیں۔ لیکن تیرے مذہب کو کوئی ضُعف نہیں پہنچے گا۔"

عورت نے بتایا: "میں اور میرا لڑکا ہم آج ہی انبالے سے آ رہے تھے۔ میرا بڑا لڑکا وہاں ٹھیکیداری کا کام کرتا ہے۔ صبح چار بجے ہم گاڑی سے اُترے اور تانگہ کرائے پر لے کر ابھی ڈیڑھ میل کے قریب آئے ہوں گے

کہ رہانہ والے گاؤں کے باہر تمہیں بے ہوش پڑے ہمارے کوچوان نے دیکھا۔ پہلے تو ہم نے تجھے مُردہ ہی سمجھا۔ لیکن میرا بیٹا ڈاکٹری کی تھوڑی بہت سُوجھ بُوجھ رکھتا ہے۔ اُس نے دیکھ کر کہا "اماں اِس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس کے دِل کی دھڑکن دیکھو"۔ میں نے جب ہاتھ لگایا تو مجھے ہلکی ہلکی دھڑکن محسوس ہوئی۔ میرا بیٹا کہنے لگا۔ 'چل اماں! اسے گاؤں والوں کے حوالے کر آئیں۔ کہیں ایسا نہ ہو بیگانی بیٹی ایسے ہی مرجائے'۔ ہم نے اِدھر اُدھر بہت دیکھا لیکن ہمیں کوئی آدمی کہیں دکھائی نہ دیا۔ مینہ اس وقت تھوڑا تھوڑا برس رہا تھا۔ ہماری صلاح تھی کہ کوئی آدمی مل جائے اور تجھے اُسے سونپ جائیں۔ پھر سوچا چلتے ہیں۔ گاؤں میں خبر کر دیتے ہیں۔ لیکن پھر یہ خیال آیا۔ پتہ نہیں اِس قہر کی سردی میں کوئی گھر سے نکلے یا نہیں۔ اور پھر ایسے موقعوں پر لوگ پولیس کے ڈر کے مارے بھی آگے نہیں بڑھتے۔ اور تیری حالت بھی خراب تھی۔ آخر بیٹے کے مشورے پر میں نے تجھے اُٹھا کر تانگے میں ڈال لیا اور گھر لے آئی۔ گھر آکر پہلے ڈاکٹر کو بلا بھیجا۔ تمہارے گیلے کپڑے تبدیل کیے۔ آگ کی گرمی پہنچائی۔ اتنے میں ڈاکٹر بھی آگیا۔ بھلا ہو اس کا بے چارہ متواتر دو گھنٹے تیرے سرہانے بیٹھا دوا دارو کرتا رہا۔ تمہارے سر کے پچھلے حصے میں زخم تھا اور لہو سے تمہارے سارے بال چپک گئے تھے۔ اُس نے زخم سی کر مرہم پٹی کی۔ اِس کے بعد غفور کئی بار تاکید کر کے وانڈے (دوسرے شہر) چلا گیا ہے۔ تم سارا دن بے ہوش رہیں اور اب کہیں خدا کے فضل سے ہوش آیا ہے"۔

تھوڑی دیر ٹھہرنے کے بعد بوڑھی نے پھر کہا "بچی اب تو اپنی آپ بیتی سُنا۔ کہ قسمت نے تجھے یہ دن کیسے دکھایا اور کِس ظالم نے تیری یہ حالت کی؟ ہاں اور سب سے پہلے بتا کہ تیرا نام کیا ہے۔ میں کس نام سے پکاروں؟"

مریضہ لیٹی لیٹی اُس کی باتیں سن رہی تھی۔ اور اُس کے چہرے پر مختلف اتار چڑھاؤ ظاہر ہو رہے تھے۔ کبھی وہ غصے میں تلملا اُٹھتی۔ کبھی نفرت اور حسد سے اُس کے ماتھے پر بل پڑ جاتے اور کبھی اِس عورت کے احسانات کے خیال سے اُس کی آنکھیں احسان مندی اور پیار سے چمک اُٹھتی تھیں۔

عورت کی بات کا اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ عورت نے پھر پوچھا "بچی فکر نہ کر، مصیبت اچھوں اچھوں پر آتی ہے۔ قسمت کے آگے کسی کا زور نہیں۔ ہاں تو میں نے پوچھا تھا تیرا نام کیا ہے؟"

اُس نے پلو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے جواب دیا "گوردیئی"۔

عورت نے پھر کہا "اچھا بی بی گوردیئی، بیٹی اب تم اپنا حال سناؤ اور ساتھ ہی اپنے گھر کا اتا پتہ بتاؤ۔ غفور بہت بے چین ہو رہا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ جلد سے جلد اس کا پتہ ٹھکانا معلوم ہو جائے تو اِس کو جا کر پہنچا آئیں۔ بچی، زمانہ بہت خراب ہے۔ ہنسائے کا نام نہیں ہوتا۔ رُلانے پر لوگ فوراً انگلی اٹھانا شروع کر دیتے ہیں"۔

گوردیئی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پھر بولی "ماں جی۔ آپ نے مجھ پر بہت احسان کیا

ہے لیکن اگر آپ مجھ پر یہ کرم نہ کرتیں تو بہت اچھا ہوتا۔ میں سارے دُکھوں سے چھوٹ جاتی۔ لیکن بد قسمت آدمیوں سے موت کو بھی ڈر لگتا ہے۔ پتہ نہیں ابھی میری قسمت میں کون کون سی مصیبتیں لکھی ہیں۔" یہ کہتے ہوئے آنسوؤں سے اس کا چہرہ بھیگ گیا۔

اِس مصیبت زدہ کی باتیں سُن کر عورت کا کلیجہ پھٹا جاتا تھا۔ وہ اس کے سر کو باہوں میں سمیٹ کر تسلّی دینے لگی۔ دِل کا غُبار نکل جانے پر گوردیئی کا دِل کچھ ہلکا ہوا اور پھر وہ بولی "میرا میکہ گاؤں دیروال میں ہے۔ میں دس برس کی تھی جب میری ماں مرگئی تھی۔ اور میرا کوئی بہن بھائی نہیں تھا۔ صرف ایک باپ کی ذات تھی لیکن وہ بھی نہ ہونے کے برابر۔ بُری عادتوں میں پڑ کر وہ کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ جب تک ماں زندہ رہی، گھر میں آٹھوں پہر لڑائی جھگڑا ہوتا تھا۔ اگر وہ شراب پینے سے منع کرتی تھی تو باپو اُسے رُوئی کی طرح دُھنک کر رکھ دیتا تھا۔ بے چاری اِن مصیبتوں کی ماری جل بھُن دنیا سے چلی گئی۔

"اس کے مرنے کی دیر تھی کہ باپو کو جیسے آزادی مل گئی۔ اُسے ٹوکنے والا کوئی نہ رہا۔ دِن رات شراب کا دور چلتا رہتا تھا۔ اُس کے یار دوستوں کو جب تک کھانے کو ملتا رہا تب تک سائے کی طرح وہ اس کے ساتھ لگے رہے لیکن جب سب کچھ لٹا کر باپو دھوئیں کا ملنگ ہوگیا تو سب اپنا راستہ ناپ گئے۔

"اِدھر میں اس کے دروازے پر ہاتھی بن کر جھول رہی تھی۔ لیکن اس کو چڑھتی اُترتی کی ذرا فکر نہیں تھی۔ مجھے پندرھواں برس لگ گیا تھا۔"

بڑھیا بولی "اور اتنی عمر تک تیری منگنی کیوں نہ ہوئی؟"

"منگنی تو میری ماں کر گئی تھی۔ لیکن باپو نے اُسے توڑ دیا تھا۔"

"کیوں؟"

"کیا بتاؤں۔ جتنے مُنہ اتنی باتیں۔ ماں کے زندہ رہتے تو کوئی بات نہیں نکلی۔ لیکن اُس کی آنکھیں بند ہونے کی دیر تھی کہ طرح طرح کی افواہیں اُڑنے لگیں۔ کوئی کہتا تھا کہ لڑکے والوں نے لڑکی کے اَن پڑھ ہونے کی وجہ سے منگنی توڑ دی ہے۔ کوئی کہتا۔ باپو نے اُن سے کچھ روپیہ مانگا تھا۔"

بڑھیا بولی "لیکن بیٹا۔ تمہیں انھوں نے پڑھایا کیوں نہیں؟ آپ ہندوؤں میں تو لڑکے لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی سکول بھیج دیتے ہیں؟"

"لیکن میرا باپ ان لوگوں میں سے نہیں تھا۔ میں پڑھنا چاہتی تھی۔ لیکن اُس نے ایک ہی رٹ پکڑی ہوئی تھی۔ وہ کہتا تھا۔ لڑکیاں پڑھ لکھ کر بگڑ جاتی ہیں۔ اور یہ بھی کہا کرتا تھا کہ جب ہماری سات پشتوں میں کوئی پڑھا ہوا نہیں ہے تو ہم کیوں اپنے خاندان کو داغ لگوائیں۔"

"اچھا پھر؟"

"پھر کیا۔ پہلے رِشتہ چھوٹ گیا۔ باپو کی چنڈال چوکڑی پھر کچھ دنوں سے اُس کے آگے پیچھے پھرنے لگی تھی اور پاس سے پیسے خرچ کرکے اُسے شراب پلانے لگی تھی۔"

"اِس کا کیا مطلب؟"

"اِس کا مطلب یہ ہے کہ وہ باپو سے کہہ سُن کر میرا رشتہ ایک ایسی جگہ کرانا چاہتے تھے جہاں باپو مانتا نہیں تھا۔ لیکن قسمت پر کس کا زور چلتا ہے۔ اُنھوں نے باپو کو رضامند کرہی لیا اور میرے عوض میرے باپو نے میرے سسرال والوں سے ہزار ہزار کی دو تھیلیاں رکھوا لیں۔"

"کچھ دنوں کے بعد میری شادی ہوگئی۔ میرے دُکھوں کی کہانی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ میں سسرال آئی۔ ان (شوہر) کی عمر میرے باپ سے بھی زیادہ تھی۔ ابھی پچھلے سال ہی اُن کے پوتے کا مونڈن سنسکار ہوا تھا۔ کھانسی اور دمے نے اُن کی صحت بگاڑ رکھی تھی۔ گھر میں بہوئیں، بیٹے اور پوتے پوتیاں موجود تھے۔ دولت کا کوئی حساب نہیں تھا۔ ساہوکارے میں اُنھوں نے کافی روپیہ کمایا تھا۔

بڑھیا بولی "لیکن بی بی تیرے باپو نے تو بھول کی ہی تھی، لیکن کیا ذات برادری والوں نے بھی یہ نہ پوچھا کہ اونٹ کے گلے میں گھنٹی کیوں باندھی جارہی ہے۔ بیٹی بیچ کر پیسے کھرے کرلیے اور وہ بھی ایک جگہ سے رشتہ چھڑا کر۔ اُنھوں نے کوئی حیل حجت نہ کی۔"

"ماں جی۔ برادری کی بات کیا پوچھتی ہیں۔ برادری کا ہی تو یہ سب کیا دھرا تھا۔ جس چنڈال چوکڑی کے ساتھ روٹی بوٹی ایک تھی، وہی تو برادری کے کرتا دھرتا تھے۔ اس برادری کے کاٹے ہوئے سانس نہیں لے سکتے۔ ماں جی یہ بڑے لمبے قصے ہیں۔ برادری کی ایک ایک بات سناؤں تو پہروں ختم نہ ہوں۔ اگر ذات برادری والے میری ناؤ میں پتھر نہ ڈالتے تو آج میں اِس حالت کو کیوں پہنچتی۔"

زمین کو چھوکر، پھر کانوں کو ہاتھ لگاتی ہوئی بڑھیا بولی "توبہ! اچھا بچی پھر کیا ہوا؟"

"پھر وہی ہوا جس کی اُمید تھی۔ شادی کی پہلی سال گرہ بھی ابھی نہیں ہوئی تھی کہ سارا تماشہ اُجڑ گیا اُن کو پہینے، دوسرے مہینے دمے کا دورہ پڑتا تھا۔ آخری دورہ ایسا پڑا کہ آٹھ پہروں میں لے گیا اور میں نصیبوں کو روتی رہ گئی۔

"کاش بدنصیبی میرا پیچھا یہیں چھوڑ دیتی۔ مجھے اِسی حالت میں پڑا رہنے دیتی، تب میں بھی اور مصیبت زدوں کی طرح اپنی بیوگی کاٹ لیتی۔ لیکن ایسے نصیب بھی تو ہوتے۔ دونوں سوتیلے بیٹوں میں سے چھوٹا کنوارا تھا اور سکول میں پڑھتا تھا۔ وہ تو میری کسی بات میں کم ہی دخل دیتا تھا لیکن بڑا بیٹا اور اس کی بیوی تو اُن کے

جیتے جی ہی مجھ پر دانت پیستے رہتے تھے۔ وہ من مانے ڈھنگ سے مجھے ستانے لگے۔ اُس پر میں بھی حد درجے کی بڑبولی اور ضدی تھی۔ جب تک ایک کی چار نہ سنا لیتی، دِل کو چین نہ پڑتا۔ اگر پیٹ میں عِلم کے چار الفاظ ہوتے تو اپنا آگا پیچھا سوچ لیتی۔ لیکن ہائے رے بدنصیبی ۔۔۔۔!

" گھر میں ہر وقت بری برائیوں کا ذکر چلتا رہتا، اور مجھ پر طرح طرح کے اِلزام تھوپے جاتے۔ کوئی میرے ساتھ سیدھے مُنہ بات نہیں کرتا تھا۔ پہلے تو گالی گلوچ دے کر ہی اپنا غصہ ٹھنڈا کر لیتے تھے لیکن اب میرا بڑا بیٹا کرم چند جب بیوی کے سکھائے پڑھائے سے زیادہ طیش میں آجاتا تو مجھے مارنے پیٹنے بھی لگتا تھا۔

" میں غصے کی ماری کئی بار روٹی نہیں کھاتی تھی لیکن وہاں منانے والا کون تھا۔ آخر خود ہی جھک مار کر پیٹ کی آگ کو ٹھنڈا کرنا پڑتا تھا۔

" اِس طرح دُکھ کی گھڑیاں گنتے کچھ دِن اور بیت گئے۔ ایک دِن میرے باپ کی بیماری کی اطلاع آئی تو میں میکے کے لیے تیار ہو گئی۔

" میں جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ اُس وقت میرا بڑا لڑکا کرم چند میرے پاس آیا اور اس نے بڑی محبت سے میرے باپ کی بیماری کے بارے میں پوچھا۔ پھر کہنے لگا۔ میرا خیال ہے۔ گھر میں روز کی لڑائی اچھی نہیں۔ اگر تیری صلاح ہو تو ہم چار برادری والوں کو بُلوا کر بانٹ بٹوارہ کر لیں۔

" میں رضامند ہو گئی۔ اُس نے تھوڑی دیر ٹھہر کر پانچ چار آدمی اکٹھے کیے جن میں اُس گاؤں کا پنڈت بھی تھا۔ ایک کاغذ لکھ کر انہوں نے انگوٹھا لگانے کے لیے کاغذ میرے سامنے رکھا، جس کا مضمون انھوں نے مجھے اِس طرح پڑھ کر سنایا:۔

" گھر کی کل جائیداد اور نقدی ملا کر ساٹھ ہزار کی فہرست تیار کی گئی ہے۔ جس میں سے بیس ہزار گوردئی کو دیا۔ بیس ہزار کرم چند کو اور باقی بیس ہزار چھوٹے لڑکے لیے امانت رکھ دیا جائے۔ اِس کے علاوہ گوردئی اور کرم چند کی بیوی کا زیور ہے اُس کی قیمت ڈال کر تین حِصے کیے جائیں۔ دو حصے اِن دونوں کو دیے جائیں اور تیسرا حِصہ چھوٹے کی شادی کے لیے جمع کر دیا جائے۔

" اِس کے نیچے اُنہوں نے میرا انگوٹھا لگوا لیا۔ اور کئی گواہیاں بھی ڈال دیں۔ پھر اُن کے کہنے پر میں نے یہ سوترا (زیور) رکھ کر باقی تمام زیور ان کو دے دیا۔ اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ تو میکے سے لوٹ آ۔ تیرے آنے تک زیور کی قیمت بھی لگائی جائے گی اور ساتھ ہی جائیداد کا حِصہ بھی تیری جھولی میں ڈال دیا جائے گا۔

"میں اسی دِن شام کو میکے چلی گئی۔ وہاں جا کے دیکھا۔ باپو ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ سب کچھ اُس کے مفت خور دوستوں نے ہضم کر لیا تھا۔ میرے جانے کے دوسرے دِن ہی اُس کے لیے موت کا پیغام آ گیا۔ میں اُس کے کِریا کرم سے فرصت پا کر سسرال لوٹ آئی کیونکہ مجھے اپنا حِصہ لینے کی جلدی تھی۔

"کل شام کو میں گھر میں داخل ہوئی۔ اُس وقت دھیما دھیما مینہہ پڑ رہا تھا اور طوفان سر پر کھڑا تھا۔ میں سردی کے مارے سکڑی جا رہی تھی۔ گھر پہنچ کر میں نے سب کے تیور بدلے ہوئے دیکھے۔ میرے کمرے کا تالا توڑ کر اُس میں سے سارے ٹرنک نکال لیے گئے تھے۔ یہ دیکھ کر میری سانس جہاں تھی وہیں رُک گئی۔ پوچھنے پر بہو نے بڑی تلخی سے جواب دیا۔ اِن چیزوں سے اب تیرا کیا واسطہ، جا جہاں سے آئی ہے۔"

"میرے پاؤں کے نیچے جیسے انگارے آ گئے۔ میں نے رونا پیٹنا اور شور مچانا شروع کیا۔ سارا اڑوس پڑوس اِکٹھا ہو گیا۔ کرم چند بھی آ گیا۔ اور اُس کے ساتھ کئی چودھری بھی۔

"میں نے جہاں تک ہو سکا سارا معاملہ اُن کو سُنا دیا۔ بہو نے صندوق میں سے وہی میرے انگوٹھے والا کاغذ لا کر پنچوں کے سامنے پھینک دیا۔ ان میں سے ایک نے پڑھا۔ "میں اپنے شوہر کی جائیداد کا تیسرا حصہ لے کر تیرتھ یاترا پر جا رہی ہوں۔ اب میرا گھر کی کسی چیز سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔"

"یہ سُن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ لیکن میری وہاں کون سنتا تھا۔ گھر کے آدمی اور باہر والے سب ہی مجھے لعنتیں دینے لگے اور کچھ دیر بعد سب اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ میں نے گالی گلوچ اور دُہائی سے چھت سر پر اُٹھا لی۔ گھر کے تینوں آدمی خوں خوار شیر کی طرح میری طرف لپکتے تھے۔

"آخر جب میں نے یہ دھمکی دی کہ میں دھرنا دے کر یہیں لیٹ رہوں گی اور اپنا حِصہ لے کر چھوڑوں گی تو پھر ان سب کا غصہ اور بھی بھڑک اُٹھا۔ پھر اُن کو پنچوں کی بھی حمایت حاصل تھی۔ اُنھوں نے گھونسوں، لاتوں سے مجھے مارنا شروع کیا۔ اِس مار کٹائی میں بہو نے روٹیاں پکانے والا بیلنا میرے سر پر دے مارا اور میں لہو لہان ہو کر گر پڑی۔ اب اُن کو اپنی فکر پڑ گئی۔ اِس کے بعد میرا مُنہ کپڑے سے بند کر کے اور ٹانگوں اور بازوؤں سے گھسیٹ کر وہ مجھے گھر سے کافی دور باہر ایک اُجاڑ جگہ میں پھینک گئے۔

"اُس وقت بارش بہت زور کی ہو رہی تھی۔ مجھے جب ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میرے کپڑے ہوسے تر تھے اور جو بچ گئے تھے وہ بارش سے بھیگ گئے تھے۔ میں گرتی پڑتی اُٹھ کر چلی۔ دو تین پڑوسیوں کے دروازے کھٹکھٹائے لیکن کسی نے دروازہ نہ کھولا۔

"اُس وقت مجھے خیال آیا۔ میں اب جی کر کیا کروں گی۔ کنوئیں میں چھلانگ لگا کر مرنا ہی میرے

لیے سب سے آسان راستہ رہ گیا تھا۔ میں گاؤں کے باہر والے کنوئیں کی طرف چل پڑی۔ رات اندھیری تھی۔ لمحے لمحے بعد بادل گرجتے اور بجلی کڑکتی تھی۔ بارش ہر قدم پر تیز ہوتی جا رہی تھی۔ کنواں کافی دور تھا۔ میں آندھی کے تھپیڑوں کے دھکے کھاتی اور بارش سے چھلنی ہوتی جا رہی تھی اور میری ٹانگیں اور میرے ہوش و حواس جواب دیتے جا رہے تھے۔ اس لیے ایک قدم بھی آگے بڑھانا میرے لیے دُشوار ہو رہا تھا۔ اندھیرا بھی اِتنا تھا کہ مجھے پتہ ہی نہیں لگ رہا تھا کہ کنواں کس طرف ہے۔ کبھی کبھی جب بجلی چمک جاتی تو میں راستے کا اندازہ لگا کر اُس طرف چل دیتی تھی۔ بدقسمتی سے جدھر میں جا رہی تھی اُدھر سے ہی ہوا اور بارش اتنے زور سے آ رہی تھی کہ میں اگر ایک قدم آگے بڑھتی تھی تو اِس سے چار قدم پیچھے دھکیل دی جاتی تھی۔

"آخر میں اُس جھونپڑی میں جا گری اور بے ہوش ہو گئی۔ پھر جب ہوش آیا تو میں نے خود کو یہاں پایا۔"

گوردیئی کی درد بھری کہانی سُن کر بڑھیا کا دل رو اُٹھا۔

(۳)

پنڈت رادھے کِشن جی کو اس گاؤں کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ خاص کر یہاں البیلے اور من موجی نوجوان تو انھیں دیوتاؤں کی طرح پوجتے ہیں۔ اُن میں سے کوئی تو اُنھیں حاتم طائی اور کوئی راجا بکرماجیت کا اوتار کہتا ہے۔ نیکی کرنے کی تو جیسے اُنھیں عادت سی پڑی ہوئی ہے۔ جب بھی کسی پر کوئی بپتا پڑے یا مقدمے کی نوبت آ جائے یا کسی کے گھر میں ہی کوئی جھگڑا ہو جائے تو اوّل تو لوگ ایسے موقعوں پر خود ہی پنڈت جی کی طرف بھاگے آتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی بدقسمت ایسے وقت بھی ان کی خِدمت میں حاضر نہ ہو تو وہ خود سات کام چھوڑ کر اس کے پاس چلے جاتے اور ہر معاملے میں دل چسپی لے کر اس کو سلجھانے اور نپٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک بار ایک کِسان کا بیل لالہ بھانے شاہ کے کھیت میں چلا گیا تھا۔ تو آپ کی عقلمندی سے ہی جھگڑا ختم ہوا اور کسان سے بیس روپے کا قرض نامہ لکھوایا گیا تھا۔ کسان بے وقوف تھا۔ پنڈت جی کی شان اور حیثیت نہ سمجھ کر اوٹ پٹانگ بول پڑا۔ اِس گستاخی کے سبب پنڈت جی کی ایسی بد دعا لگی کہ وہ پنپ نہ سکا۔ اِس بات کو اب چھ سال ہو رہے ہیں۔ ابھی تک وہ قرض نہیں اُتار سکا بلکہ اس میں اُس کا ایک بچھڑا تک بِک گیا لیکن بھانے شاہ کے روپے جیسے کے تیسے بنے رہے۔

آپ کے معتقدوں نے اِس طرح کی ہزاروں کراماتوں کا ذکر کر کے لوگوں کو یقین دلا دیا ہے کہ پنڈت جی پورے گیانی ہیں۔ آپ کی سب سے بڑی کرامات یہ ہے کہ نہ تو خود کوئی کام کاج کرتے ہیں اور نہ کبھی پوتھی

کھولنے کی آپ کو ضرورت پیش آئی ہے لیکن پھر بھی گھر میں ہُن برستا ہے۔ پنڈتانی کو آپ نے نوجوانی میں ہی اس لیے گھر سے باہر نکال دیا تھا کہ وہ ان کے خیال میں کم ذات اور چنڈال تھی کیونکہ گھر کا آدھا اناج وہ غریبوں میں ہی بانٹ دیتی تھی اور پنڈتانی ہوتے ہوئے بھی ججمانوں پر رعب جما کر اُن سے کچھ وصول نہیں کر سکتی تھی بلکہ اس کے برعکس اس کے سارے طور طریقے بھی رذیلوں والے ہی تھے۔ کسی کو ذرا تکلیف ہوتی تو وہ فوراً نیچی ذات کی عورتوں کی طرح اُن کی خدمت کے لیے چھوٹے سے چھوٹا کام بھی کرنے کو تیار ہو جاتی تھی۔ آخر جب پنڈت جی کو ایک دن گیان ہوا کہ یہ پچھلے جنم سے شودر رہے اُس دن سے ہی انھوں نے اُس کے ساتھ ملنا جلنا ترک کر دیا اور پھر کبھی اُس کو منہ نہیں لگایا۔

شاستر ودّیا میں وہ خود کو بہت ماہر سمجھتے ہیں۔ لوگ عمروں تک کتابوں کے کیڑے بننے پر بھی جس گہرے علم کو حاصل نہیں کر سکتے، آپ الف ب پڑھے بغیر ہی اور کسی کتاب کو چھوئے بنا ہی عالم فاضل بن گئے ہیں۔ کیا مجال جو شاستر ارتھ میں آپ سے کوئی جیت سکے۔ لاعلمی اور جہالت کی وجہ سے جن قدرتی خوبیوں کو لوگ بھول بیٹھے تھے آپ نے سرے سے انھیں لوگوں پر ظاہر کرنے میں کامیاب ہو رہے تھے۔ شِوجی مہاراج کی منظور نظر بتا کر بھنگ پینے کی تلقین کرنا۔ شراب کو دیوتاؤں کا چودھواں رتن اور سوم رس ظاہر کر کے اس سے شغل کرنا اور کرانا۔ جوئے کو کوروا اور پانڈووں کا دل بہلاوا بتا کر اس سے محظوظ ہونے کے لیے عوام کی توجہ دلانا وغیرہ۔ اس قسم کے کئی نیک کام آپ نے اِس ایک جنم میں ہی کر ڈالے تھے۔

شہر کے امیرزادوں اور نوجوانوں کی محفل آپ کے گھر میں جمتی تھی، گھر جس کی حیثیت مدرسے کی سی تھی اور جہاں آپ چودھری کی شکل میں جلوہ افروز ہو کر شاستر اور سیاسی مضامین پر وعظ شروع کرتے تو سامعین عش عش کر اٹھتے۔

آج ہم اپنے قارئین کو ان پنڈت جی کی محفل میں لے چلتے ہیں۔ رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ سردی بے شک انتہا کی پڑ رہی تھی لیکن پنڈت جی کی محفل کی تپش کے سامنے اس کی دال نہیں گل رہی تھی۔ چوبارے میں تو اس کا دخل اس لیے بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہاں کوئلوں کی انگیٹھی لپٹوں کے ساتھ دہک رہی تھی۔ وہاں آپ کے کچھ خادم مچھلی اور مرغ کے ذائقہ دار پکوان پکانے میں مصروف تھے۔ اور آپ کے پجاریوں کے دلوں جسموں تک سردی کا پہنچنا ویسے ہی ناممکن ہے کیونکہ وہاں تو شراب کا دخل ہے!

نو بجتے بجتے سب چیلے اپنی اپنی جگہوں پر رونق افروز ہو گئے اور اس کے بعد پنڈت جی اپنی گدی پر تشریف فرما ہوئے۔ اس وقت سارے حاضرین نے کھڑے ہو کر پنڈت جی کا خیر مقدم کیا اور فوراً ہی ایک خادم نے بوتل کا کارک کھولنے کے ساتھ ہی کھانے پینے کا سامان اکٹھا کر کے اس کا شری گنیش کرنے کے لیے پنڈت جی

کی اجازت چاہی۔

پنڈت جی نے بڑے غور سے سب پر کرم کی نظر دوڑائی اور پھر بولے "دوستو — ابھی ٹھہر جاؤ — ابھی ہماری محفل کی رونق خواجہ صاحب تشریف نہیں لائے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے انھیں کسی نے آج کی محفل کے لیے پیغام نہیں بھیجا۔"

بیچ میں ہی کوئی بول پڑا "نہیں جی، میں خود دو بار اُن کے ہاں ہو آیا ہوں۔ وہ بالکل تیار تھے۔ لیکن کچھ اجنبی سے دیہاتی آ گئے۔ اِس لیے وہ پھر بیٹھ گئے۔ میرا خیال ہے اُن سے بات چیت کرنے میں دیر ہوگئی ہوگی۔ نہیں تو بھلا وہ کہیں ٹھہرنے والے ہیں؟"

اِسی وقت باہر سے بُوٹوں کی کچ پچ کی آواز آئی۔ اور پنڈت جی "وہ آگئے" کہہ کر گدی سے اُٹھے اور خوش آمدید کہنے کے لیے دروازے کی دہلیز میں جا کھڑے ہوئے۔

خواجہ شیر خاں صاحب سب انسپکٹر پولیس لگ بھگ تین سال سے اِس علاقے کی عزّت دوبالا کر رہے تھے۔ آتے ہی پنڈت جی سے بڑی گرم جوشی سے ملے اور پھر دونوں ایک گدی پر رونق افروز ہوگئے۔ پنڈت جی بولے "سنائیے جی۔ اِتنی دیر سے پہنچنا تھا بھلا؟ انتظار میں آنکھیں بھی تھک گئی ہیں۔ اگر دو پل اور نہ آتے تو آج کی محفل ہی منسوخ ہو جاتی تھی۔ بھلا جرنیل کے بغیر بھی فوجیں اچھی لگتی ہیں؟"

اپنی تعریف پر پھول کر خواجہ صاحب پگڑی کا طرّہ سنوارتے ہوئے بولے "واہ پنڈت جی، ماشاللہ آپ کی موجودگی میں بھلا کس بات کی کمی رہ سکتی ہے۔ میں تو اب تک کب کا آگیا ہوتا لیکن کام ہی ایسا آپڑا جس کی وجہ سے کچھ دیر ہوگئی۔"

پنڈت جی کچھ اور پھسل کر خواجہ صاحب کے نزدیک ہوگئے اور اُن کے کان سے مُنہ لگا کر بولے:

"کیوں کوئی نئی مرغی۔۔۔؟"

سر سے طرّے والی پگڑی اُتار کر ایک خادم کو پکڑا کر گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خواجہ صاحب بولے "ہاں خدا نے بھیج ہی دیا ہے ایک آسامی۔"

"تو سُنائیے کچھ ہاتھ گرم ہوا، مُعاملہ کیا تھا؟"

"معاملہ تو یونہی معمولی سا تھا۔"

"اچھا! میں نے سمجھا۔ کوئی خون کا مقدمہ آیا ہوگا۔"

"توبہ استغفار۔ پنڈت جی ایسی قسمت کہاں؟ وہ تو سال چھ مہینے بعد ہی کوئی موٹی مرغی پھنستی ہے اگر اس طرح روز روز خون کے مقدمے آنے لگیں تو ہم سونے کے جھولے میں نہ جھولنے لگیں۔"

"تو بھی کوئی چار پانچ سو؟"

"نہیں نہیں صرف دو سو۔"

"معاملہ کیا تھا؟"

"معمولی معاملہ تھا۔ ساتھ والے گاؤں سلطان پور کے کچھ کسانوں کا پھیرا لگانے (چوری کرنے کا پروگرام تھا۔"

پنڈت جی مونچھوں کو سنوارتے ہوئے بولے "اچھا تب تو ابھی خیر سے مُراد مانگ کر گئے ہیں۔ اگر مراد پُوری ہوگئی۔ پھر تو امید ہے اچھا ہاتھ گرم کرائیں گے۔"

"ہاں اُمید تو ہے۔ چوتھے حصّے کا فیصلہ ہُوا ہے۔"

"شکر ہے۔ پرماتما اسی طرح دیے جاتا ہے کسی نہ کسی بہانے خواجہ صاحب۔ وہ بڑا مہربان ہے، پتھروں میں کیڑوں کو بھی روزی پہنچاتا ہے۔" کرم چند کی طرف دیکھ کر اور پھر خواجہ صاحب کی طرف دیکھ کر) "ہاں سچ آپ کو آج کی محفل کا سبب تو معلوم ہی ہوگا۔ ہمارے چیلے نے آج کا کل خرچ اپنے ذمّے لیا ہے۔ خواجہ صاحب، یہ بہت شریف آدمی ہیں۔ اِن کے سورگ باسی پِتا کے ساتھ تو ہمارے بہت اچھے تعلقات تھے یہ بھی بڑے قدر دان ہیں۔ (ڈکار مارتے ہوئے) ہری او...م۔"

خواجہ صاحب نے مسکراتے ہوئے کرم چند کی طرف دیکھا تو وہ فوراً ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا۔ ہاتھ سے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولے "اچھا یہ اُس عورت والے معاملے کی بابت ؟۔ ہاں پنڈت جی مجھے معلوم ہے۔ بڑا اچھا ہوا جو اسے دفع کر دیا گیا لیکن اُس کا کچھ پتہ چلا کہ کہاں گئی؟"

پنڈت جی گلاس آگے بڑھاتے ہوئے بولے "جی پکا پتہ تو ابھی نہیں لگا لیکن دوپہر کو ایک آرائیں سے سنا تھا کہ تڑکے ایک برقعے والی عورت اسے تانگے میں ڈال کر لیے جارہی تھی۔ اُس کے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا۔"

گلاس غٹا غٹ چڑھا کر اُسے ایک طرف رکھتے ہوئے خواجہ صاحب بولے "کیا کہا؟ مسلمان کے ساتھ؟"

"جی ہاں۔"

اِتنے میں گاؤں کا نمبردار جوالا سنگھ بول اُٹھا "ہاں خاں صاحب۔ ہمارے کھیت کے پاس سے گزرا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔"

دوسرا گلاس چڑھانے کے بعد خواجہ صاحب کو سرُور آنا شروع ہوگیا اور وہ سر پر ہاتھ پھیرتے

ہوئے بولے "چلو دفع کرو اب ان باتوں کو۔ جو ہو گیا، اچھا ہو گیا۔ اب محفل کا مزا لو"

اُن کے کہنے کی دیر تھی کہ بوتلیں کھلنے لگیں اور گلاس خالی ہونے لگے۔

پنڈت جی مچھلی کے ایک ٹکڑے سے کانٹے چنتے ہوئے بولے "خواجہ صاحب آپ کا باورچی تو بڑا کاریگر معلوم ہوتا ہے۔ مچھلی بنانے میں تو کمال کر دیتا ہے۔ مُنہ سے ہٹائے نہیں ہٹتی"

"جی ہاں — یہ ہمارے ہاں پانچ سال سے کام کر رہا ہے۔ اِس کا باپ، خدا اُسے جنت نصیب کرے، اس سے بھی زیادہ کاریگر تھا۔ اصل میں گوشت بنانے میں اِس کی مہارت اس لیے بھی زیادہ ہو گئی ہے کہ اس نے میجر برٹن صاحب کے باورچی خانے میں چار سال گزارے ہیں"

اِس وقت تک شراب آہستہ آہستہ سب پر اثر انداز ہو چکی تھی اور اِس کے سرور میں سب اپنی اپنی باتیں لے بیٹھے تھے۔ پنڈت جی نے جھومتے ہوئے سب کی طرف دھیان دیتے ہوئے کہا "دوستو۔ کیا خوش قسمتی کا وقت ہے۔ کیسی ایکتا اور آپسی محبت کا راج ہے۔ سچ مچ میں جب ہندو مسلمانوں کو ایک ساتھ کھاتے پیتے ہوئے دیکھتا ہوں تو میرا دل خوشی سے جھوم اُٹھتا ہے۔ پرماتما کرے کہ سارے بھارت میں دوستی کا ایسا ہی جذبہ پیدا ہو"

خواجہ صاحب بولے "پنڈت جی — خدا کی قسم — یہ سب اِسی جامِ زمرد کی ہی برکتیں ہیں۔ کچھ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ شراب خدائی نعمتوں میں سے ایک ہے۔ پھر اِس سے محبت میں کس قدر اضافہ ہوتا ہے۔ جو اِسے بُرا کہتے ہیں وہ کمبخت اِسے کیا جانیں؟"

پنڈت: "خواجہ صاحب! اُن لوگوں کو پتہ ہی نہیں کہ دوستی کے کیا معنی ہیں۔ ہاں سچ خواجہ صاحب، آپ کئی مرتبہ خواہش بھی ظاہر کر چکے ہیں۔ اس لیے آج آپ کو ایک نئی سوغات پیش کی جاتی ہے"

"کیا؟"

"وہی گھر کی کشید شراب" اور پھر پیارا سنگھ کی طرف دیکھ کر بولے "لا اوئے نمبردار روز کہا کرتا تھا۔ خواجہ صاحب کو پلانی ہے۔ لا جلدی کر"

"ست بچن جی" کہہ کر پیارا سنگھ پاس بیٹھے ہوئے اپنے بھانجے دھنّا سنگھ کا کندھا ہلاتے ہوئے کہنے لگا "جا اوئے دُھنیا۔ تُو سی اپنی کو کہنا۔ بھوسے والے کمرے کا دروازہ کھول کر مغرب کی طرف (پھوں طرف سے) چارپائی کی پائیاں ہٹا کر نیچے سے چھوٹی دیگچی نکال دیوے۔ اُس پر کٹوری اُلٹی رکھ کر اوپر آٹا چپکایا ہویا اے۔ دھیان نال اُٹھانا۔ کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے۔ جا میرا بیبا شیر۔ جھٹ پٹ۔ بس یہاں ہے کہ وہاں ہے"

لڑکا تھوڑی دیر بعد دیگچی اُٹھا لایا اور لاکر خواجہ صاحب کے آگے رکھ دی۔ وہ پہلے ہی نشے سے چُور ہو رہے تھے۔ اِس نئی سوغات کو دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑے۔ پہلے تو بیچ میں انگلیاں بھگو کر مزہ چکھا۔ جب اچھی لگی تو چلو بھر بھر کر پینے لگے۔ پھر ہونٹ چاٹتے ہوئے بولے "آہا۔ پنڈت جی یہ تو بڑی ذائقے دار چیز ہے۔"

"میں نے آپ سے جھوٹ تھوڑی کہا تھا؟"

"اور یہ آپ نے پہلے کبھی نہیں منگوائی؟"

"پہلے ذرا آپ سے ڈرتے تھے۔ نہیں تو . . . ."

"واہ پنڈت جی مجھ سے ڈر۔ آپ تو ایمان سے میرے بھائی ہیں۔ مجھے بس۔ بس۔ یہی (یہ کہہ کر گلاس سے کئی گھونٹ بھرے) پلایا کیجیے۔ (وُہی گلاس دوبارہ بھر کر پنڈت جی کو دیتے ہوئے) واللہ! بڑی اچھی چیز ہے۔"

رات کے بارہ بجے تک یہ مجلس گرم رہی۔ آخر محفل ختم ہوئی۔ اِس وقت کون کس حالت میں تھا اور کس طرح اپنے گھر پہنچا، اِس کا پتہ نہیں —!

(۴)

شام کا اندھیرا ہر طرف پھیل چکا تھا۔ اِس وقت ایک تانگا سامنے سڑک سے آکر گاؤں کے اڈے پر رُکا۔ اس میں سے ایک مسلمان نوجوان نے اُتر کر ایک راہ گیر سے پوچھا "کیوں جی! پنڈت رادھے کشن صاحب کا گھر کدھر ہے؟"

"وہ سامنے والی حویلی ہے" کہہ کر اُس نے پوچھا "کیوں کیا کام ہے؟"

"ایک ضروری کام سے اُن سے ملنا ہے" تانگے میں بیٹھی ہوئی عورت کی طرف دیکھ کر نوجوان نے جواب دیا۔ اور تانگے کے پاس جاکر بولا "آیئے بہن جی، میں آپ کو اُن کے گھر پہنچا آؤں"

عورت کوئی جواب دیے بنا تانگے سے اُتر کر اُس کے پیچھے ہولی اور کچھ دیر بعد دونوں پنڈت رادھے کرشن کے مکان کے آگے جا پہنچے۔ نوجوان کے دروازہ کھٹکھٹانے پر اندر سے ایک پتلا سا لڑکا نکل کر پوچھنے لگا "کیا بات ہے؟"

نوجوان نے جواب دیا "پنڈت جی گھر میں ہیں؟ ان سے کام تھا۔"

"ہاں وہ گھر پر ہی ہیں۔ لیکن اِس وقت مل نہیں سکتے۔ اُن کا پوجا پاٹھ کا وقت ہے"
"کوئی بات نہیں۔ ہم تھوڑا انتظار کر لیتے ہیں۔ کتنی دیر تک وہ فرصت پا لیں گے؟"
"ایک گھنٹے تک"
"اچھا جب فرصت پائیں تو اُن تک ہماری آمد کی خبر کر دینا"
"اچھا" کہہ کر لڑکا اندر چلا گیا۔

قریباً پون گھنٹے کے بعد پنڈت جی باہر آئے اور نوجوان نے اُٹھ کر اُن کو سلام کیا۔ آتے ہی پنڈت جی نے کہا: "دروازے سے کچھ دوری پر کھڑا ہونا چاہیے تھا۔ جانتے نہیں یہ برہمن کا گھر ہے؟"

نوجوان اپنی غلطی پر شرمندہ سا ہو کر بولا: "معاف کیجیے مجھ سے واقعی بڑی غلطی ہو گئی ہے"

نوجوان (عورت کی طرف دیکھ کر) "یہ بی بی جی کل صبح اِس گاؤں کے باہر بے ہوش پڑی ہوئی تھیں، یہ دیکھ کر میں اور میری والدہ انھیں اپنے گاؤں لے گئے کیونکہ اس وقت آس پاس کوئی نہیں تھا اور اِن کی حالت بہت خراب تھی۔ اب تو اللہ کے فضل سے اِن کی طبیعت ٹھیک ہو گئی ہے۔ انھوں نے بتایا تھا کہ یہ لالہ مٹھا مل کی بیوہ ہیں۔ اب باقی حال آپ خود ہی ان سے دریافت کر لیجیے اور جس طرح ہو سکے اِن کو گھر پہنچا کر اِن کے وارثوں سے سمجھوتہ کروا دیجیے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ (عورت سے) بہن جی — آپ خود آ کر پنڈت جی کو اپنی کہانی سُنا دیجیے۔"

بات سنتے سنتے پنڈت جی کے چہرے پر غصے کی لالی جھلکنے لگی اور انھوں نے ڈانٹتے ہوئے نوجوان سے کہا: "جوان — پوشاک تو تمہاری پڑھے لکھوں جیسی ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تو کوئی ان پڑھ آدمی ہے۔"

نوجوان حیران ہو کر بولا: "بندہ نواز — آپ جیسے بزرگ کے سامنے واقعی میں ان پڑھ ہوں۔ ویسے میں ایف اے پاس ہوں۔ اگر کوئی گستاخی کا لفظ مُنہ سے نکل گیا ہو تو معافی کا خواستگار ہوں۔"

"بس میں سمجھ گیا" کہہ کر ہنستے ہوئے پنڈت جی بولے: "اِس انگریزی نے تو بھارت ورش کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ اگر تم انگریزی نہ پڑھے ہوتے تو ایک ہندو لڑکی کو بہن کہنے کی غلطی نہ کرتے۔ اپنے ساتھ تانگے میں بٹھا کر اور اپنے گھر لے جا کر کبھی بھی اِس بیچاری کا دھرم بھرشٹ نہ کرتے۔"

نوجوان پنڈت جی کا یہ جملہ سن کر اچنبھے میں پڑ گیا اور سوچنے لگا۔ میں اِن کو کیا جواب دوں۔ آخر سوچ سوچ کر اُس نے کہا: "خیر میں اپنی غلطی کے لیے معافی چاہتا ہوں اور آپ اب اِس بیچاری مصیبت زدہ کو اس کے گھر پہنچانے کی مہربانی کر دیجیے۔ اِس کی زبانی تو جو کچھ حال ہم نے سنا ہے، اُس سے تو پتہ چلتا

ہے کہ اِس کے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے !"

پنڈت جی تیزی سے بولے "نہیں — یہ اب ہندو مذہب سے گر چکی ہے۔ اس کو کسی طرح بھی... (پھر کچھ سوچ کر اور دانتوں میں اُنگلی دبا کر) ویسے تو مجھے اِس کی حالت پر بڑی دیا آرہی ہے۔ میں نے تو کل جس وقت سے سنا ہے کہ اِس کو اِس کے سوتیلے بیٹوں نے گھر سے نکال دیا ہے، تب سے اب تک کھانا بھی نہیں کھایا۔ لیکن (گوردیئی سے) بیٹی — پرنتو تو اندر چل کر بیٹھ۔ میں اُن ظالموں کو بُلا کر ابھی راہ راست پر لاتا ہوں۔ تُو کوئی فکر نہ کر۔ (ڈکار لیتے ہوئے) ہری او... م"

ایک بار ہی پنڈت جی کو غصے کے عالم سے نکل کر رحم کی حالت میں آتے دیکھ کر نوجوان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے اور وہ بے بس ہو کر پنڈت جی کے چرنوں میں جھکتے ہوئے بولا "آپ تو مجسم فرشتہ ہیں۔ میں ...."

اُس کے کچھ اور کہنے سے پہلے ہی پنڈت جی تین قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولے "دیکھو دیکھو پیر نہ چھونا ورنہ مجھے اِس سردی میں اشنان کرنا پڑے گا۔"

نوجوان کو اپنی جلد بازی پر شرم آئی اور وہ دُور سے ہی ہاتھ جوڑ کر جھک کر سلام کرتا ہوا واپس لوٹا۔ اور جانے سے پہلے اُس نے عورت کی طرف دیکھ کر کہا "اچھا اور ......" فوراً ہی اُسے اپنی پہلی غلطی کی یاد آگئی اور وہ کچھ اور کہے بغیر تانگے میں جا بیٹھا۔ کوچوان نے گھوڑے کو چابک لگائی اور تانگا سڑک پر دوڑنے لگا۔ جب تک تانگا آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو گیا، گوردیئی مشکور نظروں سے اُس کی طرف دیکھتی رہی۔

گوردیئی اندر چلی گئی۔ سامنے کمرے کے بائیں طرف پنڈت جی کا پوجا استھان تھا۔ وہ پوجا کے لیے اُس طرف جاتے ہوئے اُس سے کہہ گئے "بیٹی سامنے والی پیڑھی پر بیٹھ جا۔ میں ابھی پوجا پاٹھ سے فرصت پا کر آتا ہوں۔ ہری او ... م"

وہ سکڑ کر ایک کونے میں زمین پر ہی بیٹھ گئی اور پنڈت جی پوجا پاٹھ میں مشغول ہو گئے۔ پہلے وہ صبح کا پاٹھ کرتے رہے۔ پھر گئو مکھی ہاتھ میں پہن کر کافی دیر مالا پھیرتے رہے۔ اِس کے بعد ان کی سمادھی کھلی اور وہ اُٹھ کر آہستہ آہستہ کسی منتر کا جاپ کرتے ہوئے گوردیئی کے پاس آکر چارپائی پر بیٹھ گئے۔ پھر بولے "ہاں بیٹی — کہو کیا کہنا چاہتی ہو؟"

گوردیئی کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد تنکے سے زمین پر لکیریں کھینچنے لگی اور سر نیچے کی طرف کیے ہوئے آہستہ سے بولی "جی آپ سے کیا چھپا ہے؟"

پنڈت جی ایک ڈکار کی لمبی آواز کے ساتھ ہری اوم کہہ کر پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے "ہاں

مجھے راجا رام (نوکر) نے رات کو بتایا تھا کہ کرم چند نے تجھے مار پیٹ کر گھر سے باہر نکال دیا ہے۔ مجھے پوجا پاٹھ کی مصروفیت کی وجہ سے ان سے پوچھنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ ہری او۔۔۔م"

گوردیئی شرماتے ہوئے بولی "جی آپ کو یاد نہیں رہا ہوگا۔ اُس وقت آپ وہیں کھڑے تھے اور آپ کرم چند کے کان میں کچھ کہہ رہے تھے۔"

ہاتھ کی اُنگلی سے کنپٹی بجاتے ہوئے...... جیسے کسی بھولی بات کو یاد کر کے پنڈت جی بولے "اوہ ٹھیک۔ یاد آ گیا۔ شو شو۔ یہ دماغ کتنا کمزور ہو گیا ہے، رات کی کھائی ہوئی روٹی کی بھی یاد نہیں رہتی۔ ٹھیک ہے۔ میں اُس وقت پوجا پاٹھ کی سمگری لا رہا تھا۔ جب تمہارے گھر کے سامنے سے گزرا تو شور کی آواز آئی۔ ٹھیک۔ میں نے ہی اُس کے کان میں کہا تھا کہ اِس ابلا پر اتنا ستم نہ کرو اور اس کا حصہ اِس کے حوالے کر دو۔ لیکن وہ ظالم تو کسی طرح مانتا ہی نہیں تھا۔ پھر اُس کے بعد کیا ہوا؟"

گوردیئی نے اس وقت سے لے کر اب تک کی ساری بپتا کہہ سُنائی۔ عبدالغفور اور اس کی ماں کی مہربانی اور نیکی کا ذکر سُن کر پنڈت جی غصے سے ہونٹ کاٹتے ہوئے بولے "بیٹی! تو ابھی ان لوگوں کی چالوں کو نہیں سمجھ سکتی۔ انھوں نے تیرا مذہب تو بگاڑ ہی دیا اور ابھی اور پتہ نہیں کیا کیا شیطانی کرتے۔ مجھے کل جس وقت پتہ چلا کہ اُس گاؤں کا کوئی مسلمان تجھے بے ہوشی کی حالت میں اُٹھا کر لے گیا ہے تب میں تو جیسے سکتہ میں آ گیا۔ ایک ہندو لڑکی پر ملیچھوں کا اِتنا ستم۔ میں نے اُسی وقت اپنے ایک خادم کو گھوڑی دے کر دوڑایا کہ اُن سے کہے کہ لڑکی کو ابھی میرے مکان پر پہنچائیں، نہیں تو سارے گاؤں کے ساتھ سختی سے برتاؤ کیا جائے گا۔ بس اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ دُشٹ تجھے چپ چاپ آ کر چھوڑ گیا۔ (ڈکارلے کر) ہری او۔۔۔م"

گوردیئی بات سُن کر ذرا جوش میں آ گئی۔ وہ کچھ بولتی بولتی رُک گئی۔ اور اپنی زبان پر قابو پاتی ہوئی بولی۔

"جی اُن سے تو میں نے ہی کہا تھا"

"کیا؟"

"یہ کہ مجھے اپنے گھر نہ بھیجیں بلکہ پنڈت جی کے گھر پہنچا آئیں۔ میں نے سوچا جب آپ کرم چند کو سمجھائیں گے تو وہ مان جائے گا"

"ٹھیک ہے۔ تم نے بھی کہا اور میں نے بھی پیغام بھیجا۔ پھر تو وہ خود ہی ایسا کرتے۔ اچھا جو ہوا سو ہوا۔ اب بتاؤ۔ تم کیا چاہتی ہو؟"

"جی مجھے میرا حصہ دلا دیجیے"

"لیکن اگر تم پہلے کی طرح ہی رہتی رہو تو کیا حرج ہے؟"

"جی وہ مجھے ایک گھڑی بھی نہیں رہنے دیں گے۔"
کچھ سوچ کر پنڈت جی پھر بولے: "اچھا تم جاکر اُوپر والی بیٹھک میں بیٹھو۔ میں ابھی اُن کو بُلاتا ہوں۔"
گوردیئی سر نیچا کیے اوپر چلی گئی۔ اور پنڈت جی رام نامی گمچھا کندھے پر ڈال کھڑاؤں پہن کر باہر نکل گئے۔

(۵)

تھوڑی دیر بعد لالہ کرم چند کی ڈیوڑھی میں پنچایت کے پنچوں کی ایک سبھا ہو رہی تھی جس کے کرتا دھرتا پنڈت جی مہاراج ہی تھے۔
چودھری صاحب دیتا مل نے حُقّے کی نے گھُما کر ایک کش لے کر کھانستے ہوئے کہا "ہاں بھائی کرم چند۔ کیا بنا پھر اُس معاملے کا؟"
کرم چند پگڑی کے اُوپر سے سر کھُجلاتا ہوا بولا: "چودھری جی! سارا معاملہ تو آپ کے سامنے ہی ہوا تھا۔ آج پنڈت جی لائے ہیں نئی خبر۔ سو یہ بھی سن لیجیے۔"
اِتنے میں پنڈت جی ڈکارے کر ہری او...م کا لمبا سُر نکالتے ہوئے بولے: "چودھری جی کیا بتائیں؟ بات کوئی بتانے والی رہ گئی ہے؟ اب تو قیامت آ گئی ہے۔ ہم تو دونوں وقت ہاتھ جوڑتے ہیں کہ اتنی عمر آرام سے دھرم کا پالن کرتے گزر گئی۔ ایشور۔ پرماتما اس طرح کی شیطانیت دِکھانے سے پہلے ہی اِس زمین سے اُٹھا لیتا تو اچھا تھا۔ لیکن پتہ نہیں۔ ابھی قسمت میں کیا کیا لکھا ہے (ڈکارے کر) ہری او...م۔"
سارے آدمی اِس نئی خبر کو سننے کے لیے بے چین ہو اُٹھے۔ اور "ہاں مہاراج۔ بتایئے بتایئے" کا شور مچ گیا۔
پنڈت جی غصے میں آکر بولے: "ارے بھائی بتائیں کیا ہم۔ یہ سب تم لوگوں کی پست فِطرت کا نتیجہ ہے۔ ایمان دھرم سے دن بدن پیچھے ہٹتے جانا۔ پوجا پاٹھ۔ اشنان دھیان سے من کو ہٹا کر بُرے کاموں میں پھنسے رہنا۔ پھر بھلا زمین پر یہ اتیاچار نہ ہو تو اور کیا ہو؟ شو شو شو۔ (تھوڑی دیر خاموش رہ کر۔ پھر کرم چند سے مخاطب ہو کر) ارے بھائی شریف آدمی۔ ہم نے ایک بار نہیں، ہزار بار تجھ سے بکواس کی کہ بھئی تو اُس کمینی کو سر پر نہ چڑھائے جا اور اس کا کوئی انتظام کر۔ آخر دہی کچھ ہو کے رہا، جس کی اُمید تھی۔ وہ بدکردار جابسی ہے مسلمانوں کے گھر۔ ایشور گواہ ہے، جس وقت سے بات سنی ہے میرا تو جیسے خون کھولے

جا رہا ہے۔ ہماری زندگی میں ہی نگری میں انرتھ ہونے لگے تو پھٹکار ہے ہمارے جینے پر۔ (ڈکارے کر) ہری اوم"
سماج کے لیے پنڈت جی کی ایسی فراخ دلی اور محبت کے جذبے کو دیکھ کر سب ایک آواز ہو کر پکار اٹھے "دھنیہ ہو۔ دھنیہ ہو"

پھر پنڈت جی کرم چند اور سوہن لعل کی طرف دیکھ کر بولے "آج کل کے لڑکوں کی تو بالکل ہی عقل ماری گئی ہے۔ کوئی بات ہو، بس من مانی ہی کریں گے۔ بھڑوو! اگر تم پہلے سے پوچھ لیتے تو یہ برہمن کوئی تمہارا دشمن تو نہیں تھا؟ تمہارے بزرگوں کے ہی ٹکڑے کھا کر پلا ہے۔ اگر کوئی اچھی رائے نہ دیتا، تو بری بھی تو دینے والا نہیں تھا۔ لیکن اچھا بھئی — ہمیں کیا سروکار ان جھگڑوں سے۔ موج لو۔ جو جی میں آئے کرو۔ ہم کیوں بیچ میں ٹانگ اڑائیں" یہ کہتے کہتے پنڈت جی گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھنے کے لیے تیار ہو گئے۔

یہ دیکھ کر سب کو فکر لاحق ہو گئی اور وہ "نا مہاراج۔ بیٹھیے مہاراج۔ آپ بات تو سنیے۔ غصے کیوں ہو گئے" وغیرہ کہہ کر پنڈت جی کو گھیر لیا۔ کسی نے ان کے پاؤں پر سر رکھ دیا۔ کسی نے ان کے ہاتھ کی چھتری پکڑ لی اور کوئی راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

لاچار ہو کر پنڈت جی کو بیٹھنا ہی پڑا۔ اتنے میں کرم چند گلے میں پلو ڈال کر ان کے چرنوں میں گر پڑا اور گڑگڑا کر کہنے لگا۔

"مہاراج! ہماری عزت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اس بات کا فیصلہ کر کے ضرور جائیے۔ نہیں تو برادری ہمیں ٹکنے نہیں دے گی"

پاس سے ایک دوسرا بولا "ہاں مہاراج! اس بے چارے کی بڑی بدنامی ہو رہی ہے"

ان میں منشی دیوی دیال کا لڑکا موہن لعل بھی بیٹھا ہوا تھا۔ کچھ ہی دن پہلے ڈی۔اے۔وی۔ کالج چھوڑ کر گھر آیا تھا — وہ بولا "پنڈت جی! سچ مچ — یہ نیکی کا کام ہے۔ آپ جیسے مہاپرشوں کی نیک کوششوں سے ہی اس طرح کے سوال سلجھ سکتے ہیں۔ اب بھی آپ کوشش کریں تو وہ واپس آسکتی ہے"

"کیا کہا ہے؟ واپس آسکتی ہے؟" کہہ کر اور پنچوں کی طرف دیکھ کر پنڈت جی بولے "دیکھی تم لوگوں نے اس بے وقوف کی عقل" اور پھر اس کی طرف دیکھ کر بولے "آریوں نے تجھے یہی تعلیم دی ہے؟ بابا — جتنا منہ ہو — اتنی ہی بات کرنی چاہیے۔ بڑوں کی باتوں میں بھلا تیرا کیا کام ہے دخل دینے کا۔ وہ جو کہتے ہیں: بیگانی بارات میں مور کھ ناچے"

اس پر سب کے سب موہن لعل کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے اس کی عقل کو برا بھلا کہنے لگے۔ لیکن موہن لعل سے پھر بھی رہا نہ گیا اور بولا "معاف کیجیے گا پنڈت جی! میں نے کوئی بری بات تو نہیں

کہی تھی۔ اگر اُسے دوبارہ برادری میں بلالیا جائے تو اِس میں حرج کیا ہے۔ اور پھر بے چاری بال بیوہ ہے۔ اگر لالہ کرم چند اُس کے پالن پوشن کا اِنتظام نہیں کر سکتے تو کسی مناسب بر......"

اس بار پنڈت جی کا غیظ و غضب چوگنا ہوگیا۔ اور وہ غصے سے اُس کی بات کاٹ کر بولے "بس بس۔ اِس طرح کی ملیچھ بھاشا دوبارہ مُنہ سے نہ نکالنا۔ بھلا صابن لگا کر دھونے سے گدھا بھی کبھی گائے بن سکتا ہے؟ ہندو دھرم میں بیوہ کے بیاہ کا ذِکر چھیڑ کر اس مقدس مذہب کی توہین کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ (ماتھے پر ہاتھ مار کر) یارو اندھیر ہوگیا۔ اِن آریوں اکالیوں نے تو بھارت کا بیڑا ہی غرق کر دیا ہے (ڈکار لیتے ہوئے) ہری اوم....م"

موہن لعل پھر بولا "تو پھر مہاراج۔ آپ کے فرمانے کے مطابق اگر گدھا گائے نہیں بن سکتا تو گائے کیسے گدھا بن سکتی ہے؟"

اِس بار بہت سے آدمی بگڑ کر موہن لعل کے پیچھے پڑ گئے اور اس کو خاموش کر کے ہی چھوڑا۔ لالہ کنھیا لال بولا "لڑکے بس کر۔ زیادہ نہ بڑھ۔ ایک شریف آدمی کی بیوہ کے بارے میں یہ کہتے ہوئے تجھے شرم آنی چاہیئے تھی۔ اور پھر تو تو اتنا لکھا پڑھا ہے۔ یہ نہیں سوچ سکتا کہ ہمارے دھرم شاستروں کا کیا حکم ہے؟ (پنڈت جی سے) ہاں۔ ہاں۔ پنڈت جی۔ آپ اپنا کام کیے جایئے۔ لڑکا ہے۔ اس کی بات پر غصہ نہیں کرنا چاہیئے ہاں پھر بتایئے۔ اب اُس کا کیا بندوبست کیا جائے؟"

کرم چند بولا "پنچو! میری ایک عرض ہے۔ اگر وہ عزت سے بیوگی کاٹنی چاہتی تو میرے گھر میں کس بات کی کمی تھی۔ لیکن میں تو کافی مدت تک اس کی کرتوتیں دیکھتا رہا اور نظر انداز کرتا رہا۔ دل میں سوچا۔ ہمارا کیا لیتی ہے۔ جیسا کریگی ویسا بھرے گی۔ لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے "اُتار دی لوئی تو کیا کرے گا کوئی"۔ وہ تو ہمارے اگلے پچھلوں کی عزت چھاج میں ڈال کر چھاننے پر اُتر آئی۔ مجھ سے کیا پوچھتے ہیں آپ؟ پیٹ پھاڑوں تو پٹی کہاں باندھوں۔ یہ باتیں کوئی بتانے والی ہیں؟ پھر بھی صبر کا گھونٹ پیے رہا۔ اب بتایئے میں اور کیا کرتا۔ رسّوں سے باندھ کر تو میں اسے رکھنے سے رہا۔ آخر آپ جانتے ہی ہیں کہ کس طرح اپنا مُنہ کالا کر کے چلی گئی"۔

چاروں طرف سے آوازیں آنی شروع ہوئیں "ٹھیک ہے۔ اس بیچارے کے لیے وہ کوئی غیر تھوڑے ہی تھی۔ اتنا پیار تو پیٹ سے پیدا ہونے والی اولاد بھی نہیں کرتی۔ اُس کی اپنی قسمت خراب تھی۔ پھر کسی کا کیا قصور؟"

پنڈت جی سوچ کر بولے "لیکن اب کیا ہو؟"

بابا رادھا سنگھ ماتھے پر سے پگڑی کو پیچھے ہٹاتے ہوئے بولا "ہونا کیا ہے جو دھرم سے گیا۔ بستی

رہ گیا۔ جو بھرے گھر سے خالی چلا گیا، اُس قسمت کے مارے کے لیے کیا ہو سکتا ہے۔ جہاں پڑی ہے وہیں رہنے دیجیے۔ اپنے کرموں کا پھل خود بھگتے گی۔"

سب نے ایک زبان ہو کر تائید کی "ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے باباجی نے لاکھ روپے کی بات کی ہے۔"

پنڈت جی بولے "خیال تو میرا بھی یہی ہے کہ رنڈی کو وہیں رہنے دیا جائے اور پھر اس کے بغیر اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ کیوں بھئی کرم چندا — تیری کیا مرضی ہے؟ (ڈکار لے کر) ہری او...م۔"

کرم چند اُمید بھری آواز میں ہاتھ جوڑ کر بولا "مہاراج! جو آپ کی صلاح وہ میری مرضی۔ آپ عقلمند ہیں۔ اس گھر میں اب وہ کبھی قدم نہیں رکھ سکتی۔ اور پھر مہاراج — دل اور پھول ٹوٹ جائیں تو جوڑنا ناممکن ہوتا ہے۔"

اس پر سب نے رضامندی ظاہر کی۔ پنڈت جی کی فراخ دلی اور کرم چند کی عقل کی تعریف کرتے ہوئے آہستہ آہستہ سب اُٹھ کر چلے گئے۔ پنڈت جی بھی ہری اوم کہہ کر سب کے بعد میں اُٹھے۔ جانے سے پہلے کرم چند نے جلدی سے اُن کی مٹھی میں کچھ چاندی کے سکّے پکڑاتے ہوئے کہا "مہاراج ہم پر کرم کی نظر رکھیے گا۔"

پنڈت جی بھری ہوئی مٹھی سے جیب ٹٹولتے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے اُس کا کندھا پکڑ کر "رہنے دو۔ رہنے دو" کہہ کر بولے "ہاں سچ — میں نے جو بات کہی تھی ..."

"ہاں جی — میں اُسی وقت خواجہ صاحب کے ہاں گیا تھا۔ پہلے تو مانتے نہیں تھے لیکن آپ کی سفارش سُن کر مان گئے۔"

"خیر اچھا ہو گیا۔ اور کتنا کچھ؟"

"پچاس نقد دے آیا ہوں۔ اور پچاس جب معاملہ رفع دفع ہو جائے گا تب دینے کا اقرار کیا ہے۔"

"خیر کام سستا ہی رہا۔"

"جی ہاں — آپ کی مہربانی کا نتیجہ ہے — نہیں تو ... "

اس کے بعد آشیرواد دے کر پنڈت جی ڈنگوری کھڑکھڑاتے ہوئے آہستہ آہستہ گھر کی طرف چل دیے۔ گھر پہنچنے سے پہلے وہ کس کس کے گھر گئے اور کیا صلاح مشورے کیے۔ خدا ہی جانے۔

(۶)

گوردیئی فکر کے سمندر میں غوطے کھا رہی تھی کہ پنڈت جی اُس کو اندر آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد بولے "بیٹی تیری خاطر آج سارے شہر میں پھرا ہوں۔ پنچایت اِکٹھی کی۔ جس کا مُنہ بھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اُس کے بھی پاؤں چھوئے۔ لیکن اِن لوگوں کی عقل پر پتہ نہیں ایشور نے کیسا پردہ ڈال دیا ہے کہ کسی طرح راستے پر نہیں آتے (ڈکارتے کر) ہری او... م "

گوردیئی نے احترام سے ماتھا ٹیکتے ہوئے کہا "مہاراج میری جیسی دُکھیا کے لیے آپ تکلیف نہ کریں تو اور کون کرے "

"بیٹی۔ لیکن میرا مقصد پُورا ہوتا نظر نہیں آتا"

"کیوں مہاراج "

"کرم چند تو مانتا ہی نہیں۔ وہ کہتا ہے ہمیں لکھ کر دے گئی ہے۔ ہمارا کیا بگاڑ سکتی ہے "

گوردیئی مایوسی سے ٹھنڈی سانس لے کر بولی "اور برادری نے کیا کہا ؟"

"بیٹی برادری کے ہاتھ میں کیا رکھا ہے۔ وہ کسی کو زبردستی منا سکتی ہے بھلا! کوئی سرکاری عدالت ہے نہیں کہ جو چاہے کروائے "

"پھر اب میں کیا کروں ؟"

کچھ دیر سوچ کر پنڈت جی بولے "کیا بتاؤں بیٹی معاملہ بہت مشکل ہے۔ مُقدمہ چلایا جائے تو بھی کچھ بنتا نظر نہیں آتا کیونکہ اِس کے لیے پیسے کی ضرورت ہے "

"قریباً کتنے خرچ کی ؟"

"کم از کم دو تین سو تو ہونا ہی چاہیئے "

اپنے ہاتھ والے بازو بند کو دیکھ کر گوردیئی بولی۔

"یہ کتنی قیمت کا ہوگا بھلا ؟"

پنڈت جی للچائی نظر سے بازو بند کو دیکھتے ہوئے بولے "ہوگا دو ڈیڑھ سو کا "

گوردیئی نا اُمید ہو گئی۔

پنڈت جی اُسے ہمت دلاتے ہوئے بولے "بیٹا تو فکر نہ کر۔ جو کچھ کم ہوگا میں اپنے پاس

سے بلا کر تیرا کام کرنے کو تیار ہوں "

گوردیئی نے ہاتھ سے بازو بند اُتار کر پنڈت جی کے پاؤں میں رکھ دیا اور پھر ماتھا ٹیکتی ہوئی بولی "جی۔ میں تو آپ کے سہارے ہی ہوں۔ آپ ہی میری ناؤ پار لگائیں گے، تو لگے گی "

اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پنڈت جی بولے "بیٹا۔ بھگوان تیرا کارج سِدھ کرے گا۔ مَیں آج سے اِس مقدمے کا بوجھ اپنے سر پر لیتا ہوں۔ اور تجھے اُمید دلاتا ہوں کہ ایشور کی کرپا سے بہت جلد کامیابی ہوگی (ڈکار مار کر) ہری او...م۔ لیکن اگر تم یہیں رہیں تو کام بگڑ جانے کا خطرہ ہے "

" لیکن میں کہاں جاؤں ؟ اگر کہیں تو میکے چلی جاؤں۔ لیکن وہاں بھی کوئی میرا نہیں ہے۔ ہاں رہنے کا مکان ضرور ہے "

" نہیں بیٹی۔ تو کوئی فکر نہ کر۔ سیالکوٹ میں میرا ایک دوست ہے تو چاہے تو میں تجھے اُس کے پاس بھیج دوں "

" مہاراج! میں تو آپ کے بھروسے ہوں۔ جیسا فرمائیں گے، ویسا ہی کروں گی "

پنڈت جی نے بازو بند اُٹھا کر جیب میں ڈالتے ہوئے اُسے یقین دلانے کے لیے کہا "پُتری۔ مَیں ابھی اِس کا بندوبست کرتا ہوں۔ تو روٹی کھا کر آرام کر اور کسی قِسم کی فکر نہ کر "

" مہاراج آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کاہے کی فکر۔ آپ تو میرے لیے لوہے کا ستون پھاڑ کر بھگوان کی طرح ظاہر ہوئے ہیں۔ آپ کی نیکی کا بدلہ کیسے چکاؤں گی "

" ہری او...م " کہتے ہوئے پنڈت جی نیچے چلے گئے۔ کچھ دیر بعد گوردیئی کے لیے لڑکا روٹی لے کر آیا۔ وہ تھوڑی بہت کھا کر وہیں ایک چارپائی پر لیٹ گئی۔

کافی دیر تک اُسے فکر کی وجہ سے نیند ہی نہ آئی۔ جب ذرا اُس کی آنکھ لگنے لگی تو نیچے سے کسی کے اُوپر آنے کی آواز سُن کر وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اِتنے میں پنڈت جی اپنے ساتھ ایک اونچے لمبے نوجوان کو ساتھ لے کر اندر داخل ہوئے اور بولے "بیٹا۔ میری صلاح ہے کہ آج ہی (نوجوان کی طرف دیکھ کر) میرے اِس دوست کے ساتھ سیالکوٹ چلی جا۔ وہاں تیری رہائش کا پُورا پُورا انتظام کر دیا جائے گا۔ تجھے کسی قِسم کی تکلیف نہیں ہوگی "

گوردیئی شکر گزار آنکھوں سے پنڈت جی کی طرف دیکھتی ہوئی بولی "آپ کی مہربانی میں کبھی نہیں بھول سکتی" اور وہ چلنے کے لیے تیار ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ اُس آدمی کے ساتھ ریل گاڑی کا سفر کر رہی تھی۔

(۷)

گوردیئی سالکوٹ پہنچ گئی اور تھوڑے دنوں بعد ہی اس ناٹک کا ایک نیا منظر اُس کے سامنے آیا۔ اصل بات اُس سے زیادہ دِن چھپی نہ رہ سکی۔ جس پنڈت کو وہ بڑا دھرماتما بلکہ پرماتما کا اوتار سمجھ کر دل میں پوج رہی تھی وہ اصل میں ایک زہریلا سانپ تھا۔ اُس نے گوردیئی کا زیور ہضم کرنے کے علاوہ اسے تاراچند نام کے ایک نوجوان کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ جو آدمی اسے چھوڑنے آیا تھا وہ اصل میں پنڈت جی کا ایک راز دار دلال تھا۔ بد قسمت عورت ماتھا پیٹ کر رہ گئی۔ اب کیا کر سکتی تھی۔ اِس وقت تاراچند نے جو جو سبز باغ دکھائے ان کے لالچ نے اس کو اپنی منزل سے اور زیادہ دور لے جا کر پھینک دیا اور بدنصیب گوردیئی نے اُس کے جال میں پھنس کر اپنا سب کچھ اس کے قدموں میں نچھاور کر دیا۔

تاراچند تھوڑا بہت پڑھا لکھا تھا اور ایک سرکاری دفتر میں تیس روپے مہینے کا کلرک تھا۔ گوردیئی کو اُس نے بتایا کہ اُس کا اصل گھر گجراں والہ میں ہے۔ لیکن اپنے باپ کی ناراضگی کی وجہ سے ابھی وہ گھر نہیں جا سکتا۔ ویسے اُس کی لاکھوں روپے کی جائیداد ہے۔ لیکن جھوٹ زیادہ دیر تک چھپا نہیں رہ سکا۔

کچھ مہینے بعد ہی تاراچند کا یہ پول بھی کھُل گیا، جب اُس کی ماں کی طرف سے ایک دن چھٹی آئی۔ وہ خود گھر میں نہیں تھا اور گوردیئی نے کسی سے چھٹی پڑھوائی تھی۔ اُس میں اُس کی ماں نے لکھا تھا:۔

"میں محنت مزدوری کر کے پیٹ بھرتی ہوں اور تم نے جب سے گئے ہو مجھے ایک پیسہ نہیں بھیجا۔ میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ تم کسی کی عورت نکال کر لے آئے ہو۔ یہ باتیں تمہارے لیے اچھی نہیں ... وغیرہ وغیرہ۔"

گوردیئی اب بے بس تھی۔ اُس کے لیے نہ سسرال میں جگہ تھی نہ میکے میں۔ اِس کے علاوہ وہ مورکھ اور ناسمجھ تھی۔ ہر ایک کی باتوں میں آجاتی تھی۔

آخر اُس نے اسی حالت میں ہی پڑے رہنا اپنے لیے غنیمت سمجھا۔ اور کچھ نہیں تو باسی، روکھی روٹی کا ٹکڑا تو مل ہی جائے گا۔ لیکن اسے پتہ نہیں تھا کہ سائے کی طرح بد قسمتی اب بھی اس کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔

قسمت کی مار۔ سرکاری دفتروں میں نوکروں کی چھٹنی ہوئی اور تاراچند بھی سوکھی ٹہنی کی طرح کاٹ کر پھینک دیا گیا۔ ادھر گوردیئی بیمار ہو کر چارپائی پر پڑ گئی۔

وُہی تاراچند جو کچھ دن پہلے گوردیئی کے پریم میں دیوانہ ہو گیا تھا۔ پون برس میں ہی گوردیئی سے اس قدر تنگ آ گیا کہ گوردیئی اُسے پھوٹی آنکھ بھی نہیں بھاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اُسے دوا دارو دینے سے

بھی کترانے لگا۔ وہ حد درجے کا عیبی، ضدی اور شیطان کا چیلا تھا۔ کوئی دن ہی ایسا ہوتا جس دن اِن کے گھر میں ہاتھا پائی اور دھینگا مشتی کا ناٹک نہ کھیلا جاتا ہو۔

گوردیئی اب تقریباً مر ہی چکی تھی۔ ایک تو سارے جہاں کی بدنامی، دوسرے ضدی اور من مانی کرنے والے مردے واسطہ۔ تیسرے غریبی اور چوتھے سب سے بڑی بات تھی یہ کہ گوردیئی کی بدنصیبی اب اسے اور بھیانک شکل میں دکھائی دے رہی تھی اور یہ بھیانک شکل دِن بدن اور بھی مکروہ ہوتی جارہی تھی۔ آہ جس چیز کا حال ہی اس کے لیے اِس قدر ڈراؤنا تھا اس کا مستقبل کیسا ہوگا؟ — یہ سوچ کر وہ سر سے پاؤں تک کانپ جاتی تھی۔ وہ صاف دیکھ رہی تھی کہ اِس منحوس مردے بڑی توکیا کسی چھوٹی چیز کی بھی اُمید نہیں کی جاسکتی۔ پھر موت سے آگے موت کھڑی کے مصداق وہ اب اِس گناہ کی گٹھڑی کو لے کر کہاں جائے گی۔ زندگی کے باقی دن کہاں اور کس طرح گزارے گی؟ اِس کا جواب اُس کے اندھیرے میں بھٹکتے ہوئے دل کے پاس "کچھ نہیں" کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا!

آخر وہ دن نزدیک آپہنچا۔ جس کا ہر وقت اُسے خطرہ لگا رہتا تھا۔ اُوپر سے بخار بھی ایسا کہ آنکھ جھپکنے کا بھی ہوش نہیں تھا۔ اِسی حال میں اُسے کافی عرصہ بیت گیا۔ لیکن بخار نہ ٹوٹا۔

ایک دن آدھی رات کے وقت وہ اکیلی ایڑیاں رگڑ رہی تھی کیونکہ وہاں تو پانی کا گھونٹ دینے والا بھی اُس کے پاس کوئی نہیں تھا۔ تارا چند پرسوں سے گھر ہی نہیں آیا تھا اور اُس کے لوٹنے کی اُمید بھی نہیں تھی۔ کیونکہ پرسوں جاتا ہوا وہ کہہ گیا تھا "میری اب اُمید نہ رکھنا۔ میری طرف سے جہنّم میں جا۔ چاہے مرچاہے جی۔ میں نے کوئی ہسپتال نہیں کھول رکھا ہے، خود بھوکا مر رہا ہوں۔ تجھے کیسے سنبھالوں۔ کہیں دیس پردیس جاکر روٹی کما کھاؤں گا لیکن اِس عذاب سے تو چھوٹوں گا۔" اور اس پر بھی زیادتی یہ کہ گوردیئی کی بے ہوشی کا فائدہ اُٹھا کر وہ گھر کا سب مال اسباب بھی اُٹھا کرلے گیا تھا۔

بدقسمتی سے اس کا مکان بھی ایسی جگہ میں تھا، جس کے پاس پڑوس میں کسی ہندو کا مکان بھی نہیں تھا۔

پیاس کے مارے ادھ مری سی وہ کسی طرح گرتی پڑتی چارپائی سے اُتری اور پانی کے پاس پہنچی لیکن اس کی قسمت کی طرح گھڑا بھی خالی تھا۔ اِتفاق سے ایک گلاس میں تھوڑا سا میلا کچیلا پانی تھا۔ جس کو اُس نے کانپتے ہاتھوں سے اُٹھا کر منہ سے لگا لیا۔ کچھ گر گیا اور کچھ اس کے منہ میں چلا گیا۔ اِس وقت اس کی حالت اتنی خراب ہو چکی تھی کہ وہاں سے وہ اُٹھ نہ پائی اور وہیں پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔

خدا جانے اس حالت میں وہ کتنی دیر پڑی رہی۔

(۸)

آساڑھ کے مہینے کی دھوپ میں سارا دن بندر کا تماشہ دکھا دکھا کر، کچھ روٹیوں کے ٹکڑے اور تھوڑا سا آٹا ایک جھولے میں ڈالے روڈو قلندر اپنے ڈیرے کو لوٹا۔ ایک پھٹی ہوئی رضائی، دو مٹی کے پیالے، دو رکابیاں ایک آدھ جھولا۔ کچھ اور چھوٹا موٹا سامان، بس اُس کی یہی جائیداد تھی۔ ایک وہ خود اور ایک اُس کی بچھو بندریا۔ اور یہ اُس کا خاندان تھا۔ اُس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ ماں باپ تو اُس کے دودھ پینے کی عمر میں ہی طاعون سے مر گئے تھے۔ اور چونکہ اس کی صرف ایک آنکھ تھی، اسی لیے اس کی شادی بھی نہیں ہو سکی تھی۔

بابے روڈو کی عمر اِس وقت ساٹھ سے تجاوز کر چکی تھی لیکن اُسے بالکل پتہ نہیں تھا کہ دنیادی موہ محبت کیا چیز ہوتی ہے۔ جب کبھی وہ کسی سے سُنتا کہ فلاں فلاں سے بڑا پیار کرتا ہے تو وہ ایسی باتوں کو واہیات سمجھ کر کافی دیر تک ہنستا رہتا تھا۔ اس کو صرف اِتنا ہی پتہ تھا کہ آدمی پیدا ہوتا ہے اور مرجاتا ہے۔ بس۔ ہاں اس کا پرماتما پر اور اپنے گورو دیوتاؤں پر کامل یقین تھا۔ وہ ایک نیچی ذات کا اچھوت ہونے کے باوجود خود کو ہندو دھرم کا شردھالو سمجھتا تھا۔

روٹی اور آٹے والا جھولا اُس نے کندھے سے اُتار کر جھونپڑی میں ایک کھونٹی کے ساتھ لٹکا دیا بندریا کو باندھنے کھولنے کی تو اسے ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ وہ اِس کی جنم کی ساتھی تھی۔ روڈو کے ساتھ اُسے حد سے زیادہ محبت تھی۔ وہ خود ہی جا کر بڑ کی جڑوں میں سر چھپا کر لیٹ گئی۔ روڈو نے اُنگلی سے ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ بھیگی اور جا بجا پیوند لگی ہوئی واسکٹ اُتار کر لیٹ گیا۔

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سے جب اُس کے جسم کا پسینہ سوکھ گیا تو اس نے چھت سے لٹکتی ہوئی ٹنڈ (رہٹ سے پانی نکالنے والا مٹی کا برتن) میں سے پیالے میں پانی ڈالا۔ تھیلے میں سے گڑ نکال کر اس کو ایک پتھر سے باریک کوٹ کر شربت بنایا۔ آدھے سے زیادہ اس نے خود پیا اور جو باقی بچا اسے دوسرے برتن میں ڈال کر بندریا کے لیے رکھ کر اُس کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے ہی انتظار میں تھی۔ ایک چھلانگ لگا کر آئی اور پیالہ خالی کر کے واپس اپنی جگہ پر جا بیٹھی۔

چند لمحوں بعد کتوں کی ایک فوج پتہ نہیں کہاں سے آکر اکٹھی ہو گئی اور کوں کوں کرتی روڈو کے اِرد گرد چکر لگانے لگی۔ روڈو نے جھولا اٹھایا اور آٹے میں سے روٹیوں کے ٹکڑے چُن چُن کر کتوں کو ڈالنے لگا۔

جب صرف آٹا ہی باقی رہ گیا تو جھولا لٹکا کر وہ پھر لیٹ گیا۔

اُسے روٹی آج دیر سے پکانی تھی۔ لیٹتے ہی اُسے نیند آ گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کروٹ لی۔ ذرا سی آنکھ کھلی۔ لیکن پھر سو گیا۔ ایک منٹ بعد ہی وہ اُٹھا اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر ہاتھ کو ٹیڑھا کر کے کان سے لگا کر وہ کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ اُسے آواز کچھ اور صاف سنائی دی اور وہ بے تحاشہ اُٹھ کر اُس طرف چل دیا جدھر سے آواز آنے کا اسے شک ہوا تھا۔

اپنے مالک کو اِس طرح جاتے دیکھ کر بندریا بھی اس کے پیچھے ہولی۔ وہ چلتے چلتے ایک جھاڑی کے پاس رُک گیا۔ اسے آواز ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے کوئی نوزائیدہ بچہ رو رہا ہے! جھاڑی کے نیچے کی طرف جب اُس نے جھک کر دیکھا تو اسے کسی لال لال چیز کا دھوکا سا ہوا۔ وہ تھوڑا اور آگے بڑھا۔ وہ چیتھڑوں میں لپٹا ہوا ایک بچہ تھا، جو لگاتار "ہوائیں" "ہوائیں" کرتا ہوا رو رہا تھا۔

روڈو سے بچے کی یہ دُردشا دیکھی نہ گئی۔ اُس نے کچھ سوچا نہ سمجھا۔ ویسے ہی کپڑوں کے ساتھ بچے کو اُٹھا لیا۔ اور واپس آ کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ موسم چاہے گلابی تھا۔ لیکن شام کی ٹھنڈی ہوا ہی اس نازک بچے کے لیے کافی سرد تھی۔ وہ سردی کے مارے سُن ہوئے جا رہا تھا اور اس کے ہونٹ نیلے پڑ رہے تھے!

روڈو گھبرا گیا کہ اب کیا کرے۔ کہاں لے جائے اور بچے کو کس طرح بچائے؟ بندریا کو چھوٹے بچوں سے قدرتی ہی بڑا پیار ہوتا ہے۔ روڈو گھور گھور کر اُسے دور ہٹا رہا تھا اور وہ بار بار اس کے ہاتھوں سے بچے کو چھیننے کے لیے آتی تھی۔ اس نے جلدی سے گدڑی اکٹھی کی اور اس میں بچے کو چھپا لیا۔ پھر اُسے خیال آیا۔ یہ بلی کے بچے ایسی لڑکی پتہ نہیں کتنی دیر سے بھوکی ہوگی۔ اِس کے لیے دُودھ لانا چاہیے۔ یہ سوچ کر اس نے لڑکی کو وہیں لٹا دیا اور خود جلدی سے پیالہ لے کر گاؤں کی طرف بھاگ گیا۔ راستے میں جا کر اسے خیال آیا کہ وہ بچے کو تنہا بندریا جیسی شیطان جانور کے رحم پر چھوڑ آیا ہے۔ یہ بڑی غلطی ہو گئی۔ ساتھ ہی لے آتا تو کیا حرج تھا۔ کوئی کیا کہتا؟ کوئی اگر پوچھتا بھی تو کہہ دیتا کسی رشتے دار کی لڑکی ہے!

اُس کا دل چاہا بھی کہ فوراً لوٹ جائے۔ لیکن لڑکی کی بھوک کے خیال سے اُس کے پاؤں واپس نہ مڑ سکے۔ اس نے آنکھیں بند کر کے ہاتھ جوڑے اور شوجی اور پاربتی کا نام لیا اور پھر آگے کی طرف چل دیا۔

بے شک اس نے اپنی طرف سے حد سے زیادہ جلدی کی تھی تب بھی جانے آنے میں اس کو تقریباً آدھ گھنٹہ لگ ہی گیا۔ وہ جب دودھ لے کر جھونپڑی کی طرف جا رہا تھا تو اُس کا دل دھک دھک کر رہا تھا، اور وہ سوچ رہا تھا۔ "کہیں ایسا نہ ہو کہ پرماتما کی ایک جاندار چیز میری بے عقلی کی وجہ سے ضائع ہو جائے!"

ڈیرے پر آکر وہ ہکا بکا رہ گیا۔ بندریا اس بچے کو ماں کی طرح گود میں لیے بیٹھی تھی اور گدڑی ایک طرف رکھی تھی۔ لڑکی نے آنکھیں کھولی ہوئی تھیں اور اب وہ رو نہیں رہی تھی۔ بندریا نے اپنے جسم کی گرمی سے ہی اس کی سردی دُور کر دی تھی۔ مالک کو دیکھ کر اس نے لڑکی کو پھر گدڑی پر لٹا دیا اور خود ڈر سے سہم کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ روڈو نے گدڑی میں سے روئی کا ٹکڑا نکالا اور اس کو دودھ میں بھگو بھگو کر لڑکی کو پلانے لگا۔ دودھ کے پینے کی دیر تھی کہ لڑکی سو گئی۔ روڈو نے سکھ کی سانس لی۔

رات کو اس نے ہمیشہ کی طرح پتھروں کو جوڑ کر بنائے ہوئے چولھے پر تین روٹیاں پکا کر دو خود کھائیں اور ایک بندریا کو کھلائی۔ آج روڈو کو ڈھول مٹی میں سونا پڑا۔ گدڑی اس نے دوہری کر کے آدھی لڑکی کے نیچے بچھا دی تھی اور آدھی اسے اوپر سے اوڑھا دی تھی اور وہ بچی کو اپنے سینے سے چمٹا کر سو گیا۔

آدھی رات کو جب اس نے کروٹ بدلی تو اُسے لڑکی کا خیال آیا۔ وہ ڈر کر اچانک اُٹھ بیٹھا اور لڑکی کو دیکھنے کے لیے اُس نے گدڑی کا اُوپر کا حصہ اُٹھایا لیکن لڑکی وہاں نہیں تھی۔ وہ گھبرا گیا۔ تبھی اُس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ لڑکی سچ مچ جنگلی جانور کے قبضے میں تھی۔ لچھو اس کو رانوں پر بٹھائے رات والا دودھ روئی کے ٹکڑے سے اس کی ہی طرح پلا رہی تھی۔

پرماتما کی قدرت کا یہ انوکھا چمتکار دیکھ کر روڈو کو ہنسی آگئی۔ وہ سوچنے لگا۔ مالک کتنا عظیم ہے۔ لڑکی کو انسانی ماں سے چھین کر جنگلی ماں کے حوالے کر دیا ہے۔

موہ مایا کی یہ پہلی کرن تھی جو روڈو کے اندھیرے اور ٹھنڈے دل پر پڑی اور جس کی معمولی سی حرارت اور دھندلی سی روشنی کو اس نے آج پہلی بار دیکھا اور محسوس کیا۔

وقت گزرتا گیا۔ جو روڈو روز سورج سے شرط لگا کر سوتا تھا اب ہر ایک لمحے کے بعد اُس کی نیند کھل جاتی اور جب کبھی رات کو جاگ کر سُندری ضد پکڑ لیتی تو وہ گھنٹوں اُس کو کندھے سے لگا کر ٹہلتا اور اِس طرح لوریاں دیتا رہتا تھا:۔

"صدقے صدقے صد مائیاں
چننے دیاں بوٹیاں رب لائیاں"

یہ ہی لوریاں تھیں جن کو سُن کر وہ کبھی لوگوں کا مذاق اُڑایا کرتا تھا لیکن اب انھیں گنگنانے میں کتنا مزہ آتا تھا۔!

"رب رکھے تو مارے کون"۔ جس معصوم بچی کو کوئی جان بُوجھ کر موت کے جبڑوں کے نیچے دے گیا تھا۔ اُس نے یہ دُنیا دیکھنی تھی۔ اِس لیے بچ گئی۔ اِس کے علاوہ روڈو جیسے پتھر دل میں محبت کا چراغ جلانے

کا کام سونپ کر جب پرماتما نے اُسے دُنیا میں بھیجا تھا تو وہ اپنی کارگزاری دِکھائے بغیر کیسے چلی جاتی۔

لڑکی کے نقوش حد درجے کے خوبصورت اور اعضا سڈول تھے۔ اُس کی نیلی آنکھیں، گورا رنگ اور سُنہری ریشم جیسے بال قدرت کے ہاتھ کی انوکھی کاریگری کا نمونہ تھے اور شاید اُس کی خوبصورتی کو دیکھ کر ہی روڈو نے اُس کا نام سُندری رکھ دیا تھا!

بوڑھے روڈو کے دِل میں مچلتے ہوئے مدتوں پرانے سوال کا جواب خود ہی مل رہا تھا۔ وہ کبھی کبھی یہ سوچ کر لوگوں کا مذاق اڑایا کرتا تھا "ارے بیٹی بیٹوں کے لیے سارے جہاں کے فکر سر پر لاد لینا بھی کوئی عقلمندی ہے؟ ایسے ہی لوگ وہم کے مارے محبت محبت چلاتے پھرتے ہیں۔ بھلا محبت بھی کوئی چیز ہے؟ وہ بوڑھا قلندر جو دو پیٹوں کے لیے آٹا مانگ تانگ کر پیڑوں کے ٹھنڈے سائے میں ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر سو جاتا تھا۔ اب صبح سویرے گھر سے نکلتا اور سونے کے وقت واپس لوٹتا تھا۔

اب اُسے آٹے کے علاوہ پیسوں کی بھی ضرورت تھی۔ جو روٹیوں کے ٹکڑے وہ پہلے کتوں کو ڈال دیتا تھا اب وہ گوالوں کے ہاں اُن کے جانور کھاتے تھے۔"

جلد ہی روڈو نے کچھ پیسے جوڑ لیے، جن کو خرچ کر کے اُس نے سب سے پہلے سندری کے لیے ایک چھوٹی سی ہنگوڑھی، کچھ کپڑے اور چھوٹے موٹے دو چار کھلونے خریدے۔ پہلے اُسے کسی سے جو کچھ ملتا تھا لے کر چین سکھ سے بیٹھ جاتا تھا۔ لیکن اب "مائی بچے کے لیے کوئی پھٹا پرانا کپڑا۔ بابا چھوٹی بچی کے دودھ کے لیے پیسہ" پکار پکار کر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا پھرتا تھا۔

روڈو کی محبت تو سُندری کے ساتھ تھی ہی لیکن ایک حیوان کی اس سے بھی زیادہ تھی۔ لچھو بندریا ایک لمحے کے لیے بھی سُندری کو آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی تھی۔

پہلے پہل تو روڈو نے سندری کو اپنی جان کے لیے وبال ہی سمجھا تھا لیکن اب سندری میں اس کی جان تھی۔ وہ جب مانگنے جاتا تو سندری کو ساتھ ہی لے جاتا تھا۔ پہلے اس کے پاس ایک بندریا تھی۔ اب دو ہو گئیں۔ بچے پر ترس کھا کر لوگ اسے کچھ نہ کچھ دے دیتے تھے۔ اور پھر روڈو کا رونی صورت بنا بنا کر کہنا "بابا اِس کے پیدا ہوتے ہی ماں مر گئی تھی۔ بے ماں کی بچی پر ترس کھاؤ۔" لوگوں کے دلوں کو اور بھی نرم کر دیتا تھا۔

سندری اب دو برس کی تھی۔ قلندر کی اندھیری جھونپڑی میں قدرت نے روشنی بھیج دی تھی۔ روڈو اسے دیکھتے دیکھتے نہیں تھکتا تھا۔ بندریا ماں کی وجہ سے سندری کی عادتیں بھی بندروں جیسی ہی چنچل تھیں۔ وہ لچھو کی طرح ہی اُلٹی سیدھی چھلانگیں لگاتی، کبھی دونوں ہاتھوں کو زمین پر ٹکا کر اور ٹانگیں اونچی کر کے کھڑی

ہو جاتی۔ کبھی جھونپڑی کے بیچ کے ستون پر پاؤں جما کر چڑھنے کی کوشش کرتی۔ مطلب یہ کہ سندری جس طرح بندریا کو کرتے دیکھتی تھی ویسے ہی خود کرنے لگ جاتی تھی۔

روڈو جب غریبوں کے بچوں کے ساتھ سُندری کو کھیلتے دیکھتا اور پھر یہ دیکھتا کہ سارے بچے اُس کی سُندری کے ساتھ پیار کرتے ہیں تو وہ خوشی کے مارے جیسے پھول جاتا تھا۔ خوبصورتی کے ساتھ ہی قدرت نے سندری کو عقل بھی بڑی تیز عطا کی تھی۔ وہ جو کچھ دیکھتی فوراً ہی اسے سیکھ لیتی تھی اور جیسا سنتی اُسی طرح بولنے لگتی تھی۔ اس کی پرورش سے اب روڈو کو فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔

روڈو جب بھی گھر آتا۔ سندری کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لے کر آتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ روڈو کو بھی جیسے اس کام کا نشہ سا ہو گیا تھا۔ وہ جب کبھی کوئی چیز لے کر گھر آ رہا ہوتا تو اس کے قدموں میں بجلی کی سی تیزی آ جاتی اور دل میں کوئی انوکھی سی اُمنگ ٹھاٹھیں مار رہی ہوتی تھی۔ سندری کو کھلا کر اُسے اتنی خوشی نہیں ہوتی تھی جتنی خوشی اُسے اُس وقت ہوتی تھی جب وہ گھر کے نزدیک پہنچتا تھا اور سندری دور سے ہی اُسے دیکھ کر اُس کی طرف بھاگی آتی اور اُس کی ٹانگوں سے چمٹ کر اُس کی چادر کے کونے ٹٹولتی اور اُچھلتی کودتی ہوئی "بابا میری چیز دے" کہہ کر طوفان برپا کر دیتی تھی۔ جس وقت پلو کھول کر وہ مٹھائی کا دونا اُس کے ہاتھوں پر رکھتا اور وہ بے صبر ہو کر کودتی ناچتی ہوئی دوسری لڑکیوں کو دکھانے کے لیے بھاگ جاتی تو روڈو پر ایک طرح کا نشہ سا طاری ہو جاتا تھا۔ وہ خوشی میں آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔ اُس کا وقت ایسے سُکھ اور آرام سے کٹتا، جیسا شاید راجاؤں مہاراجاؤں کو بھی کم ہی نصیب ہوا ہوگا۔

سندری جب بچوں کے ساتھ کھیلتی تھی تو اُن کی ماؤں کو بھی کئی بار دیکھتی تھی۔ کوئی دو بچے لڑ پڑتے تو اپنی ماں کو آوازیں دے کر کہتے تھے "بے بے دیکھ مارتا ہے۔ بے بے میری چیز نہیں دیتا" وغیرہ۔

سندری کے لیے یہ "بے بے" کا لفظ کچھ بھی معنی نہیں رکھتا تھا۔ اس کے لیے سارا سنسار بابا روڈو تھا۔ یا پھر بچھو بندریا۔ لیکن کبھی کبھی جب وہ ماؤں کو اپنے بچوں کے ساتھ پیار کرتے دیکھتی تب جیسے کسی کے پاس کوئی کھلونا دیکھ کر ویسا ہی کھلونا لینے کو دل چاہتا ہے اُسی طرح یہ "بے بے" لینے کے لیے بھی اُس کا دل مچل اُٹھتا تھا۔

ایک دن رات کو چاندنی چاندنی نکھری ہوئی تھی۔ بوڑھا روڈو جھونپڑی سے باہر ایک ٹاٹ پر لیٹا، سندری کو گھٹنوں پر بٹھا کر جھولا جھلا رہا تھا۔

جب ہی وہ "ہوئے ماتیاں۔ سونے کی گاڑی چڑھ آئیاں" کی رٹ لگا کر ہٹتا تھا تو سندری کہتی "بابا پھر کر" بار بار اس طرح کرنے سے جب روڈو کی ٹانگیں تھک گئیں تو ہار کر وہ کہنے لگا:۔

308136 Q44-11

"نے سندرو! اب تجھے پھُٹّی پاداں" (اب تجھے گُدگُداؤں) وہ اُس کے چھوٹے سے ہاتھ کو ہاتھ میں پکڑ کر "یہاں پڑی پھُٹّی۔ کاگ نے ماری پھُٹّی" کہتا ہوا آخر میں "ڈھونڈھ لی۔ ڈھونڈھ لی" کے ساتھ ہی اس کے گدگدی کرتا سندری ہنستی ہنستی دوہری ہوجاتی تھی۔ اِس میں روڈو کو بہشت کا سا سکھ اور مزہ مِل رہا تھا۔

اِسی وقت دُور سے کسی بچے نے اپنی ماں کو زور سے "بے بے" کہہ کر آواز لگائی۔

آواز سُن کر سندری ہنسنا بھول گئی اور وہ دونوں ہاتھوں سے روڈو کی ٹھوڑی پکڑ کر بولی "بابا میری بے بے کتھے؟" (بابا میری ماں کہاں؟)

"بیٹا تمہاری بے بے چلی گئی۔"

وہ پھر بولی

"بابا میری بے بے کتھے؟"

"بیٹی تیری بے بے دو ..... ر ..... اوپر چلی گئی۔"

"بابا بے بے دُو ... ر"

سُندری اِس وقت لیٹی ہوئی آسمان کو دیکھ رہی تھی۔ اِسی طرح دیکھتی ہوئی بولی۔

"بابا! بے بے دور ....؟"

"ہاں بیٹا دور"

"بابا بے بے اُوپر"

"ہاں بیٹا اُوپر چلی گئی۔"

"بے بے چندا ماما"

"ہاں بیٹی چندا ماما پاس۔"

"بابا بے بے کوکو۔"

"ہاں! بے بے کو کو لے گئی۔"

"بابا بے بے دور .... کوکو۔"

"ہاں میری بچی .... دو .... ر .. کو کو لے گئی۔"

اس طرح کرتی کرتی کچھ دیر بعد سندری سوگئی اور روڈو بھی۔

(۹)

دس بارہ سال بعد

لگن بُری ہو یا اچھی۔ یہ اِنسان کو کچھ نہ کچھ ضرور بنا دیتی ہے۔ لگن ایک قطرہ ہے جو کھٹاس بن کر دودھ کو دہی میں بدل دیتا ہے لیکن یہی قطرہ اگر کانجی بن کر لگ جائے تو دودھ کو پھاڑ کر خراب کر دیتا ہے۔

دِیوان پور کے جیوا سنگھ کے بیٹے کو بھی ایک لگن لگ چکی تھی اور وہ تب لگی جب وہ دسواں پاس کرنے کے بعد خالصہ کالج میں داخل ہوا تھا۔ بس اِسی لگن نے کہیئے یا ایک عظیم ہستی کی صُحبت نے اس کی زندگی کا پالنسہ پلٹ کر رکھ دیا۔

بچن سنگھ کی عُمر اٹھارہ اُنیس برس کی ہو گی۔ بے شک وہ کئی سال سے امرتسر کے گندے ماحول میں رہ رہا تھا لیکن اُس کا جِسم صحت مند اور چہرہ بھرا ہوا تھا جو داڑھی کے نِکل آنے سے اور بھی نِکھر گیا تھا اُس کے نیک چلن اور میٹھی بولی نے اس کو اسکول میں ہر دِل عزیز بنا رکھا تھا۔ اور اس طرح ہیرو بننے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بچن سنگھ کو نظمیں لکھنے اور سٹیج پر تقریر کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اپنے سکول کی یونین کا وہ لیڈر تھا۔ طالب علموں کے جلسوں، میٹنگوں میں ہمیشہ اُسے پہلی جگہ ملتی تھی۔ پبلک جلسوں میں بھی اُسے بلایا جاتا تھا۔ بڑی بڑی محفلوں میں بچن سنگھ کی نظموں کی مانگ ہوتی تھی۔ ایسی بات تو نہیں تھی کہ وہ بہت اونچے خیالات کی حامل ہوں بلکہ اس کی نظمیں تو عامیانہ ہوتی تھیں لیکن اُس کے گلے میں ایسا سُریلا پن تھا کہ اُس کی مدد سے بچن سنگھ کا پیتل بھی سونے کے بھاؤ بکتا تھا۔ کسی جلسے میں جب اُس کی جوش بھری آواز گونجتی تو سننے والے بُت بن جاتے تھے!

اور وہ نئی لگن جو بچن سنگھ کی زندگی میں اِنقلاب لے آئی، اس طرح لگی؛ دسویں کا امتحان پاس کرنے کے بعد بچن سنگھ خالصہ کالج میں فرسٹ ایر میں داخل ہوا۔ اِن دنوں شہروں اور گاؤں میں گرام سُدھار کے بڑے بڑے جلسے ہوا کرتے تھے۔ ان جلسوں کا مقصد تھا۔ گاؤں کے لوگوں کو بُرائیوں اور فضول خرچیوں سے روکنا۔

اسی طرح کا ایک جلسہ ایک دِن امرتسر کے جلیاں والے باغ میں ہو رہا تھا۔ کوئی دس ہزار سامعین کا مجمع تھا۔

جیسے ہی سٹیج سکریٹری نے بچن سنگھ کا نام لیا۔ سامعین میں ہل چل مچ گئی اور نعروں کی گونج میں وہ سٹیج پر آیا۔

اُس نے اپنی نظم سنائی۔ سامعین پر سناٹا چھا گیا۔ اُس کو دوبارہ بولنے کے لیے مجبور کیا گیا۔

جلسہ ختم ہوا۔ آج کی کامیابی نے بچن سنگھ کو خوشی سے بھر دیا۔ وہ زمین پر چل رہا تھا لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ آسمان میں اُڑ رہا ہو۔ اُس کے اِردگرد تعریف کرنے والوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔

اِن تعریف کرنے والوں کی بھیڑ جب اس کے اردگرد سے کچھ کم ہوئی تو ریشم سی سفید ڈاڑھی میں دمکتا چمکتا ایک بھرا بھرا سا چہرہ اس کے سامنے آیا۔ یہ ایک پچاس ساٹھ برس کا بوڑھا تھا لیکن تھا قابلِ دید۔ کھدر کے سادے سے کپڑوں میں وہ کوئی فرشتہ سا معلوم ہوتا تھا۔

سامنے آتے ہی بزرگ نے پیارسے بچن سنگھ کا ہاتھ پکڑ لیا اور بڑی عزّت سے اُسے دوسرے آدمیوں سے علیحدہ کرتے ہوئے ایک طرف لے گیا۔

"بیٹا" وہ ایک گھاس کے ٹکڑے پر بیٹھتے ہوئے بولا "آپ کی نظم مجھے آپ کے پاس کھینچ لائی ہے"

بچن سنگھ اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا "باباجی بڑی کرپا۔ میں آپ کی اس زحمت کے لیے......"

بات کاٹ کر بوڑھا بولا "میں اِتنا پڑھا لکھا نہیں۔ اِسی وجہ سے آپ سے آپ کی نظم کے معنی پوچھنا چاہتا ہوں۔ اور بوڑھے نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ایک چھوٹا سا کاغذ پڑھنا شروع کیا۔

تیرے چرناں دی سوں اے ہند ماتا
تیری سیوا وِچ زندگی لگا دِیاں گا
پھر کے دیس دی گلی محلیاں دے وِچ
میں کُریتیاں سب مِٹا دِیاں گا"

(اے بھارت ماں۔ میں تیرے چرنوں کی سوگندھ کھا کر کہتا ہوں کہ میں تیری خدمت میں ساری زندگی صرف کر دوں گا اور ملک کے گلی گلی کوچے کوچے میں گھوم کر سب بُرائیوں کو مٹا کر رکھ دوں گا۔)

بچن سنگھ نے یہ نظم اِسی جلسے میں پڑھی تھی۔ نظم کافی لمبی تھی لیکن اِس بوڑھے نے صرف دو ہی اشعار کاغذ پر درج کیے تھے۔ بچن سنگھ بولا "باباجی اِن اشعار کا مطلب تو بڑا آسان ہے"۔ بوڑھے نے بچن سنگھ کی طرف محبت اور فراخ دِلی سے دیکھتے ہوئے کہا " آسان نہیں بڑا مشکل ہے۔ ذرا پھر سوچو "۔

بچن سنگھ سوچ میں پڑ گیا۔

بابا پھر بولا " کیا آپ نے اِس کے معنی سمجھے ہیں " تیرے چرناں دی سوں "۔

اب بچن سنگھ کی سمجھ میں اصلیت آئی۔ اُس نے ایک بار پھر بوڑھے کی طرف دیکھا لیکن اِس بار بچن سنگھ کی آنکھیں بوڑھے کی تاب نہ لا سکیں اور نیچی ہوگئیں۔ بچن سنگھ کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

بزرگ نے بچن سنگھ کا کندھا ہلایا " نوجوان قسم نہیں کھانی چاہیئے۔ بڑا گناہ ہوتا ہے "

بچن سنگھ کی نظر زمین کے ذرّے گن رہی تھی۔

" بیٹا خدمت میں زندگی لگانے کا مطلب صرف لوگوں سے 'واہ واہ' حاصل کرنا ہی نہیں ہے۔

بچن سنگھ کا سر اُس بزرگ کے چرنوں پر جھک گیا۔

" اگر سچ مچ تیرے اندر کوئی آگ ہے تو یہ جھوٹی گپیں ہانکنے کے بجائے کچھ کر کے دِکھاؤ"، بوڑھے نے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

بچن سنگھ کی آنکھیں کھُل رہی تھیں۔ سچ مچ اِن اشعار کے معنی بہت مشکل تھے۔ اب تک بچن سنگھ کا نظریہ تھا، جوش بھری نظمیں پڑھ کر عوام کے جذبات کو بھڑکا دینا اور خود بے حساب تعریف حاصل کر کے ہی خوشی سے پھولے نہ سمانا اور سمجھنا کہ خدمت یہی یا اور سب کچھ یہی ہے۔ لیکن آج پہلی بار اُسے پتہ چلا کہ یہ جو کچھ وہ کر رہا ہے، صِرف بناوٹ محض ملمّع ہے۔ اِس زندگی سے الگ اور اُونچی کوئی اور عملی زندگی بھی ہے جس کا آج سے پہلے کبھی اُسے احساس بھی نہیں ہوا تھا۔

یہ مختصر سی بات کرنے کے بعد وہ بزرگ وہاں سے چلا گیا لیکن جاتا ہوا بچن سنگھ کے دل میں ایک نئی لگن لگا گیا۔ بچن سنگھ کے پوچھنے پر وہ اپنا پتہ بھی بتا گیا تھا۔ اُس کا نام دیدار سنگھ تھا اور آج کل وہ کچھ دِنوں کے لیے امرتسر میں ٹھہرا ہوا تھا۔

بچن سنگھ کی زندگی میں اِس دن سے تبدیلی آنی شروع ہوگئی۔ جتنے دن گیانی دیدار سنگھ امرتسر میں رہے وہ روز بلا ناغہ اُن کے پاس جاتا رہا۔ اور کچھ مدّت کے ساتھ نے اُس کو اتنا بدل دِیا کہ پہلے

کے اور موجودہ بچن سنگھ میں رات دن کا فرق ظاہر ہونے لگا۔
نظمیں وہ اب بھی لکھتا تھا لیکن دنیا کے لیے نہیں، اپنے آپ کے لیے۔ گیانی دیدار سنگھ جی کے مُنہ سے دُہرایا ہوا اس کا اپنا مصرعہ اُسے بھُولتا ہی نہ تھا! "تیرے چرناں دی سوں اے ...."

(۱۰)

اِس بار گرمیوں کی چھٹیوں میں بچن سنگھ کا ارادہ گھر جانے کی نہیں تھا۔ اپنی نظم کو عملی شکل دینے کے لیے وہ دیہاتوں کا دورہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن باپ کی بیماری کا خط پڑھ کر وہ نہ رہ سکا اور چھٹیاں ہوتے ہی گھر آ گیا۔
جیوا سنگھ نے جب لڑکے کا رنگ ڈھنگ دیکھا تو اُس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ کہاں تو وہ سوٹ بوٹ، کالر نکٹائیاں اور کہاں یہ موٹے کھدر کا کرتہ پاجامہ اور پاؤں میں بارہ آنے کی چپل۔
بیمار جیوا سنگھ کافی پریشان ہوا لیکن کیا کرتا۔ ایک ہی بیٹا تھا۔ سامنے ہو کر کچھ کہنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ کہیں ناراض ہو کر گھر سے ہی نہ نکل جائے۔
آخر یہی طے ہوا کہ بچن سنگھ کا پڑھنا لکھنا ختم کرا کے گھر کے کام دھندے میں ہی لگا یا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ پڑھاتے پڑھاتے لڑکے سے بھی ہاتھ دھونے پڑ جائیں۔
بچن سنگھ کو دیش کی خدمت کی لگن لگ چکی تھی لیکن ماں باپ کا دکھ بھی وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ من مار کر گھر کے کام کاج میں لگ گیا۔
ایک دن وہ کھیتوں کی دیکھ ریکھ کے لیے جاتا ہُوا جب گوردوارے کے سامنے سے گزرا تو اس میں تالا لگا ہوا دیکھ کر سوچنے لگا، سِکھوں کے اِتنے بڑے گاؤں میں گوردوارے کا یہ حال؟'
اس نے پاس کھڑے ایک لڑکے سے پوچھا۔
"کیوں مُنڈیا۔ اِس گوردوارے میں گرنتھی کوئی نہیں رہتا کیا؟" لڑکے نے اُنگلی سے اوپر کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ دیکھو۔ اوپر کی چھت پر کھڑکی میں بھائی بیٹھا ہے۔"
بچن سنگھ اور بھی حیران ہُوا۔ جس طرح اپنے کھیتوں میں غیروں کے جانور چرتے دیکھ کر حیران ہو، اور یہ دیکھ کر، اور بھی تعجب ہو کہ اس کے کھیتوں کا رکھوالا بھی مینڈھ پر بیٹھا ہے۔
اُس نے پھر پوچھا:

"اور بھائی جی گورو گرنتھ صاحب کا پرکاش اوپر کرتے ہیں؟"

بات لڑکے کی سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ بولا "کیا پرشاد؟ کڑاہ پرشاد؟ وہ تو گورپرب والے دن ہوتا ہے۔"

بچن سنگھ سمجھ گیا کہ لڑکے کی سمجھ میں میری بات نہیں آئی۔ اُس نے بھائی جی کو ایک دو آوازیں دیں۔ بھائی جی نے کھڑکی میں سے سر نکالا۔ نیچے سردار جیوا سنگھ کے لڑکے کو کھڑا دیکھ کر وہ بھاگے بھاگے نیچے آئے۔ آتے ہی دو فٹ جھک کر بڑے پریم سے ہاتھ جوڑ کر بولے "آئیے سردار جی۔ واہگورو جی کا خالصہ۔ واہگورو جی کی فتح۔ آپ کی بڑی کرپا ہے کہ جو اس گریب کے گھر میں چرن ڈال کر آپ نے اسے پوتر کیا۔ آئیے آن کر کے اوپر درشن دیجیے۔"

بچن سنگھ اس سے بات کرنے کے متلاشی تھا۔ لیکن گوردوارے کو "غریب کا گھر" اور "چرن ڈالیے" کہتا سن کر اُس کا دل لوٹ جانے کو ہوا لیکن پھر کچھ سوچ کر وہ بھائی جی کے ساتھ اوپر چلا گیا۔

بھائی جی کا قد سوا چھ فٹ کے لگ بھگ تھا۔ معلوم ہوتا تھا، اُن کی کھائی ہوئی خوراک گوشت بڑھانے کے بجائے ہڈیوں کا پنجر ہی بڑھا رہی تھی۔ رخساروں میں اتنے گہرے گڑھے پڑے تھے کہ چھوٹی موٹی گیند وہاں رکھ دیں تو دکھائی ہی نہ دے۔ پیٹ کو ذرا سا دبایا جائے تو ریڑھ کی ہڈی کو جا چھوتا اور نیچے کا جبڑا شردھالوؤں سے خالی گوردوارے کی طرح بالکل ہی دانتوں سے خالی تھا اور اُوپر بھی کل چار ہی دانت تھے اور وہ بھی باہر کو نکلتے ہوئے۔ ٹانگوں کی ہڈیاں دیکھ کر آدمی کو خیال پیدا ہوتا تھا کہ دھرتی تو دھول بیل کے سینگوں کے سہارے کھڑی ہے لیکن آپ کا اتنا لمبا اُونچا جسم کس چیز کے سہارے کھڑا ہے۔ ناف پیٹ میں سے انگوٹھے جتنی باہر کی طرف نکلی ہوئی تھی اور پیٹ کے اوپر کی چمڑی دیکھ کر یہ خیال ہوتا تھا جیسے آٹا گوندھنے والی پرات پر خالی ململ کا کپڑا چڑھا دیا گیا ہو۔ آپ کے کان اوپر سے نیچے کی طرف ڈھلکے ہوئے تھے اور ان میں پڑے ہوئے چھلوں نے کانوں کے چھیدوں کو پھاڑ کر اتنا کھلا کر دیا تھا کہ اُن میں سے گاجر آر پار جا سکتی تھی۔ پاؤں کی لمبائی دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ پرماتما سے بھی بنیے کی طرح غلطی ہو گئی ہے۔ قدرت نے بھائی جی کا جسم بنانے کا کام شاید مزدوری دے کر کروانے کی بجائے ٹھیکیدار سے کروایا تھا۔

چارپائی پر رکھا تکیہ جو سر کا تیل لگ لگ کر حلوائی کی میلی گدی کی طرح چیکٹ ہو چکا تھا جلدی سے چارپائی کے نیچے پھینک کر، دری دوہری کر کے پھٹا ہوا حصہ چھپا کر بچھاتے ہوئے بھائی جی اوپر کے ہونٹ کو تھوڑا آگے بڑھا کر دانتوں کو ڈھکنے کی کوشش کرتے ہوئے بولے "بیٹھیے سردار جی۔

آن کر کرکے ۔ یہ آپ کا ہی گھر ہے ۔ آپ توآن کر کرکے کبھی درشن ہی نہیں دیتے ۔ آج تو چیونٹی کے گھر بھگوان آگیا آن کر کرکے ۔"

"آپ کی کرپا" کہہ کر اور پھر کمرے کی چیزوں پر نظر دوڑا کر بچن سنگھ بولا :-

" مہاراج کا پرکاش کہاں ہوتا ہے ؟" (گورو گرنتھ صاحب کو درشن کے لئے کھول کر رکھنے کو پرکاش کرنا کہتے ہیں)

" مارا سردار جی (مہاراج سردار جی) کیا بتاؤں آن کر کرکے ۔ یہاں تو کوئی گوردوارے ہی نہیں آتا ۔ (پھر کچھ سوچ کر) پرکاش تو نیچے ہی کری دا (کیا جاتا) ہے جی لیکن آن کر کرکے جسم اچھا نہیں تھا، اس لیے نہیں کیا ۔"

بچن سنگھ کوئی چھوٹا بچہ نہیں تھا ۔ بھائی جی کی چاپلوسی کو وہ ایک دو باتوں میں ہی سمجھ گیا ۔ لیکن اس نے بھائی جی کی سچائی کا امتحان لینے کے لیے کہا " چلیے ذرا ۔ تکلیف کر کے دروازہ کھول کر مہاراج کا پرکاش کر دیجیے ۔ اتنے دن کا گاؤں آیا ہوا ہوں، پاٹھ کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملا ۔"

بھائی جی کا وار خالی ہی گیا اور ان کو ہار کر نیچے اُترنا ہی پڑا ۔ پانچ سات منٹوں کی کوشش کے بعد چابی مل گئی ۔ لیکن جب آکر تالے کو لگائی تو وہ کھلنے کا نام ہی نہ لے ۔ بچن سنگھ ذرا ناراض ہو کر بولا ۔ " چابی تو نہیں بدل گئی ؟ "

بھائی جی جھُولتے ہوئے اُوپر جاتے ہوئے بولے " جرا (ذرا) ٹھہرو ۔ کہیں بدل نہ گئی ہو اور جلدی سے جاکر تیل کے دیے میں چابی بھگولائے ۔ جیسے ہی تالا کھُلا ۔ بھائی جی بول اُٹھے " میں نے کہا ۔ اندھیر کیا پڑ گیا آن کر کرکے چابی پڑی تھی دوسری الماری میں اور میں اُٹھا لایا اُوپر کے چوبارے کی چابی ۔"

اندر جاکر دونوں نے جو حالت دیکھی اِس کے متعلق اتنا بتانا ہی کافی ہوگا کہ دونوں آدمی کانپنے لگ گئے تھے : بچن سنگھ غصّے سے اور بھائی جی مارے شرم کے ۔

اِس کے بعد بچن سنگھ بھائی کو چیتاونی دے کر اور ڈانٹ پلا کر کھیتوں کی طرف چلا گیا ۔

(۱۱)

" سناؤ جی گرنتھی جی ۔ آج کل تو بڑی موج میں رہتے ہو ۔"

پالا سنگھ نے بڑے پریم سے واہگورو جی کی فتح بلا کر اُوپر کا جملہ بھائی جی سے کہا، جو گوردوارے

میں جھاڑو دے رہے تھے۔ جھاڑو کونے میں کھڑی کر کے مٹی والے ہاتھ کرتے سے پونچھتے ہوئے بھائی جی بولے "آیئے جی۔ جی آئیاں نوں" (خوش آمدید) مہاراکیا بتائیں آن کر کر کے۔ ہم کو تو سردار جیوا سنگھ کے لڑکے نے مصیبت پا دتی ہے آن کر کر کے۔ جس دن کا آیا ہے۔ ہمارا کھون سوکھ گیا ہے۔ ڈر کے مارے کچھ کہہ بھی نہیں سکدے آن کر کر کے۔ کیا کریں۔ طاقت والے آن کر کر کے سات بیں کا سو گنوا لیتے ہیں۔

پالا سنگھ گاؤں کا چھٹا ہوا بدمعاش تھا اور اُس کے لوگ اُسے بھگوان کی طرح پوجتے تھے۔ اُس کی اپنی جو تھوڑی بہت زمین تھی وہ تو ماں باپ کے مرتے ہی اُس نے ٹھکانے لگا دی تھی۔ اور تھا اکیلا چھٹا ہوا! سارا گاؤں اس سے ڈرتا تھا۔ جب کسی کو لڑائی جھگڑا کرنا ہوتا یا کوئی اور ایسا ہی کام آ پڑے تو پالا سنگھ اس خدمت کے لیے مع اپنی ٹولی کے خود کو پیش کر دیا کرتا تھا۔

اُس میں بانٹ کر کھانے کا گن بھی کچھ کم قابل تعریف نہیں تھا۔ وہ اپنی ٹولی کے ساتھ جب کبھی مہینے پندرہ دن بعد پھیری لگانے (چوری کرنے) جاتا تو سب سے پہلے گوردوارے پر چڑھاوا چڑھانا ضرور مانتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بھائی جی اُس پر بے حد مہربان تھے۔ جب کبھی اُس کی پھیری اچھی لگ جاتی تھی تو گوردوارے میں کڑاہ پرشاد کی دیگیں چڑھاتا تھا۔ اس کے علاوہ بھنگ کے شربتوں کا کبھی نہ ختم ہونے والا لنگر ہمیشہ اُس کے خرچ پر ہی چلتا تھا۔

اِدھر کچھ دنوں سے وہ پھیری لگانے ہی گیا ہوا تھا اور آج بہت دنوں بعد اچھے ہاتھ رنگ کر گاؤں لوٹا تھا۔

جیوا سنگھ کے ساتھ اُس کی کافی دنوں سے لگتی تھی۔ اُس پر یہ پہلے ہی دانت پیستا رہتا تھا اور کسی ایسے موقعے کی تلاش میں تھا جب اس سے سارے اگلے پچھلے بدلے نکال لے۔ جیوا سنگھ ایک تو اس کا رُعب ہی نہیں مانتا تھا، دوسرے اُس نے ایک دو بار حاکموں کے پاس پالا سنگھ کی کرتوتوں کا بھانڈا پھوڑ دیا تھا۔ اِسی وجہ سے اُسے جیوا سنگھ سے ہمیشہ ہی خطرہ رہتا تھا۔ اب وہ بچن سنگھ سے بھی خار کھانے لگا تھا کیونکہ بچن سنگھ اس کے راستے میں بھاری رکاوٹ تھا۔

بھائی جی کی بات سُن کر پالا سنگھ بولا "اُس چھوکرے کی یہ مجال جو آپ کو کچھ کہہ سکے۔ اُس نے آپ پر کیا مصیبت ڈال دی ہے۔"

"مہاراج نہ پوچھیے آن کر کر کے۔ نئے پڑھا کو جو پیدا ہو گئے۔ جو گل کریں گے اُلٹی کریں گے۔ کہتا تھا— روز صبح تڑکے اُٹھ کر گرو گرنتھ صاحب کا پرکاش کیا کر۔ دونوں وقت جھاڑو دیا کر اور شام کو رہراس کا پاٹھ کیا کر آن کر کر کے۔"

ماتھے کی تیوری چڑھا کر بالا سنگھ بولا "ارے ! اُس کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہ بھی کوئی امرسر (امرتسر) سمجھ لیا اُس نے۔ یہاں بھلا کون آتا ہے گوردوارے، کھیتوں دیتوں کو چھوڑ کر۔ ہوا کبھی سنگرانہ (ہندی مہینے کا پہلا دن) یا اماوس، تو کوئی آ گیا پل دو پل کے لیے اور بھائی جی۔ آپ پھر غصہ کریں گے اگر میں کہوں کہ آپ بھی پورے مٹی کے مادھو ہیں بھلا آپ کوئی جیوا سنگھ سے تنخواہ لیتے ہیں — ؟"

اپنے حق میں یہ تقریر سُن کر بھائی صاحب حوصلے کے ساتھ بولے "آپ کے بچے جئیں۔ لاکھ روپے کی بات کی ہے آپ نے آن کر کر کے۔ مہاراج لڑکے کی شیطانی سیرت جو ہے آن کر کر کے۔ اُس کو سمجھائے کون۔ ہم لوگ تو ایرے غیرے کی جورو ہیں۔ کیا کریں؟ گزارا تو کرنا ہوا۔ اگر انکار کریں تو کہہ دیں گے۔ ٹکے کا گرنتھی سامنے سے بولتا ہے آن کر کر کے۔ اور پھر اتنے جھگڑے کریں کاہے کے لیے، یہاں تو کوئی کسی کو جلی روٹی کا چھلکا بھی اُتار کر نہیں دیتا آن کر کر کے۔ یہ تو آپ سے سخی داتاؤں کے سہارے گزارا چل رہا ہے یا پھر گاؤں میں مہینے دس دن بعد کوئی نہ کوئی مقدمہ ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے پاٹھ رکھانے والوں سے چار پیسے مل جاتے ہیں۔ نہیں تو کون آتا ہے یہاں گوردوارے میں آن کر کر کے۔ جس کے لیے روز صبح کو نیند خراب کریں۔"

تبھی تو بھائی صاحب۔ ہر ایرا غیرا آپ پر رُعب جما لیتا ہے نہ۔ اس طرح بھلا کیسے کام چلے گا؟ آپ بے شک ٹکا سا جواب دیجیے۔ ہم دیکھیں گے۔ آپ کا کوئی کیا بگاڑے گا۔ ہمارے ہوتے کس کی مجال جو آپ کی طرف آنکھ بھی اُٹھا کر دیکھے۔"

بالا سنگھ کی باتیں سُن کر بھائی جی کی سوئی ہوئی ہمت جیسے جاگ پڑی۔ بڑے جوش سے بولے "نہیں سردار جی — مجھے اس کی کیا پرواہ ہے آن کر کر کے۔ میں تو سوچتا تھا کہ کل کو آپ بھی اس کی باتوں میں آ کر مجھے ہی بُرا نہ سمجھیں۔ آپ کا خیال نہ ہوتا تو اُسے تو میں تبھی جھاڑ دیتا آن کر کر کے۔ سردار جی! بھلا آپ ہی بتائیے۔ ہم نشئی آدمی ٹھہرے۔ افیم سے تو ویسے ہی نیند زیادہ آتی ہے آن کر کر کے۔ صبح کے وقت ہی ذرا ٹھونگا لگانے کا وقت ہوتا ہے اور ہاں لیجیے ایک اور مصیبت وہ میرے گلے میں ڈالنے کو پھرتا ہے آن کر کر کے۔"

"وہ کیا؟"

"کہتا ہے کہ بھائی جی۔ آپ سارا دن جو بیکار چارپائی توڑتے رہتے ہیں آن کر کر کے۔ اور نہیں تو گاؤں کے لڑکے لڑکیوں کو ہی پڑھا دیا کرو۔"

غصّے سے ہونٹ چباتا ہوا پالا سنگھ بولا "نہ نہ کوئی ضرورت نہیں۔ پڑھانے دڑھانے کی خود بارہ برس پڑھ کر کیا تیر مار لیا اُس نے۔ اچھا بھلا لڑکا ہوتا تھا۔ اچھے ڈھنگ سے بولتا تھا۔ جس دن سے چار اُلٹے سیدھے نقطے پڑھ لیے، میں سمجھتا ہوں اس دن سے تو اِس کی عقل ہی ماری گئی ہے۔ اور دیکھو۔ کیسا سوانگ رچا کر آگیا ہے۔ جالوٹوں کا بیٹا ہو کر کنگالوں کا سا حلیہ؟ کہنے کو خالصہ کالج والے اچھا پڑھاتے ہیں۔ ہاں تو پھر آپ نے کیا کہا؟"

"کچھ نہیں۔ مجھے کوئی اُس کے گھر کھانے کو جانا تھا آن کر کر کے۔ کہہ دیا۔ بابا مجھ سے نہیں سارا دن لڑکے لڑکیوں سے مغز کھپائی ہوتی آن کر کر کے۔ اور سردار جی دوپہر کو تو نشہ پانی کرنے کا وقت ہوا اور پھر باہر جنگل پانی بھی جانا ہوا (رفع حاجت کے لیے جانا) ہمیں فرصت کہاں ملتی ہے؟ ایسی مصیبتیں برداشت کرے آن کر کر کے۔"

نشے کی بات پر زور دیتا ہوا پالا سنگھ بولا "آپ تو اب اکیلے ہی گلچھرے اُڑاتے ہوں گے۔ دھیان سوں اور نرائن سوں آج بڑی دیر سے میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ بھائی جی کی بیٹھک میں چل کر پرشادیں۔"

"گلچھرے مہاراج کیا اُڑائیں آن کر کر کے۔ اس لڑکے کے ڈر کے مارے بھنگ نہیں گھوٹتا۔ کئی دنوں سے پیاسے ہی بیٹھے ہیں۔"

"پھر وہی باتیں۔ آپ سے کہہ جو دیا کہ اُس کی ذرا بھی پرواہ نہ کیا کرو۔ میں خود اُس سے سمجھ لوں گا۔ آپ بے شک آج لگائیے رگڑا۔ اس کی لاٹ صاحبی بھی میں دیکھ لوں گا۔"

"اچھا جی۔ آج پھر نکالیں گے کسر آپ بھی آئیں گے نا؟"

"ہاں جی ضرور۔"

"اچھا پھر ذرا جلدی تشریف لانا آن کر کر کے۔ سائے ڈھلنے سے پہلے ہی اور اپنے ساتھ دوسرے ساتھیوں کو بھی لائیں گے نا آن کر کر کے۔"

"ہاں جی۔ وہ تو میرا پیچھا ہی نہیں چھوڑتے۔"

"یہ تو مہاراج آن کر کر کے بڑی خوشی کی بات ہے۔"

"اچھا پھر واہگرو جی کی فتح" کہہ کر پالا سنگھ چلا گیا۔ بھائی جی کی جھاڑو وہیں رکھی رہ گئی اور آپ نشہ رگڑنے کی تیاری میں ابھی سے جٹ گئے۔ ویسے تو آپ صبح کی بنائی معجون کی دو تین چٹکیاں افیم کے بعد کھا چکے تھے۔ نشہ بھی اچھا ہوا تھا۔ لیکن جو گھڑا بھر کر کھاتے پیتے ہوں ان کا محض انگلیاں چاٹنے سے کیا بنتا ہے۔ نشے بازوں کی صحبت میں بیٹھ کر گھٹنوں پر کہنیاں ٹیکا کر چھلکتا ہوا کٹورا غٹا غٹ چڑھانے

سے جو لالی چہرے پر آتی ہے وہ اِن چٹکیوں سے کہاں؟"

(۱۲)

دوپہر کے تین بجے کا وقت ہے۔ گوردوارے کی اُوپر والی بیٹھک میں بھائی جی کی ٹولی آکر اکھٹی ہوئی ہے۔ بھائی صاحب ایک طرف بیٹھے پریم سے آہستہ آہستہ کونڈی، صاف کر رہے تھے کیونکہ بچن سنگھ کے ڈیرے کئی دنوں سے اِسے صاف کرنے کا موقعہ ہی نہ مِلا تھا۔

پالا سنگھ چادر کے پلو سے قریباً دو سیر گُڑ کھول کر ایک طرف رکھتا ہوا بولا "بھائی جی ذرا پھرتی سے ہاتھ چلایئے۔"

انگوچھے سے کونڈی اور موصل پونچھ کر لاتے ہوئے بھائی جی بولے "لیجیے مہاراج گُڑ کو آن کر کر کے پتیلے میں گھولیں۔ میں دوڑ کر ٹھنڈائی لے آؤں۔"

منڈلی میں سے ایک نوجوان اُٹھ کر گُڑ گھولنے لگا۔ ایک بھنگ دھونے لگا۔ بھائی جی گیلے ہاتھ پونچھتے ہوئے بازار، کی طرف جانے لگے تو پالا سنگھ نے چادر کے کونے سے چونّی کھول کر دیتے ہوئے کہا "ذرا کہنا۔ پریم سے بنا کر دے۔ دو آنے کی ٹھنڈائی اور دو آنے کے بادام۔"

گوپال سنگھ ایک نیلی سی پوٹلی کھولتا ہوا بولا "بھائی جی۔ بادام نہ لایئے گا" اور اُس نے پلو سے، تین پاؤ کے قریب بادام کھول کر ڈھیر کر دیے۔

پالا سنگھ نے کہا "اچھا پھر چونّی کی ٹھنڈائی ہی لیتے آیئے گا"

"ست بچن" (جیسا آپ کا حکم) کہہ کر بھائی جی جلدی جلدی بازار پہنچے۔ سوچنے لگے۔ جاٹوں کی عقل تو ماری گئی ہے۔ اور پھر دو آنے کی ٹھنڈائی لی اور دو آنے واپس جیب میں ڈال لیے۔

ڈیرے پر لوٹے تو وہاں فوجیں پھرتی سے بادام توڑنے میں مصروف تھیں۔ دیوا سنگھ بولا:۔ "بھائی جی! آپ تو وہیں جاکر بیٹھ رہے۔ لایئے۔ اِدھر لایئے" اور اس نے بھائی جی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

بھائی جی نے کرتے کی جیب سے پڑیا نکال کر اُسے جلدی سے پکڑاتے ہوئے بولے "ارے میں تو بھاگا ہی گیا اور ....."

ساری منڈلی میں ہنسی کے پھوارے چھوٹ پڑے اور ہنس ہنس کر سب دوہرے ہونے لگے۔

بھائی جی پر صبح کی بھنگ کا اثر تھا یا پتہ نہیں کیا؟ دراصل پڑیا تو ان کی جیب میں ہی کھل کر ٹھنڈائی گر گئی تھی اور خالی پُڑیا نکال کر انھوں نے دیوا سنگھ کو پکڑا دی۔ جو تھوڑی بہت ٹھنڈائی پڑیا میں رہ گئی تھی وہ پکڑاتے وقت زمین پر گر گئی۔

بھائی جی شرمندہ ہو گئے۔ اور نیچے بیٹھ کر کرتے کی جیب میں سے ٹھنڈائی نکال کر کونڈی میں ڈالتے ہوئے بولے "اور دیکھو نا مہاراج ان بانیوں کے چھوکروں کو آن کر کر کے الودں کو پُڑیا باندھنے کا بھی ڈھب نہیں۔ ماں کے پاس سے آکر دُکان پر بیٹھ جاتے ہیں آن کر کر کے"

ساری ٹولی دائرہ بنا کر بیٹھ گئی اور باری باری کونڈی موصل پر کسرت شروع ہو گئی۔ جب بھنگ گھوٹتے گھوٹتے پون گھنٹہ ہو گیا اور بھنگ سرمے بھی زیادہ باریک ہو گئی تو لکھا سنگھ بولا "چلو بس بھی کرو اب کہ رات یہیں پر کرنی ہے!"

بھائی جی قریب ہی بیٹھے گلاس صاف کر رہے تھے۔ ایک کٹورے کو ذرا سی چکناہٹ لگی ہوئی تھی۔ اُس کو اُنگلی سے اُتار کر گھٹنوں پر ملتے ہوئے بولے "ابھی نہیں مارا ج، ابھی آن کر کر کے اور دو چار رگڑے لگاؤ۔ بڑے بزرگوں کا کہنا ہے۔

سُکھا گھوٹن سین ہیں جیتا کرو بلنبھ
تیتا ہی بہو گُن کرے۔ کہے شو شمبھو آپ"

(شو جی مہاراج خود فرماتے ہیں کہ بھنگ گھوٹنے میں جتنی دیر کی جائے اُتنا ہی اچھا ہوتا ہے)

آج کہیں سے ایک نرملا سادھو بھی گوردوارے میں آیا ہوا تھا اور وہ بھی اس ٹولی کے نزدیک کہیں بھاڈ سمرتی کا ٹیکا پڑھ رہا تھا۔ بھائی جی کا شعر سن کر اُس کا دھیان اپنی پوتھی سے ہٹ گیا۔ اور وہ بول اُٹھا "بھائی صاحب جی — آپ تو شاعر معلوم ہوتے ہیں لیکن قافیے سے قافیہ نہیں ملا۔"

بھائی جی اُس پر رُعب جمانے کے لیے بولے "مارا ج اس کو آن کر کر کے سر کھنڈی چھند کہتے ہیں۔ بڑے بڑے کوی آن کر کر کے اِس چھند میں کِوتا رچا کرتے تھے۔ دیکھئے نا ایک کوی نے فرمایا ہے،

مُکھ پر رنگ سہائے۔ وشو ناتھ کیلاش پت
جو اُدبھجے سکھ پائے۔ من چت سیتی دھیان دھر"

اور تو کسی کو کچھ سمجھ میں نہ آیا لیکن نرملے سادھو جی چپ نہ رہ سکے اور ہنستے ہوئے بولے "بھائی صاحب جی! اِس کو تو سورٹھا چھند کہتے ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر بھی آپ نے ہی کہا ہے "مکھ پر سہائے" واہ واہ کیا خوب انکار ہے۔ گنگا شو جی کے منہ سے نکلی تھی یا سر سے"

بھائی جی کو نشے کی جھونک میں اِس بات کا دھیان ہی نہ رہا تھا کہ اِن مٹی کے مادھووں کے بیچ کوئی گنی گیانی بھی بیٹھا ہے۔ اب انھیں پیچھا چھڑانے کی فکر ہوئی۔ وہ پاؤں کے ایک ناخن کو چھیلتے ہوئے بولے "مہاراج سور بٹا اور سرکھنڈی آن کر کر کے ایک ہی چیز ہے۔ شاعر لوگوں نے اِن کے نام ہی آن کر کر کے الگ رکھے ہوئے ہیں"۔

سادھو کو اور بھی ہنسی آگئی اور بولا "ٹھیک ہے گیانی جی ــ میں سمجھ گیا۔ کیونکہ دونوں کی جڑ ایک ہے۔ آپ تو بڑے عالم ہیں"۔

اپنے بھائی جی کی اِس جیت پر سب تالیاں بجانے لگے۔ اِس شغل میں آدھا گھنٹہ اور بیت گیا۔ پیارا سنگھ اُنگلی سے کونڈی کے کنارے سے بھنگ اکٹھی کرتے ہوئے بولا "بھائی جی بس یا ابھی اور رگڑے لگانے ہیں؟"

"بس مہاراج بس" کہہ کر اور کھونٹی سے انگوچھا اُتار کر بھائی جی سب سے آگے آ کر بیٹھ گئے۔ بیٹھتے وقت آپ کے گھٹنوں کی ہڈیوں سے اِس طرح کڑ کڑ کی آواز آئی جیسے کسی نے پٹاخے چھوڑ دیے ہوں۔ بالا سنگھ انگلیوں سے پتیلے میں گڑ کی بھیلی توڑتا ہوا بولا "اور بھائی جی ــ سچ ــ ایک بات کا اور خیال رکھیے گا۔ آج چھاندا (ٹھنڈائی) دو طرح کا بنانا۔ ایک پکے فوجیوں کے لیے اور ایک رنگروٹوں کے لیے (ایک طرف ہاتھ سے اِشارہ کرتے ہوئے) یہ سردار جی گنڈا سنگھ کا داماد ہے۔ یہ پہلی بار سسرال آئے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دوبارہ سسرال آنا ہی بند کر دیں اور وساواسوں اور مہاں سوں بھی نئے ہی بھرتی ہوئے ہیں"۔

"ست بچن" کہہ کر بھائی جی اپنے کام میں مصروف ہو گئے اور تھوڑی دیر میں ہی سارا کام پورا ہو گیا۔

گنڈا سنگھ کا داماد پرتاپ سنگھ بے شک شہر کا رہنے والا تھا لیکن پڑھا لکھا بس پاؤں کے ٹخنوں تک ہی تھا۔ ویسے لباس اور کالر نکٹائی سے بی اے .... ایم اے سے کم نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اُس بے چارے نے آج سے پہلے بھنگ کم و بیش ہی چکھی تھی۔ آج بھنگڑیوں کی ٹولی میں پھنس کر وہ سوچ رہا تھا "خدا خیر ہی کرے" اور جب پرتاپ سنگھ نے دیکھا کہ اب اُس کے پیالے کی باری ہے تو اس نے پیچھے بیٹھے ہی بھائی جی کی کمر کو اُنگلی سے چھوتے ہوئے آہستہ سے کہا "بھائی صاحب جی۔ ذرا سوایا پرشاد (کم پرشاد) ہی دیجیے گا"۔

بھائی جی خالصے کے ان مخصوص الفاظ کے صحیح معنوں کو کم و بیش ہی سمجھتے تھے۔ انہوں نے پیچھے

دیکھے بغیر ہی "سوائے پرشاد" کا مطلب یہ سمجھا کہ "ذرا زیادہ"۔ بھنگ پینے والوں کو اصل میں اِس بات سے بڑی چڑ ہوتی ہے۔ جو یہ گھمنڈ کرے کہ میں زیادہ پی کر ہضم کر سکتا ہوں وہ خار بازی میں اس کو اِتنی گاڑھی بھنگ دیتے ہیں کہ جس سے اُس کا گھمنڈ اچھی طرح ٹوٹ جائے۔

بھائی جی نے بھی پرتاپ سنگھ کے ساتھ یہی کیا۔ گلابی" (ہلکی) کو چھوڑ کر "سوہی" (تیز) میں سے اور وہ بھی نیچے کی گاڑھی گاڑھی بھنگ سے اُس کا گلاس بھر دیا۔

پرتاپ سنگھ بہت کہتا رہا "تھوڑی کیجیے۔ تھوڑی کیجیے"۔ لیکن بھائی جی نے بڑی مشکل سے ایک گھونٹ کے لگ بھگ کم کر کے گلاس اُسے پکڑا دیا۔ جھجکتے جھجکتے اُس نے پی تو لی لیکن پھر بھی چوتھائی حصہ چھوڑ دیا۔ جب سب کو پرشاد مل گیا تو بچی کھچی دو کٹورے بھر کر بھائی جی نے پی ڈالی۔

اِس کے تھوڑی دیر بعد اِدھر اُدھر کی گپیں شروع ہوئیں۔ مُنہ پر ہاتھ پھیرتا ہوا اجاگر سنگھ بولا "بھئی آہا ہا — آج تو ایسے بہشت کے جھولے مِل رہے ہیں کہ بس چپ ہی بھلی۔ ہر طرف گلزاریں پکی ہوئی ہیں"۔

مُنہ بند کر کے اور آنکھیں سُکیڑ کر اندر سنگھ نے جواب دیا "کیا کہا؟ گلزاریں پکی ہوئی ہیں۔ تم بھی بیٹا بس اُپلے تھاپنے بھر کے ہو۔ گلزاریں کِھلا کرتی ہیں یا پکا کرتی ہیں۔ پکتی تو بیلیں ہیں"۔

آنکھوں کو ذرا زور سے کھولتے ہوئے بھان سنگھ بولا "پالا سیاں — کیا بات ہے۔ تمہیں تو ابھی سے چڑھنی شروع ہو گئی ہے۔ تم تو پُرانے پاپی تھے۔ ابھی سے آنکھیں سُکیڑنے لگ پڑے ہو"۔

پالا سنگھ مُنہ کے تھوک کو ذرا مشکل سے اُتارتا ہوا بولا "کیا کہا؟ چڑھنے لگ پڑی ہے۔ (ہونٹوں اور رخساروں پر زور زور سے انگلیاں رگڑتے ہوئے) مجھے تو بھان سنگھ کبھی چڑھتی ہی نہیں۔ گورو کی قسم — اگر ساری پی جاتا۔ تو بھی پتہ نہیں چلتا — میرا سبھاؤ کڑوا ہے نا۔ اِس لیے نہیں چڑھتی۔ شراب کا نشہ تو مجھے ہوتا ہی نہیں۔ چاہے کنستر بھر کر پی جاؤں"۔

تھوڑی دیر رُک کر پالا سنگھ پھر بولا "بھان سوں۔ تم تو مجھے کہتے تھے لیکن آنکھیں تو تم خود ہی بند کیے جا رہے ہو"۔

چونک کر بھان سنگھ، بولا "کیا کہا؟ (پھر بھنگ کے چڑھنے کو محسوس کرتے ہوئے) نہیں مجھے تو پتہ بھی نہیں"۔

"ہوں بھلا پتہ نہیں۔ آنکھیں نہیں بتا رہیں؟"

"اچھا یہی سہی بھلا — تم جس طرح سمجھ لو بھئی۔ ایسے کر تو۔ جو دل میں آئے مجھ سے پوچھ۔ اگر میں ٹھیک جواب نہ دوں تو کہنا"۔

"اچھا پھر ایسے ہی سہی" کہہ کر اور سوچ کر پالا سنگھ نے کہا "اچھا بھلا بتا۔ کالا سنگھ کا مو والے کے مقدمے میں کون کون سا گواہ بھگتا تھا؟"

جواب کے انتظار میں جب پالا سنگھ نے بھان سنگھ کی طرف دیکھا تو اُس کی آنکھیں جم سی گئی تھیں۔ وہ اپنی جیت پر خوش ہو کر اُس کو کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اُسے بات ہی بھول گئی۔ جب بھولی ہوئی بات کو یاد کرنے کے لیے وہ اور دھیان سے سوچنے لگا تو اُس کو یہ بھی بھول گیا کہ کس سلسلے میں بات ہو رہی تھی اور زیادہ سوچنے سے اُسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ وہ کس سے باتیں کر رہا تھا۔ آخر بڑی کوشش کے بعد اُسے یاد آئی جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز مل گئی ہو۔ وہ جلدی جلدی ..... کہیں پھر نہ بھول جائے ..... بولا "ہاں بتاؤ۔ بھان سیاں۔ کون کون گواہ بھگتا تھا؟"

بھان سنگھ کی پھر سمادھی کھلی اور اُس نے بات کا مطلب نہ سمجھ کر کہا "کیا کہا ہے؟"

آنکھوں کو اور بھی زور سے کھولتے ہوئے پالا سنگھ بولا "کیا؟ میں نے تو کچھ نہیں کہا۔ (سوچ کر) ہاں سچ میں نے کہا تھا۔ لال بیل کو نہ جوتنا۔ ساری رات بے چارا کنوئیں پر جُتا رہا ہے۔"

بھان سنگھ ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا بولا "او چھوڑ بھی دے۔ تم تو کہتے تھے (بات بھول کر) ہاں یلا تھا۔ لیکن اُس نے مجھ سے کرائے کے دو روپے (رک کر) چلی گئی تھی۔" (ہنسنے لگا)

پالا سنگھ مُنہ پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا "بھئی بھان سیاں ۔۔ آج تو حد ہو گئی۔ مجھے تو کبھی نہیں چڑھی تھی۔" بات کرتے ہی اُس کا کچھ کھانے کو دل ہوا۔ اُس نے دیکھا کہ بھنگ سے بچا ہوا جو سیر بھر کے لگ بھگ گڑ بچا تھا۔ وہ سب کا سب کھا لیا گیا ہے۔ "بھائی جی جایئے کچھ کھانے کو لایئے۔"

بھائی جی جھوم رہے تھے۔ بنا کچھ کہے سنے روپیہ لے کر باہر چلے گئے اور گلی کا موڑ مڑتے ہی اُن کو بھول ہی گیا کہ وہ کس کام سے جا رہے تھے لیکن فوراً ہی کام یاد آ گیا۔ بڑی ہوشیاری کے ساتھ وہ حلوائی کی دکان پر پہنچے۔ وہاں سے آٹھ آنے کی ریوڑیاں تلوا کر وہ دماغ پر سارا زور دیتے ہوئے اڈے پر پہنچے۔ وہاں تمام رنگروٹ فوج لیٹی ہوئی تھی اور پکے فوجیوں میں سے بھی کوئی چھت پر نظریں جمائے بیٹھا تھا، کوئی ہنس رہا تھا تو کوئی ویسے ہی بُت بن گیا تھا۔ اور اگر ایک آگے جھک کر دوسرے کو بُلانے لگا تو وہیں کا وہیں رہ گیا۔

سوئے تو خیر سوئے ہی رہے لیکن جاگنے والوں کے لیے ریوڑیاں بھوتوں کا ستوا بن گئیں۔ پالا سنگھ نے ایک اور روپیہ نکال کر بھائی جی کو دیا۔ ویسے تو وہ شاید انکار ہی کر دیتے لیکن ایک تو آٹھ آنے کی خاطر اور دوسرے پہلی ریوڑیوں میں سے ایک دانہ بھی نہ ملنے کی وجہ سے چل ہی پڑے۔

اِس وقت وہ بڑی ہوشیاری سے اِس بات کو یاد رکھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ جس کام کے لیے جا رہے ہیں، وہ بھول نہ جائے۔ اور راستے میں بھٹک نہ جائیں۔ جس طرح دریا میں بہتے ہوئے شہتیر کے سہارے تیرنے والا انجان تیراک شہتیر کو مضبوطی سے پکڑے رکھتا ہے کہ اِسے چھوڑا نہیں اور ڈوبا نہیں، اِس طرح بھائی جی مضبوطی سے ایک روپے کو تھامے تھے۔

کندھے پر جو تولیہ تھا۔ اُسے پتہ نہیں کہاں رکھ دیا تھا اور یہ بات یاد کر کے کہ ریوڑیاں اِس میں باندھ کر لائی ہیں، اسے ڈھونڈھنے کے لیے چارپائی کے نیچے ٹٹولنے لگے۔

جب کافی دیر ہوگئی اور بھائی جی ریوڑیاں لے کر نہ آئے تو پالا سنگھ کو ریوڑیوں کی یاد آئی۔ وہ اُن کے پیچھے گیا اور پھر وہ بھی واپس نہ لوٹا۔

نرملے مہاتما جی اِس کام میں ذرا پکے تھے۔ قریباً ایک گھنٹے بعد جب اُن کا نشہ کچھ اُترا تو پتہ چلا کہ تین آدمی جو ریوڑیاں لینے گئے تھے ان میں سے کوئی نہیں آیا۔ اِس لیے ان کے دل میں بھی نیکی کا جذبہ ابھرا وہ چین سے نہ بیٹھ سکے۔ جیسے نیکی کی نیو ریوڑیوں کے تلوں پر ٹکی ہوئی تھی اور وہ پہلے جانے والے لوگوں کو ڈھونڈھنے کے لیے نکل پڑے۔ چراغ جلنے کا وقت ہو چکا تھا۔

وہ بازار پہنچے۔ کافی ڈھونڈھا بھالا لیکن تینوں میں سے کوئی بھی دکھائی نہ دیا۔ ہار کر جب ڈیرے کی طرف لوٹ رہے تھے تو راستے میں دیکھا کہ ایک جگہ جہاں کنوئیں کا گندا پانی اکٹھا ہو گیا تھا، وہاں پالا سنگھ مُنہ کے بل گرا پڑا تھا۔ کئی آدمی اس کو ہلا جلا رہے تھے۔ لیکن وہ یہی کہے جا رہا تھا: "اوئے مجھے آگ لگ گئی ہے لوگو — میرے کپڑے جلے جا رہے ہیں۔ پیٹ پر پانی ڈال کر آگ بجھا دی۔ لیکن کمر ابھی تک جل رہی ہے۔ کمر پر پانی کی بالٹی اُنڈیلو۔ ہائے اوئے میں مر گیا۔"

سنت جی نے سب کچھ دیکھا اور چپ چاپ ڈیرے کی طرف چلے گئے۔ لیکن انہیں بھائی جی کا کہیں پتہ نہ چلا۔ وہ لیٹنے کے لیے جب چارپائی پر بیٹھے تو نیچے سے کوئی چیز ان کے پاؤں کو چھو گئی۔ جب انھوں نے نیچے جھانکا۔ تو بھائی جی سمٹے ہوئے نیچے پڑے تھے۔ اور روپیہ ان کی مُٹھی میں جکڑا ہوا تھا

سنت جی نے بھائی جی کو ہلا جُلا کر باہر نکالنے کی کوشش کی لیکن وہ اور زیادہ سُکڑتے جاتے تھے۔ اور کہہ رہے تھے "پکڑو — پکڑو — بچن سنگھ کو آن کر کر کے۔ سردار پالا سنگھ جی! آپ کہتے تھے نا کہ ہم اس کی خبر لیں گے (گڑگڑا کر) جلدی کرو۔ دیکھو میرا آن کر کر کے گلا دبائے جا رہا ہے۔ اِس نے مجھے (بڑے زور سے مُنہ کا تھوک نگل کر) مار دینا ہے۔ او مدد کے لیے پہنچو۔ اوئے میرے مُنہ میں آن کر کر کے ریت بھرے جا رہا ہے۔"

اِدھر سب بے ہوش تھے۔ بھائی جی کے واویلوں کی طرف دھیان دینے کا کسے ہوش تھا۔

سنت جی کو پھر خیال آیا کہ اوپر سے رات آتی ہے اور ان لوگوں کا کیا بنے گا؟ انھوں نے سب کو اُٹھا کر ہلانا جلانا شروع کیا اور تو سب اُٹھ کر گرتے پڑتے چلے گئے لیکن پرتاپ سنگھ ہزار کوششوں کے باوجود نہ اُٹھا۔ جب سنت جی نے غور سے اس کی طرف دیکھا تو وہ ڈر گئے۔ اور اپنا بستر اور کمنڈل اُٹھا کر بھاگنے کے لیے تیار ہو گئے لیکن پھر یہ سوچ کر کہ اِس حالت میں جانا بھی مشکل ہے، وہیں پر ہی لیٹ گئے۔

دوسرے دن جب سورج کافی چڑھ آیا تو سنت جی ایک دو انگڑائیاں لے کر اُٹھ بیٹھے۔ انھوں چاروں طرف دیکھا۔ لیکن بھائی جی کہیں دکھائی نہ دیے۔ اِس وقت ان کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ پھر اُنھیں رات کی ساری باتیں آ گئیں۔ اور یہ بھی یاد آ گیا کہ بھائی جی چارپائی کے نیچے لیٹے تھے لیکن اب وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ فرش پر جو ایک نوجوان مُنہ کے بل پڑا تھا، وہ بھی نہیں تھا۔

سنت جی کو ڈر سا لگنے لگا۔ اور وہ وہاں سے کھسک لئے۔

وہ ابھی گاؤں سے مشکل سے آدھ میل ہی گئے ہوں گے کہ انھوں نے دیکھا کہ بچن سنگھ بھائی جی کو کمر پر لادے چلا آ رہا ہے لیکن سنت جی نے آنکھ بچا کر نکل جانا ہی مناسب سمجھا۔

(۱۳)

سارے گاؤں میں ہل چل مچ گئی۔ گھر گھر میں بھنگ کا ذکر تھا۔ اور تو سب کے گھروں میں بات پر پردہ ڈال دیا گیا لیکن گنڈا سنگھ کے گھر میں تو بات کا بتنگڑ بن گیا۔ داماد پہلی بار گھر آیا تھا اور اُس کا یہ حال کہ ساری رات بیچارے نے آنکھ نہ کھولی۔ بچن سنگھ کی زبانی ان کو پتہ چل گیا تھا کہ اُس نے گوردوارے میں بھنگ پی ہے کیونکہ جب رات کو بچن سنگھ کمر پر لاد کر اُسے گھر پہنچانے آیا تھا تو اس نے بتایا تھا کہ جب وہ گوردوارے گیا، تب بھائی جی تو وہاں نہیں تھے لیکن ایک سنت چارپائی پر لیٹا ہوا تھا اور پرتاپ سنگھ نیچے زمین پر۔

گنڈا سنگھ کے سارے خاندان نے کافی دوا داروکی۔ کانوں میں تیل ڈالا، سر میں بھی لگایا۔ آم کا اچار مُنہ میں ڈالا لیکن اس بیچارے کے حلق سے تو کچھ اُتر ہی نہیں پا رہا تھا۔ دودھ میں گھی ڈال کر پلانے کی کوشش کی لیکن وہ بھی منہ سے ہی باہر گر گیا۔

آہستہ آہستہ لڑکے کی حالت زیادہ خراب ہونی شروع ہوگئی۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ مُنہ نیلا ہوتا گیا۔ سارا جسم بھاری ہو گیا، یہاں تک کہ لڑکے کا جسم لکڑی کے شہتیر کی طرح اکڑ گیا۔ تب سب کے ہوش

اُڑنے۔ پاس والے گاؤں میں سرکاری ہسپتال تھا۔ صبح صبح ڈاکٹر صاحب لائے گئے۔ انھوں نے بتایا کہ لڑکے کو زہر دیا گیا ہے۔ اُسے سرکاری ہسپتال پہنچا یا گیا۔

دوسرے دن پالا سنگھ اور اُس کی ٹولی کو بھی اپنی اپنی فکر پڑ گئی۔

چور کو اپنا ڈر مارتا ہے۔ پالا سنگھ کو زیادہ فکر اس لیے ہوگئی کہ اگر پولیس کو اُس کی کل کی کارروائی کا پتہ چل گیا تو ساری بات اس کے سر آجائے گی کیونکہ وہ پہلے ہی دو تین سال تک دس نمبریوں کی فہرست میں رہ چکا تھا اور پھر متواتر کافی دیر پولیس کی کئی طرح کی خدمتیں کرنے کے بعد بڑی مشکل سے دس نمبری ہونے کا رسّہ اس کے گلے سے نکلا تھا اور اب پرتاپ سنگھ کا جیسا حال وہ دیکھ آیا تھا، اُس سے وہ اور بھی ڈر گیا۔

اُس کو ایک نشانے سے دو شکار مارنے کا ڈھنگ سوجھا۔ پہلے ہی جا کر تھانے رپورٹ کر دی کہ جیوا سنگھ کے لڑکے بچن سنگھ نے گنڈا سنگھ کے داماد کو زہر ملا کر پلا دیا ہے۔

دوپہر کو ہی تھانے سے دوڑ آگئی۔ آتے ہی ایک سپاہی جیوا سنگھ کے دروازے پر تعینات کر کے تھانیدار گنڈا سنگھ کے گھر پہنچا۔

اُدھر ایک حوالدار بچن سنگھ کے گھر کی تلاشی لے رہا تھا اور اِدھر تھانیدار واردات کی جگہ دیکھنے کے لیے گوردوارے میں داخل ہوگیا۔ ساتھ اور بھی کافی بھیڑ تھی۔ گوردوارے جا کر اس نے دیکھا کہ بچن سنگھ بھائی جی کے سر میں تیل لگا رہا ہے اور بھائی جی اس کے سامنے بیٹھے جھوم رہے ہیں۔

پولیس نے دونوں کو حراست میں لے لیا۔ پھر مکان کی تلاشی شروع کی لیکن اُن کو جو چاہیے تھا وہ فوراً ہی مل گیا۔ زیادہ پریشانی نہیں اُٹھانی پڑی۔ ایک کونے میں بھنگ کے پھوگ والا انگوچھا پڑا تھا بھنگ چھان کر بھائی جی نے ویسا کا ویسا ہی پھینک دیا تھا۔ جلدی میں نہ تو بھنگ کا پھوگ ہی نکال کر پھینکا تھا اور نہ انگوچھا ہی صاف کیا تھا۔

ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اُس نے پھوگ کا معائنہ کرنے لیے اُسے ٹٹولا تو اُس میں سے گھِسے ہوئے دو پیسے نکلے، جو اِس قدر گھس گئے تھے کہ اُن کا وزن مشکل سے آدھا رہ گیا تھا۔

ڈاکٹر اور پولیس کو اب سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ پیسے ہی بھنگ میں گھس کر پرتاپ سنگھ کو پلائے گئے ہیں۔ بچن سنگھ اور بھائی جی کو ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں اور اُدھر جیوا سنگھ کے گھر میں ہنگامہ مچ گیا۔

نزدیک ہی پالا سنگھ اور اُس کی ٹولی کے کئی آدمی کھڑے تھے۔ بے شک بھنگ کی خشکی سے سب کے سر چکرا رہے تھے لیکن اِس موقعے پر وہ ڈھیلے نہیں رہنا چاہتے تھے۔ پھوک میں سے پیسے نکلے دیکھ کر

سب بکے بکے رہ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ پیسے کس نے ڈال دیئے۔ لیکن کچھ بھی ہو اُنھیں اس بات کی بڑی خوشی تھی کہ بچن سنگھ کو پھنسانے اور اپنے گلے سے پھانسی کا رسہ اُتارنے کے لیے انھوں نے جو یونہی پانی میں لاٹھی چلائی تھی، اس میں سچ مچ بچن سنگھ کے خلاف خود بخود پولیس کو ثبوت مل گیا تھا پھر اس سے بھی زیادہ یہ کہ ایک تو وہ موقعے پر ہی پکڑا گیا اور پرتاپ سنگھ کے سسرال والوں نے بیان میں لکھوا دیا تھا کہ رات کو نو بجے بچن سنگھ ہمارے لڑکے کو اُٹھا کر گھر پر چھوڑ گیا تھا اور یہ بھی کہہ گیا تھا کہ زیادہ بھنگ پینے کی وجہ سے یہ بے ہوش ہو گیا ہے۔ اِس کے علاوہ پالا سنگھ کی ٹولی نے لگے ہاتھوں پولیس کا ہاتھ بھی گرم کر دیا تھا۔

دونوں ملزموں کا چالان ہو گیا اور مقدمہ عدالت میں پیش ہوا۔ جیوا سنگھ چاہے کھانسی بخار کی وجہ سے بیمار تھا لیکن اُس کی طرف سے ایک وکیل کھڑا کیا گیا۔ اِستغاثے میں جو گواہیاں ہوئیں اُن میں پالا سنگھ کی گواہی اِس طرح تھی:۔

واقعے والے دن میں اپنے گھر میں موجود تھا۔ شام کے پانچ بجے جب گوردوارے گیا تو بچن سنگھ اور پرتاپ سنگھ بھنگ گھوٹ رہے تھے۔ بھائی جی پوجا پاٹھ میں مصروف تھے۔ مَیں وہاں تھوڑی دیر رُک کر لوٹ آیا۔ رات کو نو بجے کے قریب جب میں گلی سے گزر رہا تھا تو بچن سنگھ کو میں نے دیکھا۔ یہ پرتاپ سنگھ کو کمر پر لادے اُسے سسرال کے گھر لے جا رہا تھا۔ میں نے اِس کو کئی آوازیں دیں لیکن اِس نے کوئی جواب نہ دِیا۔"

اس کے بعد پالا سنگھ کی ٹولی کے کچھ لوگوں کی گواہیاں ہوئیں۔ اُن کا بیان بھی لگ بھگ ایسا ہی تھا۔

جب ملزموں کے بیان شروع ہوئے تو بھائی جی کو طوطے کی طرح جو پڑھایا گیا تھا، اُسی کے مُطابق بولے: "مجھے آن کر کر کے بچن سنگھ نے بھنگ گھوٹنے کے لیے کہا تھا۔ ٹھنڈائی لانے کے لیے آن کر کر کے چار آنے کے پیسے بھی دیے تھے۔ میں دو آنے کی ہی ......" کہتے کہتے بھائی جی رُک گئے۔

حاکم نے جو اینگلو انڈین تھا، سرکاری وکیل سے پوچھا: "ویل یہ اپنے بیان میں کر کر کر کیا بولتا ہے:" وکیل نے اِس کا انگریزی میں جواب دیا کہ یہ اس کا تکیہ کلام ہے اور صاحب ہنس پڑے۔

اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے بھائی جی بولے: "دو آنے کی ٹھنڈائی لایا تھا۔ حضور آن کر کر کے۔ میرا تو اِس میں کوئی قصور بھی نہیں۔ مجھے جو مرضی قسم دے دیجیے۔"

بچن سنگھ کا وکیل پورا اُستاد تھا۔ وہ جرح کے سلسلے میں بھائی جی سے پوچھنے لگا: "آپ ٹھنڈائی

کس سے لائے تھے ؟"

" دیوی دیال بنیے کے لڑکے سے آن کر کر کے ۔"

" اُس کو آپ نے کیا دِیا تھا ؟"

" چونی ۔"

" اور اس نے آپ کو کیا لوٹا یا تھا ؟"

" دونی ۔"

" اچھا اُس نے آپ کو دو آنے کے کتنے پیسے دیے تھے ؟"

اِس وقت پیچھے کھڑے پالا سنگھ نے اشارے سے دو انگلیاں دکھا کر کانی سمجھانے کی کوشش کی لیکن بھائی تو شریف گائے کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے ۔ ان کی سمجھ ہی نہ آیا اور بولے " آٹھ پیسے ۔"

پھر وکیل نے پوچھا " ان پیسوں کا آپ نے کیا کیا ؟ "

" میں نے آن کر کر کے کرتے کی جیب میں ڈال لیے تھے ۔"

" اور ٹھنڈائی والی پڑیا ۔"

" وہ بھی اُسی جیب میں آن کر کر کے ۔"

" اور ڈیرے پر جا کر آپ نے پیسوں کو کہاں رکھا ؟"

بھائی جی کو کوئی بھولی بات یاد آگئی اور جھجکتے جھجکتے بولے " بعد میں میری جیب سے آن کر کر کے چھ پیسے ہی نکلے تھے ۔ شاید وہ پیسے بھنگ کی کونڈی میں ...... نہ سر (سوچ کر) زمین پر گِر پڑے ہوں گے آن کر کر کے ۔

" اور وہ جو دو پیسے بھنگ کے پھوک میں سے نکلے ہیں وہ کہاں سے آگئے ' ؟ "

بھائی جی کی ٹانگیں کانپنے لگیں اور ننگے گھٹنے ایک دوسرے کے ساتھ کھٹ کھٹ بجنے لگے ۔ معاملہ صاف ہوتا دیکھ کر وہ گھبرا سے گئے ۔ وکیل نے جب اُن کو مشکل میں پھنسے دیکھا تو ذرا اور آنکھیں دکھا کر بولے " سچ سچ بتاؤ گے تو بچ جاؤ گے ۔ نہیں تو ساری عمر کے لیے جیل خانہ مِلے گا ۔ پھر بیٹھے قسمت کو روتے رہو گے ۔"

بھائی جی کے بچے کھچے ہوش بھی اُڑ گئے ۔ وہ وکیل کے آگے ہاتھ جوڑ کر بولے " حضور آن کر کر کے سچ سچ ہی کہوں گا ۔ یہ پیسے میری جیب سے ہی ٹھنڈائی میں رل کر کونڈی میں گر پڑے تھے ۔ مجھے بعد میں خیال آگیا تھا ۔"

بالا سنگھ کی ٹولی کا رنگ فق ہوگیا۔ اُن کی ناؤ کا چپو ایک ایسے انجان ملاح کے ہاتھ میں تھا، جس سے اُن کو معلوم ہو رہا تھا کہ اب ڈوبے ہی ڈوبے۔

وکیل نے بھائی جی کو تھپکی دے کر محبت سے کہا "شاباش۔ میں آپ سے بڑا خوش ہوں۔ گورو کے سکھ اور آپ جیسے گرنتھی جھوٹ نہیں بولا کرتے۔" اِس تھپکی نے جیسے بھائی جی کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ انھوں نے الف سے لے کر یے تک سب باتیں سچ سچ بتادیں اور یہ بھی کہہ دیا کہ بچن سنگھ کا اس میں کوئی ہاتھ نہیں تھا۔

اِس کے بعد بچن سنگھ کا بیان ہوا۔ اُس نے کہا: "میں واقعے والے دن صبح سات بجے کا تحصیل گیا ہوا تھا۔ ایک زمین کے سمجھوتے کے بارے میں باپو جی نے بھیجا تھا۔ (اِس کے ثبوت میں تحصیل دار کی شہادت ہوئی) رات کے آٹھ سوا آٹھ بجے جب میں گاؤں پہنچا تو میں نے سوچا کہ بھائی جی سے مِلتا چلوں کیونکہ گاؤں کے گوردوارے میں لڑکوں لڑکیوں کا سکول کھولنے کے لیے اِن سے میری بات چیت چل رہی تھی۔ میں نے گوردوارے کی اوپر کی چھت پر جاکر دیکھا تو بھائی جی وہاں موجود نہیں تھے۔ ایک نرملا سادھو (جو اُس کے بعد دکھائی نہیں دیا) چارپائی پر لیٹا تھا اور پرتاپ سنگھ نیچے۔ میں نے دونوں کو جگانے کی کوشش کی لیکن وہ نہ جاگے۔ پاس ہی بھنگ کے برتن اور کونڈی ڈنڈا دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ انھوں نے بھنگ پی لی ہے۔ پرتاپ سنگھ کی حالت دیکھ کر میں ڈر گیا۔ گاؤں کا داماد تھا۔ اُس کو اُٹھا کر اُسی وقت اُس کے سسرال کے گھر پہنچا دیا۔ اگلی صبح جب میں کھیتوں کی طرف گیا تو مجھے کسی نے بتایا کہ دریا کے کنارے کوئی سکھ مرا پڑا ہے۔ میں اُسی وقت اُس کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچا تو وہاں بھائی جی کو بے ہوش پڑے پایا۔ ان کو اُٹھا کر میں گوردوارے میں لایا۔ جب بہت کوشش کے بعد اِن کو ہوش آیا تو انھوں نے بتایا: "مجھے پتہ نہیں کہ کس وقت میں بھنگ کے نشے میں چارپائی کے نیچے گھسا۔ شام کو کوئی ساڑھے سات بجے مجھے جنگل پانی جانے کی حاجت محسوس ہوئی، میں اُسی طرح گرتا پڑتا باہر نکل پڑا۔ قریب ہی ایک آم کا باغ تھا۔ اس میں جنگل پانی (رفع حاجت) ہو کر جب میں لوٹا تو مجھے کچھ پتہ نہیں رہا کہ کدھر سے آیا ہوں اور کِدھر جانا ہے۔ پھر مجھے پتہ نہیں کہ میں کِس وقت اور کون سے راستے دریا پر پہنچ کر بے ہوش ہوگیا۔"

اِس کے بعد پرتاپ سنگھ کی گواہی ہوئی جو ابھی ہسپتال میں تھا۔ اور ابھی مشکل سے بول سکتا تھا۔ اُس نے سِکھے سکھلائے کے مطابق کافی اِدھر اُدھر کی ماریں لیکن وکیل کی جرح کے سامنے نہ ٹھہر سکا۔

مقدمے کا رُخ ہی پلٹ گیا۔ بالا سنگھ، گرنتھی اور اُن کے پانچوں ساتھیوں کو عدالت کے حکم سے گرفتار کر لیا گیا اور کچھ پیشیوں کے بعد عدالت نے مقدمے کا فیصلہ اس طرح سُنا دیا۔

"بچن سنگھ بری — بھائی دسوندھا سنگھ کو غیر ذمے داری سے ایک جان خطرے میں ڈالنے کے جرم میں ایک سال قید۔ پالا سنگھ کو جھوٹی رپورٹ درج کرانے کے جرم میں دفعہ ۱۷۷ کے مُطابق دو سال قید۔ باقی پانچوں کو جھوٹی گواہی دینے کے جرم میں دفعہ ۱۹۳ کے مُطابق چھ چھ مہینے قید۔"

(۱۴)

بے شک پالا سنگھ اور اُس کے ساتھیوں اور بھائی جی نے اپنے کرتوتوں کا ہی پھل پایا تھا لیکن پالا سنگھ کی باقی ٹولی پر اُلٹا اثر ہوا اور وہ بچن سنگھ پر دانت پیسنے لگے۔ خاص کر پالا سنگھ کے کچھ جگری دوست تو انتظار میں تھے کہ کب پالا سنگھ باہر آئے اور بچن سنگھ سے گِن گِن کر بدلے لیں۔ اُنھوں نے سارے گاؤں میں مشہور کر دیا کہ بچن سنگھ نے ہی بھنگ میں پیسے مِلا کر پالا سنگھ کے ساتھ دشمنی کی تھی اور اُسی نے بھائی جی کی گواہی بدلوا کر سب کو پھنسا دیا ہے۔

اِدھر بچن سنگھ یہ سوچ رہا تھا کہ صرف جہالت کی ہی وجہ سے ہمارے بھائیوں کی ایسی بُری حالت ہو رہی ہے کہ وہ گوردوارے سی متبرک جگہوں پر بھنگ اور افیم کے دَور چلا کر اپنا اور اپنی نسلوں کا ستیاناس کر رہے ہیں۔ وہ مصمم ارادے سے اِس لاعلمی کو دور کرنے اور سماجی سدھار کے لیے کوئی ترکیب سوچنے لگا۔

امرتسر سے آنے کے پہلے بچن سنگھ نے اُس بوڑھی عظیم ہستی گیانی دیدار سنگھ سے گاؤں آنے کا وعدہ لیا تھا۔ اُسی کے مُطابق اُس نے گیانی جی کو بُلا بھیجا اور وہ جلد ہی آ گئے۔

شہر سیالکوٹ کے آپ رہنے والے تھے اور وہاں آپ کے دولڑکے معمولی کام دھندا کیا کرتے تھے۔ گیانی جی نے کچھ عرصہ پہلے یہی فیصلہ کیا تھا کہ گرہست میں کافی رہ لیا ہے، اب باقی زندگی لوک سیوا میں لگائی جائے۔ اُن کے دونوں بیٹوں نے دس دس روپے مہینہ اپنے باپ کو (چاہے جہاں بھی ہوں) بھیجنا منظور کر لیا تھا۔ اِس کے علاوہ تھوڑی بہت جمع پُونجی اُن کے پاس پہلے کی تھی۔

گیانی جی کے درشن کر کے بچن سنگھ کو بڑی خوشی ہوئی۔ اُس نے اپنے گاؤں کے آس پاس کے علاقے کی حالت ایسے درد بھرے الفاظ میں اُن کو سنائی کہ گیانی جی کی آنکھیں تر ہو گئیں۔ اُنھوں نے مقدمے کا حال سُنا اور بڑے ہی دُکھی ہوئے اور یہ بھی اُنھوں نے محسوس کیا کہ بچن سنگھ کتنا سچا دلیر اور بے خوف نوجوان ہے اور اُس کی زندگی میں کتنی تبدیلی آ چکی ہے۔

آخر جب بچن سنگھ نے جا کر گوردوارے کی حالت دِکھائی تو گیانی جی برداشت نہ کر سکے اور

وہ کچھ مدت کے لیے دِیوان پور میں ہی رُک گئے۔

گیانی جی بڑے گور مُکھ، سیدھے سادے، گورو کی بانی جپنے اور میٹھا بولنے والے اِنسان تھے، یہ روز امرت ویلے (صبح تڑکے) اُٹھتے، نہا دھوکر گورو کی بانی کا پاٹھ کرتے، پھر مہاراج گورو گرنتھ کا پرکاش کرتے تھے۔ (سکھوں کی مُتبرک کتاب گورو گرنتھ کو پڑھنے کے لیے کھولتے تھے) گیانی جی کے آنے کا جاٹوں کو ایک فائدہ ضرور ہوا کہ تڑکے چار بجے جب آپ کنوئیں پر نہا دھو رہے ہوتے تو چرخی کی آواز سنتے ہی جاٹوں کی نیند کھل جاتی اور وُہ ہل پنجالی سنبھال کر کھیتوں کی طرف چل دیتے۔

آہستہ آہستہ جاٹنیوں (کِسانوں کی بیویوں) پر بھی اُن کا اثر پڑنے لگا۔ وہ کھیتوں کی طرف ساگ توڑنے یا روٹی دینے جاتیں تو وہ اناج، کھیتوں سے چُنی تھوڑی سی پیاز یا مکئی کے ایک دو بھُٹے گیانی جی کی خِدمت میں پیش کر کے ماتھا ٹیک جاتیں۔

کچھ وقت اور گزر گیا۔ اب کبھی کبھی جاٹ بھی آتے جاتے ہل پنجالی دیوار کے سہارے ٹِکا کر بیلوں کو ہانک کر اندر آجاتے یا باہر سے ہی تعظیم سے سر جھکا کر جاتے تھے۔

بچن سنگھ کی ہمت سے جاٹوں کے کئی چھوٹے چھوٹے لڑکے لڑکیوں کو اکٹھا کر کے گیانی جی نے اُن کو پڑھانے کا ذمّہ لے لیا۔ ایک ترکھان کو لکڑی دے کر دس پندرہ تختیاں بنوائیں۔ قلموں کے لیے بیلے (دریا کے کِنارے اُگا جنگل) میں سے کانوں، کا ڈھیر کاٹا گیا اور گاؤں کے کُمہار سے گیری اور پیلی مٹّی لے کر بچّوں کو لِکھنے کا سامان مہیّا کیا گیا۔ جاٹوں کے بگڑے ہوئے بچّوں کے لیے پہلے کچھ دیر تو گھُٹنے ٹیک کر سارا دن ضایع کرنا گوڑائی کرنے سے بھی زیادہ مشکل تھا لیکن گیانی جی کے میٹھے سبھاؤ اور پیار کے برتاؤ نے اُن کو قابو میں کر ہی لیا۔

گیانی جی کو دِل بہلاوے کے لیے اچھا شغل مِل گیا۔ وہ سارا دن اُن کو سکھانے پڑھانے میں مصروف رہتے تھے۔ ایک کو 'پُورنے' (نقش) لکھ کر دیتے تو دوسرا کہتا "او گیانی جی۔ منگو نے میری قلم توڑ دی ہے۔" اسے وہ اور قلم بنا کر دیتے تو ایک اور بول اٹھتا "گیانی جی دیکھو۔ بنتا میری نقلیں اُتار رہا ہے۔" اُدھر قریب کے ٹاٹ پر بیٹھی لڑکیاں آپس میں گھتم گھتا ہو جاتیں تو گیانی جی اُن کے مقدمے کا فیصلہ کرنا شروع کر دیتے۔

اِن کو دِنوں، چڑیوں کو پڑھانے میں گیانی جی نے رات دن ایک کر دیا اور دو مہینوں میں مشکل سے اُنھیں بیٹھنے کی عادت ہی ڈال سکے۔ شیطان بچے گیانی جی کی سفید داڑھی کو اُن کی چھاتی پر ہلتا دیکھ کر ہنستے ہنستے دوہرے ہو جاتے تھے۔ لڑکیاں ان کو ذرا سا غائب دیکھ کر فوراً سروں سے دوپٹے اُتار دیتیں

اور اُن کی گیندیں بنا بنا کر تختی پر اُچھالتی ہوئیں تھال کا کھیل کھیلنے لگ جاتیں اور آپس میں چوٹیاں باندھ کر گدھا ناچنا شروع کر دیتی تھیں۔ لیکن گیانی جی بھی اپنے لیے لمبی حدیں متعین کر کے بیٹھے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ کبھی نہ کبھی ضرور اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔

ایک دِن گیانی جی اور بچن سنگھ بیٹھے کسی معاملے پر بحث کر رہے تھے۔ سامنے ایک چٹائی پر بیٹھے لڑکے لڑکیاں پڑھ رہے تھے۔ باتوں کا موضوع تھا: "سیوا"۔ گیانی جی کہہ رہے تھے: "سیوا بڑی مشکل ہے۔ جس کو لوگ سیوا سمجھ کر کر رہے ہیں وہ اصل میں اُس کا سوانگ۔۔۔"

گیانی جی کے مُنہ سے نکلا ہر لفظ بچن سنگھ کے دل پر گہرا اثر کر رہا تھا۔ وہ کچھ اور پُوچھنے ہی والا تھا کہ اسی وقت اُس کی توجہ ایک اور طرف کھنچ گئی۔ اس کا مُنہ دروازے کی طرف تھا۔ وہ کتنی دیر سے دہلیز پر کھڑی ایک لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ لڑکی کی عمر بارہ چودہ سال کی تھی۔ اس نے سر پر کوڑے کا بھرا ہوا چھاج اُٹھایا ہوا تھا، جس کے بوجھ سے اُسے تکلیف ہو رہی تھی۔ بیچ بیچ میں جب اُس کی گردن تھک جاتی تھی تو دونوں بازوؤں پر چھاج کا بوجھ اٹھا کر وہ تھکان دُور کر لیتی۔ اُس کا چاند سا چہرہ، غریبی کے بادلوں کے پیچھے سے چمک رہا تھا۔

بچن سنگھ نے دیکھا۔ پڑھنے والی لڑکیاں جو دروازے کے پاس ہی تھیں، اس کی طرف دیکھ دیکھ کر اور پھر ایک دوسری کی طرف دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔ کوئی اس کی طرف گنے کا چھلکا پھینک دیتی، کوئی چٹائی میں سے تنکے نکال کر اُس پر پھینک رہی تھی اور کوئی بہانے سے اُس کے پاس سے گزرتی ہوئی اُس پر تھوک جاتی تھی۔

لیکن اُس لڑکی کا ان باتوں کی طرف دھیان ہی نہیں تھا۔ وہ ایک ٹک اُن کی تختیوں کا بیوں اور لکھنے کے ڈھنگ کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر چھاج کو دونوں ہاتھوں سے اُوپر اُٹھایا۔ اچانک ہی اُس کے سر کا بنڈا نیچے گر پڑا۔ لڑکیوں نے جب دیکھا تو اُن کو اور مذاق کا بہانہ مل گیا۔ اُنہوں نے کافی ہنسی روکی لیکن مُنہ بند کرتے کرتے بھی دو تین لڑکیوں کی ہنسی نکل ہی گئی۔ گیانی جی کے کانوں میں بھی اس کی آواز پڑی۔ لڑکی بیچاری شرمندہ ہو گئی اور زیادہ نہ ٹھہر سکی۔

گیانی جی نے لڑکیوں کو ڈانٹا تو سب تختیوں کے پیچھے سر چھپا کر چپ ہو گئیں۔ اس کے بعد بچن سنگھ نے گیانی جی کو ساری بات بتائی کہ کس طرح یہ چڑیلیں اُس بیچاری کا کتنی دیر سے مذاق اُڑا رہی تھیں۔ گیانی جی کو صرف لڑکیوں کی ہنسی پر ہی غصہ آیا تھا۔ انہوں نے اور کچھ نہیں دیکھا تھا۔ وہ بولے: "خبردار جو دوبارہ خرمستی کی۔" (بچن سنگھ کو) "چھوڑیئے۔ یہ لڑکیاں بڑی آفت ہیں۔ ان کے ساتھ کافی مغز پچی کرتا ہوں۔

لیکن اِن پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ لڑکیاں، چڑیاں اور بکریاں تینوں بہت شرارتی ہوتی ہیں۔ اِن کو تو۔۔۔۔"

بات کاٹ کر بچن سنگھ بولا "گیانی جی یہ بھی آپ کی ہمت ہے، جو ان کو چار لفظ پڑھا رہے ہیں نہیں تو (لڑکوں کی طرف اشارہ کرکے) یہ بدمعاش پڑھنے والے ہیں؟ یہ تو بس بیلوں کے پیچھے تتا تتا کرنا ہی جانتے ہیں" ــــــ کچھ دیر اور بات چیت کرنے کے بعد بچن سنگھ چلا گیا۔

(۱۵)

بابا رنڈو جب مانگ تانگ کر گھر لوٹ رہا تھا تو راستے میں اُسے خیال آیا کہ سندری کے لیے کتنے دنوں سے کچھ نہیں لے گیا۔ اُس نے پگڑی کا پلّو کھولا۔ اُس میں سے اُسے تین دھیلے اور ایک پیسہ مِلا۔ پھر اُس نے تہمد کا پلّو ٹٹولا اور پھر تھیلے میں رکھے ایک چیتھڑے کی گانٹھ کھولی۔ ایک چبوترے پر بیٹھ کر اس نے سارے پیسے گنے۔ جو تین آنے کے قریب ہوئے۔ وہ کتنی ہی دیر بیٹھا سوچتا رہا۔ کہ اِن پیسوں سے کیا خریدے۔ آخر اُسے خیال آیا کہ سندری روز باجا لینے کے لیے ضد کیا کرتی تھی۔ وہ دکان پر پہنچا۔ ڈھائی آنے کا اس نے باجا خریدا اور حلوائی سے ایک ٹکے کی برفی لے کر جلدی جلدی گھر پہنچا۔

گھر جا کر بندریا کو اس نے دروازے کے پاس چھوڑ دیا۔ اور خود "سُندرو سُندرو" آوازیں دیتا ہوا اندر داخل ہوا۔ لیکن اور دِنوں کے برعکس آج سندری اُسے کہیں دِکھائی نہ دی، جو اِس سے پہلے روز ہی جھونپڑی کے دروازے پر اُسے خوش آمدید کہنے کے لیے آ کھڑی ہوتی تھی۔

وہ جلدی جلدی اندر سے باہر آیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ کئی آوازیں دیں لیکن سندری کا اُسے کوئی پتہ نہ لگا۔ وہ غصے سے تلملا اُٹھا۔ اِس غصے میں کتنا پیار، کتنی تڑپ اور کتنی بے صبری شامل تھی، اِس کا اندازہ لگانا مُشکل ہے۔

وہ جلدی جلدی جھونپڑی کے پچھلے حصے میں گیا تو اُس نے دیکھا کہ سُندری ایک چارپائی کھڑی کرکے اس کے پیچھے بیٹھی انگلی سے زمین پر کچھ لکھ رہی تھی۔

بیچارے رونڈو کی جان میں جان آئی۔ رونڈو کو دیکھتے ہی سُندری بھی لکھنا لکھانا سب بھول گئی اور وہ پیار سے مسکراتی ہوئی اُس کی کمر سے چمٹ کر اُسے اپنی طرف کھینچتی ہوئی بولی "بابا۔ آ تجھے دکھاؤں اِدھر آ۔ جلدی کر۔ اِدھر دیکھ"۔ اور اس نے رونڈو کو وہیں پر لا بٹھایا۔

پھر اُس کے پیچھے کی طرف ہو کر دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے اُس کے چہرے کو تھپتھپاتے ہوئے بولی "دیکھ بابا اِدھر" اور خود اس کے سامنے آکر اِس طرح کودنے لگی جیسے اُس نے روپوں کا بھرا ہوا کوزہ ڈھونڈھ لیا ہو۔

روڈو اُس کی طفلانہ حرکتوں پر خوش ہو رہا تھا۔ اُس نے پیار سے اُسے اپنی طرف کھینچ کر اور اُس کا سر چُوم کر کہا "یہ کیا آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہی ہے ؟"

سُندری نے خود کو اُس سے چھڑا کر اور حروف کی طرف اُس کی توجہ دلاتے ہوئے کہا "ہاں آڑی ترچھی لکیریں۔ (حرف پر انگلی گھماتے ہوئے) یہ دیکھ بابا — وہ اوڑھا ہے اور یہ دیکھ 'سسا' (س) اور ہاں یہ ہے (سوچ سوچ کر) ٹھہر جا۔ مجھے نام ہی بھول گیا۔ ہاں اسے کہتے ہیں 'پپا' (پ)"

روڈو بیچارے کی جانے بلا 'سسا' کیا ہوتا ہے اور 'پپا' کس کو کہتے ہیں۔ وہ ہنستا ہوا بولا "اری واہ ری میری پڑھاکو۔ اور بیٹا تجھے کیا معلوم کیسے لکھا جاتا ہے ؟"

"ہاں بابا وہ ایسے ہی لکھتی تھیں !"

"کون ؟"

"وہ لڑکیاں اور کون"

"کون لڑکیاں ؟"

"وہ جو گوردوارے میں پڑھتی ہیں"

"اور بیٹا تمہیں کیسے معلوم کہ وہ ایسے لکھتی ہیں ؟"

"مجھے پتہ ہے کہ — میں تو روز دیکھتی ہوں۔ آج بھی دیکھا تھا۔ جب کوڑے کا ڈھیر پھینکنے گئی تو وہ لکھ رہی تھیں"

"لکھتی رہیں تمہیں کیا ؟"

بچوں والی ضد کر کے اور رونا سا مُنہ بنا کر وہ مچلتی ہوئی بولی "نا بابا۔ میں بھی لکھا کروں گی"

ہنستے ہنستے اور کچھ اُداس ڈھنگ سے روڈو اُس کی ٹھوڑی پکڑ کر بولا "ارے آئی بڑی پڑھاکو، پگلی لکھنا پڑھنا کوئی ہمارا کام ہے ؟"

سندری کے دل پر مایوسی چھا گئی اور سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

"تو پھر اور کس کا کام ہے ؟"

"بیٹا وہ تو ہیں سرداروں، مہاجنوں کی لڑکیاں۔ اور ہم ٹھہرے غریب مانگنے والے۔ ہمیں کیا لینا دینا

بھلا ایسے کاموں سے۔"

"مانگنے والے نہیں پڑھا کرتے۔" یہ سُن کر سندری کے چہرے پر اور بھی مایوسی چھاگئی اور وہ سوچنے لگی "میں نے سچ مچ ہی بڑا نامناسب کام کیا ہے۔" لیکن بچوں کی سی ضد پکڑ کر وہ پھر بولی "اور بابا ہمیں ...... ہم سے نہیں ...... ہم ...... ہم نہیں پڑھ سکتے؟"

"بیٹا — طاقت والے تم نے سُنا نہیں - سات بیسیوں کا سوگنواتے ہیں۔ وہ تو کہتے ہیں کہ اگر نچلی ذاتیں پڑھ گئیں تو پھر اُن کے کام دھندے کون کرے گا؟"

لڑکی کا دل پھر بھی نہ مانا اور وہ ضد کرتی ہوئی بولی "نہ بابا۔ میں تو لکھا کروں گی۔ اندر بیٹھ کر ہی لکھ لیا کروں گی۔ اُن کو کیا پتہ چلے گا؟ دن کو جب کوڑا پھینکنے جایا کروں گی تو وہاں لڑکیوں کے حرف دیکھ آیا کروں گی اور رات کو ...."

بیچ سے ہی روڈو بول پڑا "چل چھوڑ۔ فضول سی باتیں اور یہ لے۔" اور اُس نے باجا اور مٹھائی کا دونا اسے پکڑا دیا۔

وہی باجا جس کی مانگ وہ لگاتار کئی ہفتوں سے کر رہی تھی اُس کو مل گیا تھا۔ روڈو کا خیال تھا کہ سندری باجا دیکھتے ہی اُلٹی سیدھی چھلانگیں لگانے لگے گی لیکن سندری نے لاپرواہی سے دونوں چیزیں پکڑیں اور ویسی کی ویسی اندر جا کر ایک کونے میں رکھ آئی۔

(۱۶)

بچن سنگھ روز ہی بلا ناغہ گیانی جی کے پاس جا بیٹھتا اور ہر روز الگ الگ موضوعات پر دونوں میں بحث ہوتی رہتی تھی۔ بچن سنگھ کو اِس بحث سے بڑی خوشی ملتی تھی۔ گیانی جی کی نیک صحبت میں اُس کی کایا دن بدن پلٹنے لگی اور اس کی زندگی کا ایک نیا ہی رُخ ہو گیا۔ ہر روز وہ دیکھتا کہ وہ لڑکی جنگلی جھاڑیوں سے کاٹی گئی شاخوں سے بنائی ایک ٹوٹی ہوئی ٹوکری ہاتھ میں لٹکائے اور کبھی سر پر اُٹھائے کتنی کتنی دیر آنگن کے باہری دروازے کے ساتھ کھڑی لڑکیوں کی لکھائی دیکھتی رہتی تھی۔

ایک دن دوپہر کے وقت جب وہ گوردوارے آیا تو دیکھا۔ گیانی جی لڑکے لڑکیوں کو پڑھنے کی تاکید کر کے کہیں جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔

بچن سنگھ نے آتے ہی پوچھا "آج کدھر کے لیے تیار ہوئے ہیں؟"

"آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا۔ کپڑے میلے ہو گئے تھے۔ میں نے کہا۔ کنویں پر جا کر دھولاؤں۔ میری خواہش تھی کہ آپ بھی ساتھ ہی چلتے تو اچھا ہوتا۔ سیر سپاٹا ہو جائے گا۔"

"چلیے پھر" کہہ کر بچن سنگھ ساتھ ہو لیا۔ دونوں جب دروازے سے باہر نکلے تو وہی لڑکی کوڑے والی خالی ٹوکری ایک طرف رکھ کر دیوار کی طرف منہ کیے اُنگلی سے زمین پر کچھ لکھ رہی تھی۔ اُس کے پاس کاغذ کا ایک پھٹا ہوا ٹکڑا تھا۔ جس کو دیکھ کر لکھتی جاتی تھی۔ اُس کے موتیوں جیسے خوب صورت حروف جو بالکل چھاپے خانے کے سے معلوم ہوتے تھے، دیکھ کر دونوں حیران رہ گئے۔ کاغذ بچوں کی پہلی کتاب کا پہلا صفحہ تھا۔ اِس پر موٹے حروف میں 'اوڑے ایڑے' (پنجابی کی الف ب) چھپی تھی۔ کاغذ ردی اور پھٹا ہوا تھا۔ لڑکی نے اُس کے حاشیے کو آٹے کی لیئی سے چپکا لیا تھا اور اُس کو اِتنی نزاکت سے پکڑتی اور رکھتی تھی جیسے کوئی شاہی حکم نامہ ہو۔

دونوں کئی منٹ کھڑے اُس کی تحریر کے متعلق ایک دوسرے کی طرف دیکھ دیکھ کر حیرانی ظاہر کرتے رہے۔ جب لڑکی نے سب سے آخری لفظ لکھنے کے لیے کاغذ کی طرف دیکھا تو اس کی نظر سر پر کھڑے دونوں آدمیوں پر پڑی۔ وہ اتنی ڈری، اِس قدر سہمی کہ اپنی ٹوکری وہیں چھوڑ کر اُٹھ بھاگی۔

اُس کی تیز عقل اور اِتنی خوش خط تحریر دیکھ دونوں باغ باغ ہو گئے۔ لڑکی ابھی چار پانچ قدم ہی گئی ہوگی کہ گیانی جی نے آواز دی "اے لڑکی"

آواز سن کر پہلے تو لڑکی کا دل چاہا کہ بھاگتی ہی جائے لیکن ٹانگوں نے اُس کا ساتھ نہ دیا اور وہ وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی۔ اِتنے میں گیانی جی نے دوسری آواز دی "بیٹا ڈر نہیں۔ میں تجھے مارتا نہیں۔ نزدیک آ۔ میری بات سُن"

لڑکی کی جان میں جان آئی اور سر نیچا کیے مجرموں کی طرح چلتی ہوئی آہستہ آہستہ ان کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ گیانی جی نے پیار سے پوچھا "کاکو (بیٹی) یہ حرف لکھنے تم نے کہاں سے سیکھے ہیں؟"

لڑکی پھر کانپ اُٹھی۔ وہ سمجھ گئی کہ چوری سے چوری کا اِقبال کرانے کے لیے ہی یہ ڈھنگ استعمال کیا جا رہا ہے۔ گیانی جی کی بات کا اُسے کوئی جواب نہ سُوجھا۔

گیانی جی نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کو تھوڑا اور اپنے قریب لا کر کہا "بیٹی تو ڈر نہیں۔ ہم تجھے کچھ نہیں کہیں گے۔ تیری خوش خط تحریر دیکھ کر میں بہت خوش ہوا ہوں۔ تم نے لکھنا کس سے سیکھا ہے؟"

لڑکی کے دِل کو کچھ ڈھارس بندھی ۔ اب اُس میں بولنے کی ہمت بھی ہوگئی ۔ وہ دھیمی آواز میں بولی " میں خود ہی لکھا کرتی ہوں "

بچن سنگھ اب تک حیرانی سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا ۔ لڑکی کی بات سن کر وہ خود بخود بول اٹھا " خود لکھے ہیں ؟ کس سے سیکھے ہیں ؟ "

لڑکی سے نہیں کا جواب سن کر دونوں کو حد سے زیادہ خوشی ہوئی ۔ گیانی جی نے پھر پوچھا ۔ " تمہیں اِن حروف کے نام بھی آتے ہیں ؟ "

" ہاں جی "

" سناؤ بھلا "

لڑکی نے روانی سے صفحے کے سارے حروف پڑھ دیے ۔ اور پھر بولی " جی مجھے مہارنی بھی آتی ہے "

گیانی جی نے بچن سنگھ کی طرف دیکھ کر کہا " بچن سنگھ جی لکھنے کا ڈھنگ تو بھلا اِس نے قاعدے کے ورق سے دیکھ کر سیکھ لیا ہوگا ۔ لیکن پڑھنا .... "

لڑکی بولی " جی لڑکے لڑکیاں روز شام کو مہارنی بولا کرتے ہیں ۔ میں سنتی رہتی ہوں "

گیانی جی نے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا " شاباش ۔ بچی شاباش ۔ تو بڑی عقل والی ہے ۔ ے ۔ میں تجھے قاعدہ اور تختی لا دیتا ہوں ۔ تو پڑھا کر ۔ تیرا نام کیا ہے بیٹا ؟ "

" جی ، سندری "

بچن سنگھ بولا " بابا جی یہ تو شاید اچھوتوں کی لڑکی ہے ۔ آپ اِس کو اِس طرح بے جھجک چھو رہے ہیں ۔ مجھے تو اِس بات کا وہم نہیں ہے لیکن گاؤں کے لوگ بہت برُے ہیں "

گیانی جی نے لاپرواہی سے کہا " اگر وہ اِس طرح کی ہونہار بچی کو چھونے اور اُسے تعلیم دینے سے روکتے ہیں تو یہ اُن کی ناانصافی ہے ۔ مجھے ایسے لوگوں کی پرواہ نہیں "

بچن سنگھ اور کچھ نہ بولا ۔ گیانی جی نے اندر جاکر قاعدہ تختی اور قلم دوات لاکر لڑکی کے حوالے کرتے ہوئے کہا " لے بیٹی ۔ روز بلا ناغہ پڑھا کر ۔ اگر تیرا دل کرے تو یہاں آکر پڑھ جایا کر ۔ "

لڑکی نے یہ چیزیں لیں اور یہ پیار بھرے جُملے سُنے ۔ ایسے جیسے کسی جنم کے اندھے کو آنکھیں مل جائیں ۔ اِس کے بعد سب اپنے اپنے راستے پر ہولیے ۔

سُندری اُڑتی ہوئی گھر پہنچی ۔

(۱۷)

"بابا بابا — دیکھ میں کیا لائی؟" اتنا کہہ کر خوشی میں پھولی نہ سماتی سندری نے ایک ایک کر کے روڈو کو سب چیزیں دکھائیں اور پھر بولی "تم تو کہتے تھے کہ وہ ماریں گے۔ نہ پڑھا کر۔ وہ تو اُلٹا کہتے تھے۔ تو پڑھا کر۔ ہم تجھے خود پڑھایا کریں گے۔ یہ دیکھ کیسی خوب صورت تختی اور قاعدہ دیا ہے۔ ساتھ میں دو قلمیں اور بابا گاچنی بھی دی ہے۔ لاؤ میں رکھوں۔ اور دوات میں سیاہی ڈالوں۔ دیکھا! آہا جی۔ ہم تختی پر لکھیں گے۔"

لڑکی کی چیزیں دیکھ کر روڈو کو حیرانی ہوئی۔ یہ چیزیں اِس کو کون دینے والا ہے۔ اُسے شک ہوا کہ کہیں کسی کی اُٹھا نہ لائی ہو۔ یہ سوچ کر اُس نے پوچھا "یہ کس کی اُٹھا لائی ہے؟ جا بیٹا، جس کی لائی ہو۔ جا کر دے آ، کیا سر پھڑوائے گی میرا۔"

"نہیں بابا۔ دیوی کی قسم — مجھے تو گیانی جی نے خود دی ہیں۔ چل تجھے پوچھوا دوں" اور وہ روڈو کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگی۔

سُندری کے چہرے سے چھلکتے ارادے اور بے خوفی کو دیکھ کر روڈو کو اُس کی بات کا یقین ہو گیا اور پھر جب اُس کے بعد سُندری نے سارا حال تفصیل سے سنایا تو اسے کوئی شک باقی نہ رہا۔

اِسی دِن سے سُندری کو پڑھنے لکھنے کی سہولت ہو گئی۔ کام دھندے سے اسے جتنا وقت مِلتا، وہ اُسے اپنی پڑھائی میں خرچ کرنے لگی، یہاں تک کہ رات کو سوتے وقت بھی اُس کا دھیان پڑھائی میں ہی رہتا۔ گھنٹے دو گھنٹے کے لیے وہ ہر روز گیانی جی سے سبق لینے بھی چلی جاتی تھی۔ گیانی جی بے شک دِل سے اُسے اور لڑکیوں کے ساتھ بٹھانا چاہتے تھے لیکن اِس راستے میں کئی رکاوٹیں آنے کے خیال سے اُنھوں نے دروازے کے باہر ہی اُس کے لیے ایک ٹاٹ بچھا رکھا تھا، جہاں بیٹھ کر وہ اکیلی ہی پڑھتی رہتی تھی۔ یہ بھی لڑکی کے لیے اچھا ہی ہوا۔ کیونکہ اگر وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ بیٹھتی تو اُن کی شرارتوں کی وجہ سے اُسے روپے میں سے ایک پیسہ بھی سبق پلے نہ پڑتا۔ لیکن اُس کے اکیلے پڑھنے میں بھی رکاوٹ پڑنی شروع ہو گئی۔ لڑکیاں لڑکے اندر باہر آتے جاتے وقت اُس کے ساتھ کوئی نہ کوئی شرارت کر ہی جاتے تھے۔ کوئی لڑکی دوسری کو دھکا دے کر اُس پر پھینک دیتی اور بعد میں اپنی انگلیوں میں انگلیاں پھنسا کر کہتی "اڑانگا۔ پڑانگا۔ اچھوت کو چھونا کوئی نا" اور گرنے والی لڑکی ضد کے ساتھ دوسروں کو چھونے کے لیے دوڑتی۔ کوئی چپکے سے اس کی سیاہی کی دوات اُلٹ جاتی اور کوئی قلم کا چھلکا اُتار کر دونوں انگلیوں کے درمیان کمان سا اُسے جھکا کر، اُس کے چہرے کی طرف پھینک

دیتی۔ یہ سلسلہ بند ہونے میں اِس لیے نہیں آتا تھا کہ سُندری کبھی کسی کی شکایت نہیں کرتی تھی۔

سُندری اِن رُکاوٹوں کی پرواہ کیے بغیر، نیچا کیے اپنے کام میں لگی رہتی تھی۔ لیکن اُس کے راستے میں ایک اور رکاوٹ آ گئی۔ اور وہ یہ کہ گاؤں کے چودھری اور چودھرائنوں نے بھی ایک دوسرے سے مُنہ جوڑ کر اِس کا چرچا شروع کر دیا۔ یہ ساری بات بالا سنگھ کی پارٹی کی اُٹھائی ہوئی تھی۔ طرح طرح سے وہ گیانی جی کو دھونس دھمکی بھی دے جاتے لیکن گیانی جی نے سُندری کو پڑھانا نہ چھوڑا۔

آہستہ آہستہ بات زیادہ بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ ایک دِن جب چندا سنگھ کی ماں کی موت کے موقعے پر لوگ اس کی حویلی میں اِکٹھے ہو کر بیٹھے تھے تو یہی بات چل پڑی۔ جوالا سنگھ کے یہ کہنے پر کہ گاؤں کے کنوئیں میں ڈاکٹر دوائی ڈال گئے ہیں۔ سُندر سنگھ بولا "دوائی تو ہمارے ہی فائدے کے لیے ڈالتے ہیں۔ اُس دن جیوا سنگھ کا لڑکا بچنا کہتا تھا کہ دوائی سے بخار کے کیڑے جو پانی میں ہوتے ہیں، مر جاتے ہیں۔"

نتھا سنگھ پگڑی کو آنکھوں سے اوپر اُٹھا کر بولا "میں کہتا ہوں۔ دوائی سے تو اُلٹی بیماریاں شروع ہوتی ہیں۔ پتہ ہے پچھلے سال طاعون کیوں شروع ہوا تھا؟ انگریز نے گولیاں ڈلوائی تھیں۔ چوہے گولیاں کھا کر مر گئے اور اُن کی بدبو سے طاعون پھیل گیا اور گھر کے گھر اُجڑ گئے۔"

سُندر سنگھ بولا "بھئی ہمیں پڑھے لکھوں کی ان باتوں کا کیا پتہ۔ جیسا کوئی کہتا ہے مان لیتے ہیں۔ ہوگا — یہ باتیں تو پڑھا کو، جانیں۔"

اِتنے میں بابا بھان سنگھ بولا "او، دیکھ لیے تمہارے پڑھے لکھے۔ سچی بات کہوں گا چاہے سب کو بُری ہی لگے۔ چنادری زبان سے رہا نہیں جاتا۔ جیوا سنگھ نے لڑکے کو پڑھا کیا دیا ہے کہ الٹا اُس کی عقل کو تالا دیا ہے۔ یہ رنگریزیاں (انگریزی) کیا پڑھ آیا۔ بھنگی چماروں کو ہمارے ساتھ مِلانے کا ٹھیکہ ہی لے آیا ہے۔ رات کو دریا سا بتا رہا تھا کہ بچنے کے کہنے میں آ کر سکول کے بھائی نے کسی قلندر کی لڑکی کو بھی پڑھانا شروع کر دیا ہے۔"

ایک اور بولا "بھئی بات تو نانو نے لاکھ روپے والی کی ہے۔ مَیں تو خود کئی دنوں سے اسے گوردوارے کے سامنے بیٹھی دیکھتا ہوں۔ کئی بار جی بھی چاہا کہ جیوا سنگھ کو جا کر سمجھاؤں اور اس گیانی سے بھی پوچھوں لیکن پھر سوچا۔ کون راہ چلتا لڑائیاں مول لے اور جیوا سنگھ پہلے ہی بیماری کی وجہ سے چارپائی سے لگا ہوا ہے۔ اس سے کیا کہیں؟ لیکن اِس طرح گزارہ بھی نہیں ہو سکتا۔ آج گوردوارے جانا شروع ہو گئی تو کل کنوئیں پر بھی جا چڑھے گی۔"

دوسرا بولا "ٹھیک کہتا ہے یہ! یہ نیچ لوگ ٹلنے والے نہیں ہیں۔ یاد ہے روانی گاؤں میں

کیسا پھساد (فساد) ہوا تھا۔ برادری خالصہ والوں نے دو دن جلسہ کیا کہ اچھوتوں کی شدھی کریں گے۔

تیسرے نے کہا "بھائیو۔ میں سچی گل مُنہ پر کہتا ہوں۔ اب بھی گرے ہوئے بیروں کا کچھ نہیں بگڑا۔ اگر اِس گیانی کو کسی نے منع نہ کیا تو روانی والا جھگڑا ایہاں بھی ہو کر رہے گا۔ وُہ جو کہتے ہیں۔ ایک ایک گیارہ۔ پہلے اکیلا بچنا (بچن سنگھ) ہی کون سا کم تھا کہ ویسا ہی ساتھی گیانی بھی آ کر مل گیا ہے۔"

ایک اور بولا "اِسی لیے تو کہتے ہیں کہ اچھی صحبت آدمی کو بنا دیتی ہے اور بُری بگاڑ دیتی ہے۔ بھائی جی کیسا دیوتا آدمی تھا۔ کبھی الف سے ب نہیں بولتا تھا۔ وقت بے وقت سات کام سنوار دیتا تھا اور تھا بھی بڑا شریف۔ جو جیسا کہے ویسا ہی مان لیتا تھا۔"

دوسرے نے کہا "تبھی تو بچنا آتے ہی اس کا دشمن ہو گیا۔ اس بیچارے کو نکالنے کے لیے بہانے ڈھونڈھنے لگا۔ کبھی کہنا لڑکے لڑکیاں پڑھایا کر، کبھی گرنتھ صاحب لگایا کر، کبھی یہ کر کبھی وہ کر۔ لیکن وہ کب اِس کی باتوں میں آنے والا تھا۔ اس نے ..."

تیسرا بولا "اور ہاں کہ — اِسی بات سے چڑ کر اُس بیچارے کو قید کرا دیا۔ لیکن بھئی ہمیں کیا خبر تھی اِن اندر کی باتوں کی — وہ جو (بچن سنگھ) روز آ کر کہا کرتا تھا کہ لڑکوں کو روز پڑھنے بھیجو۔ ہم بھی آ گئے اُس کی باتوں میں۔"

چوتھے نے کہا "اور بتائیے نا — اتنی دیر ہو گئی ہے۔ پڑھایا کیا ہے؟ بلکہ بچے جو گھر کا چھوٹا موٹا کام کرتے تھے۔ وُہ بھی گیا۔ ہم تو بھائی کل سے لڑکی کو سکول نہیں بھیجیں گے۔ وُہ جو کہتے ہیں "بھاڑ میں جائے ایسا سونا جس سے ٹوٹیں کان"۔ کیا لینا ہے ہمیں ایسی پڑھائیاں پڑھا کر۔"

پانچویں نے رائے ظاہر کی "وہ تا؟ اگر تم نہیں بھیجو گے تو پھر اور بھی کوئی نہیں بھیجے گا۔ میں تو جا کر تختیاں پھینکوں گا کنوئیں میں۔ لڑکی اچھی بھلی سارے کام کرتی تھی۔ جس دِن سے یہ پڑھنے کا جھگڑا لے بیٹھی ہے۔ ہاتھ ہی نہیں لگاتی کام کو۔ بس پکڑا مکئی کی روٹی کا سا قاعدہ اور ایک کونے میں جا بیٹھی۔"

چھٹا بولا "بھائیو۔ بات کرنے سے دُور نکل جاتی ہے۔ ہم تو مُنہ کھول کر کچھ نہیں کہتے لیکن لوگوں سے کیا چھپا ہے۔ پالا سنگھ کو اور کس نے ...."

ایک اور بولا "رہنے دو جوان! اِن باتوں کو کیوں کھولتے ہو۔ اُس کی قید بھی تھوڑی ہی باقی رہ گئی ہے۔ اوّل تو شاید اپیل میں ہی بری ہو جائے۔ وہ خود آ کر سچ جھوٹ کا فیصلہ کرے گا۔ ہمیں کیا پڑی ہے۔"

اِس طرح کی باتیں اور کافی دیر ہوتی رہیں لیکن کسی نتیجے پر کوئی نہ پہنچ سکا کیونکہ گاؤں کا سرتاج پالا سنگھ اور اُس کے ساتھی جیل میں تھے۔

(۱۸)

پورے ڈیڑھ برس بیمار رہنے کے بعد جیوا سنگھ اپنی زندگی کا سفر ختم کر کے اِس دنیا سے کوچ کر گیا۔ گھر کا سارا بوجھ اب بچن سنگھ کے سر پر تھا۔ بچن سنگھ کی ماں اب صرف اُس کو دیکھ کر زندہ تھی کیونکہ اس کا اور کوئی بیٹا بیٹی نہیں تھا۔

اُدھر بالا سنگھ اور اُس کے ساتھی بھی قید کاٹ کر ایک ایک کر کے واپس آ گئے تھے اور ساتھ ہی بھائی دسوندھا سنگھ بھی۔ وہ جیل میں ہی سن چکے تھے کہ بچن سنگھ نے گوردوارے میں کوئی اور گرنتھی لا بٹھایا ہے۔ اِس لیے انھوں نے اپنی عزت اِسی میں سمجھی کہ گاؤں میں پاؤں بعد میں رکھیں گے اور اُس نئے گرنتھی کا بوریا بستر پہلے اُٹھوائیں گے۔ بیشک بھائی دسوندھا سنگھ کے بیان نے ہی اُنہیں قید کرایا تھا لیکن وہ سمجھتے تھے کہ بھائی جی نے یہ کام محض بے عقلی کی وجہ سے ہی کیا ہے۔ اِسی وجہ سے اُنھوں نے بھائی جی کا قصور معاف کر دیا تھا اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ بھائی جی ان کے کتنے کام آنے والی چیز ہیں۔ اس لیے انھوں نے بھائی جی کو دوبارہ بُلوا لیا۔

جس دِن بالا سنگھ جیل سے چھوٹ کر آیا اُس دن چند گھروں کو چھوڑ کر باقی سارے گاؤں نے بڑی گرم جوشی سے اُس کا سواگت کیا۔ خاص کر بھائی جی پر اُن کا اعتقاد اور بھائی جی کی عزت گاؤں والوں کی نظروں میں پہلے سے دس گنا بڑھ گئی تھی۔ سب کے مُنہ پر یہی بات تھی " دیکھ لیا نا۔ دیوتا سروپ بھائی جی کو بے گناہ پھنسا کر کیا پھل ملا؟ باپ مر گیا۔ خدا کے قہر سے ڈرنا چاہیے۔ لوگ بلا وجہ تو نہیں کہتے کہ غریب کی آہ بہت بُری ہوتی ہے۔"

گیانی جی اب لوگوں کو پھوٹی آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ یہاں تک کہ جو گھر تھوڑے بہت اُن کے حق میں تھے، وہ بھی خلاف ہو گئے اور کئی لوگوں نے اپنے لڑکے لڑکیوں کو گوردوارے کے سکول سے اٹھوا لیا۔

گیانی جی بھی اُداس ہو گئے۔ انھوں نے اِس جھگڑے میں سے نکل جانا ہی مناسب سمجھا اور آخر ایک دن وہ چلے گئے۔ بچن سنگھ کے کہنے پر بھی نہ رُکے۔ انھیں یقین ہو چکا تھا کہ معاملہ لڑائی فساد تک پہنچے گا اور نہ جانے اِس کا نتیجہ گاؤں کے لیے کتنا خطرناک ثابت ہو۔

بالا سنگھ کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ گیانی جی کو ہٹانے کے لیے شاید دو دو ہاتھ کرنے

پڑیں گے۔ لیکن ایسی نوبت نہ آئی۔ اور بھائی دسوندھا سنگھ جی آرام سے ہی گوردوارے میں آکر بیٹھ گئے۔

اس سے بھی زیادہ ایک اور بات اُن کو بُری لگی اور وہ یہ کہ گیانی جی نے آکر گوردوارے کی رونق اچھی خاصی بڑھادی تھی۔ اُنہوں نے سوچا کہ ہم اِس سے دُگنی رونق دکھا کر اُس کی کارگزاری کو مات دے دیں۔ اِس سے ان کا مطلب یہ بھی تھا کہ گاؤں کے جو تھوڑے بہت لوگ گیانی جی کے حق میں تھے اُن کو بھی کوئی شکایت نہ رہے۔

شری گورونانک دیوجی کا گورپُرب نزدیک ہی تھا۔ انھوں نے اِس موقعے کے لیے راگی جتھا بُلانے کا بھی انتظام کر لیا تاکہ گوردوارے میں اچھی رونق ہو جائے۔

بھائی جی نے آتے ہی یہ بات مشہور کر دی کہ بچن سنگھ نے ہی کہہ سُن کر اور حاکموں کو رشوت دے کر عدالت میں اس کا بیان اُلٹوا پلٹوا دیا تھا، جس کے نتیجے پر سب کو قید بھگتنی پڑی۔ اس سے جہاں بھائی جی پر گاؤں والوں کا اعتقاد بڑھ گیا وہاں لوگ بچن سنگھ کو لال پیلی آنکھیں دِکھانے لگے بلکہ اندر ہی اندر یہ کانا پھوسی بھی ہونے لگی کہ جتنی جلدی ہو سکے، بچن سنگھ کو برادری سے الگ کر دیا جائے کیونکہ اُس کا قلندر کی لڑکی سے میل جول دِن بدن بڑھ رہا ہے۔ وہ روز اُسے پڑھانے کے بہانے روڈو کی جھونپڑی میں جاتا ہے اور پہر پہر بھر وقت وہیں گزارتا ہے۔ اِس سلسلے میں کسی حد تک یہ فیصلہ ہوا کہ گورپُرب والے دن جب ساری برادری اکٹھی ہو گی تو اِس بات پر غور کرنے کے بعد کوئی آخری فیصلہ کیا جائے گا۔

اِدھر سُندری بھی اب پہلے والی سندری نہیں تھی۔ ان تھک پڑھائی اور گیانی جی اور بچن سنگھ کی صحبت نے اُس کی عقل کو اور بھی چمکا دِیا تھا اور اب وہ سِکھ دھرم کے اصول و ضابطہ، ادب اور اِس کی تاریخ سے اچھی طرح واقف ہو گئی تھی۔

بچن سنگھ کی ماں اگر پرانے خیالوں کی عورت تھی اور اس کی پڑوسنیں اور نمک مرچ لگا لگا کر بچن سنگھ کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سنا کر اُسے بھڑکانے کی کوشش کرتی تھیں لیکن بچن سنگھ اور گیانی جی کے سمجھانے پر اس کے دل پر ان کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔

اِدھر گورپُرب نزدیک آگیا اور اُدھر سُندری کے دل میں زبردست خواہش تھی، اس سُورگ کے سے نظارے کو دیکھنے کی۔ گیانی جی سے گوردھر کے کارنامے اور شہیدوں کی کہانیاں سُن سُن کر اُس کے دل میں گوردھر کے لیے پریم کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ لیکن جب وہ سوچتی کہ میں اس وقت کا نظارہ نہیں دیکھ سکوں گی تو اس کے دل کو ٹھیس سی لگتی۔ سب سے زیادہ ڈر اُس کے دل میں روڈو نے بٹھا دیا تھا۔ لیکن پھر بھی اُس کی یہ خواہش ویسی کی ویسی بنی رہی کہ کسی طرح ایک بار گورپُرب والے دن

سنگورو کے دربار میں ماتھا ٹیکنے کا موقعہ مل جائے۔ چوری سے یا اعلانیہ —!

گوربُرب میں ایک دن باقی تھا۔ گوردوارے میں دُھوم دھام سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ سُندری نے سنا تھا کہ کل صبح تڑکے راگیوں کا کیرتن ہوگا۔ اسے ساری رات نیند نہ آئی۔ سچ مچ بندریا کی صحبت کی وجہ اُس کی عادتیں بھی بندریا جیسی ہی ہوگئی تھیں۔ وہ کبھی سوچتی "تڑکے تڑکے مُنہ اندھیرے ہی جب گوردوارے کا دروازہ کھلے گا، لوگوں کی آنکھ بچا کر اندر چلی جاؤں گی اور آنگن میں جو بیری کا پیڑ ہے، اُس کی کسی گھنی ٹہنی پر چڑھ کر بیٹھ جاؤں گی۔ کبھی خیال کرتی۔ نہیں۔ اس طرح تو کوئی دیکھ لے گا اور پھر سنگورو کے دربار میں اونچی جگہ پر نہیں بیٹھنا چاہیئے؛ کوئی ایسا طریقہ ہونا چاہیے، جس سے کوئی دیکھے بھی نہیں اور میں نظارہ بھی دیکھ لوں!"

وہ ساری رات اِس طرح کی سوچ بچار میں رہی اور انہی سوچوں میں اس کی آنکھ لگ گئی۔

جب اُس کی نیند کُھلی تو باہر اس نے سفید روشنی دیکھی۔ وہ دل ہی دل میں خود بڑی شرمندگی محسوس کرنے لگی کہ ایسی بے خبر ہو کر کیوں سوئی کہ دن ہی چڑھ آیا۔

اب اس کے لیے وہاں ایک لمحہ رُکنا بھی مشکل ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ بابا روڈا ابھی تک خراٹے بھر رہا تھا۔ وہ دبے پاؤں جھونپڑی سے باہر نکلی اور سیدھی گوردوارے کی طرف ہولی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ دور سے ہی باجے اور طبلوں کی جوڑی کی آواز کے ساتھ شبدوں کی گونج اس کے کانوں میں پڑے گی۔ لیکن اس کا خیال غلط نکلا۔ گوردوارے کا دروازہ ابھی تک بند تھا۔ اسے جب یہ اندازہ ہوا کہ ابھی دن نہیں چڑھا ہے اور چاند کی چاندنی کی وجہ سے اُسے دھوکا ہوا ہے تو وہ بڑی خوش ہوئی۔

اب وہ کسی طرح اندر داخل ہونے کا ڈھنگ سوچنے لگی۔

اچانک ہی اُسے خیال آیا کہ گوردوارے کے جس کمرے میں گوروگرنتھ صاحب کا پرکاش ہوتا ہے، اُس کے ساتھ ایک بھوسے والی کوٹھڑی ہے، جو اکثر کُھلی پڑی رہتی ہے اور اس کا دروازہ گوروگرنتھ صاحب والے کمرے کی طرف کھلتا ہے۔ کمروں کا حلیہ اس نے کئی بار باہر سے یا آنگن میں سے دیکھ رکھا تھا۔

اب اُس کے لیے صرف آنگن والے دروازے کے راستے اندر جانے کا کام باقی تھا۔ چاند کی چاندنی اُس کے راستے میں رکاوٹ ڈال رہی تھی۔ وہ سوچتی ہوئی گوردوارے کے پچھلی طرف جا نکلی۔ جہاں اُس نے ایک کُھرلی (جانوروں کے چارہ کھانے کی جگہ) دیکھی۔ جو مقابلتاً اونچی بنی ہوئی تھی۔ وہ فوراً چھلانگ لگا کر کُھرلی پر چڑھ گئی اور ایک سوراخ میں پاؤں کا پنجہ پھنسا کر چھت پر جا چڑھی۔ کچے کمرے کی چھت کتنی اونچی

ہو سکتی تھی اور وہ بھی بندریا کو چڑھنا تھا۔
چھت پر پہنچ کر اس نے آنگن والی بیری کی ایک بڑی سی ٹہنی پکڑی اور اس کے ساتھ لٹک کر نیچے آنگن میں چھلانگ لگا دی اور پھر فوراً ہی بھوسے والے کمرے میں داخل ہو کر اس کے ایک کونے میں چھپ کر بیٹھ گئی۔ گورو گرنتھ صاحب والا کمرہ کھلا ہے یا نہیں، یہ دیکھنے کے لیے جب اس نے دروازے کو تھوڑا سا دھکیلا تو وہ کھل گیا۔ اُسے پتہ چلا کہ دروازہ گورو گرنتھ صاحب والے کمرے ہی میں کھلتا ہے۔ اندر بھوسے کا ڈھیر تھا اور دروازہ زور سے کھل گیا تھا۔ اس لیے بہت سا بھوسہ گورو گرنتھ صاحب والے کمرے میں چلا گیا۔
سندری کو بڑی فکر ہوئی لیکن اس نے ہمت نہ ہاری کیونکہ اس نے دیکھا کہ دری پر تین چار آدمی سو رہے تھے اور ان میں سے ابھی کوئی جاگا نہیں تھا، اس کے علاوہ اندر کچھ اندھیرا بھی تھا۔ صرف ایک سوراخ میں سے تھوڑی سی چاند کی چاندنی اندر آ رہی تھی۔ وہ پھر باہر نکلی اور ٹاٹ کا ایک ٹکڑا اٹھا لائی۔ اس پر بھوسہ ڈال ڈال کر وہ پیچھے پھینکنے لگی۔
تقریباً ایک گھنٹہ کی مسلسل محنت کے بعد اُس نے اپنے کھڑے ہونے کے لیے جگہ بنا لی۔ اور اس کی پچھلی طرف اُس کے سر تک بھوسے کا ڈھیر کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے دوسری طرف کا بھوسہ اُٹھا اُٹھا کر جگہ صاف کر لی اور خود اُسی طرح دروازہ بند کرنے کے بعد اُس کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئی۔ تبھی اُسے نیند آنی شروع ہو گئی۔
اس وقت بچن سنگھ کی سنائی ہوئی، گورو نانک جی کی زندگی کی کہانیاں اُسے ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں اور آہستہ آہستہ سارے نظارے اُس کی آنکھوں کے آگے یوں گھومنے لگے۔ جیسے انھیں سچ مچ میں دیکھ رہی ہو۔ آج کے دن اسی وقت گرو نانک دیو نے اوتار لیا تھا۔ اس تصور کا اصلی نظارہ اُس پر اس طرح ظاہر ہوا جیسے وہ سچ مچ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔ رائے بھوئے کی تلونڈی میں دھوم دھام ہے۔ کالو پٹواری کے گھر کروڑوں بجلیوں کی روشنی ہو رہی ہے اور سارے جہاں کی نباتات نے مل کر اُس جگہ کو مہکا دیا ہے۔ ماتا اور پتا کی گود میں اندھیرے دلوں کو جگمگانے والا اور ٹھنڈی کرنیں پیدا کرنے والا چاند چمک رہا ہے۔ وہ جدھر ایک نظر بھر کر دیکھتا ہے وہاں ایک انوکھی روشنی پیدا ہوتی ہے اور وہ جگہ ہری بھری ہو جاتی ہے۔
پھر اُس نے ننھے پریتم کو بچوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے دیکھا۔ پھر جنگلوں کے گھنے سائے میں سوتے اور سانپ کو سایہ کرتے دیکھا۔ تصور ہی تصور میں وہ بے بس سی ہو کر چرنوں میں گری اور آنسوؤں

سے داتا کے چرن دھوتے ہوئے عرض کرنے لگی "ہے پریتم! میری طرف بھی اپنی امرت بھری نظر کر اور مجھے بتا کہ مجھ بد قسمت سے وہ کون سی ایسی تقصیر ہو گئی ہے کہ میں تیرے چرنوں میں سر رکھنے کا بھی حق نہیں رکھتی۔ آہ میرے مالک! میں کتنی آنکھوں سے خود کو چھپا کر یہاں پہنچی ہوں۔ میرے دل کے مالک! تو اپنے ہمجولیوں کے ساتھ آنکھ مچولی بے شک کھیل لیکن مجھ کمزور میں اتنی طاقت نہیں کہ تجھے ڈھونڈ سکوں۔ میرے ساتھ آنکھ مچولی نہ کھیلا کر۔ مجھے اپنے پاس آنے سے نہ روک۔"

پھر اُس نے سنا۔ آسمان سے ایک آواز آئی۔ ایسے جیسے نقارے پر چوٹ لگتی ہے اور اس کے ساتھ ہی کسی میٹھے ساز سے رسیلی آواز نکلی جو ہر طرف گونج گئی۔ اس گونج کے پیدا ہوتے ہی آسمان کا سارا ماحول جیسے کسی انوکھی خوشبو سے مہک اُٹھا۔ پھر اُس نے دیکھا۔ وہی پریتم آسمان سے اُترتا آرہا ہے اور اب اُس کے ساتھ دو مورتیاں اور بھی ہیں۔ ایک دل کش گھاٹی پر جس کے آس پاس جنگلی پھولوں سے لدے ہوئے بوٹے مستی سے جھوم رہے تھے، پریتم ایک آسن پر بیٹھ گئے اور دائیں بائیں وہ ساتھی بھی۔

سپنے کی دنیا میں ہی سُندری نے پھر دوڑ کر اپنے پیارے کے چرن پکڑے اور آنسوؤں سے اُس کے چرن دھوتے ہوئے عرض کیا "میرے دل کے والی۔ اب نہ بچھڑنا۔ مجھے اپنے چرنوں کے پاس آنے سے نہ روکنا۔ روکنے والوں کو بھی روک دینا.... ہے داتا۔ میرا دل نہ توڑنا۔"

اُسے یوں معلوم ہوا جیسے آسمان کا والی اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتا ہوا کہہ رہا ہے "سندری! اہال (تجھے خوش کر دیا) تجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ تو کسی کے روکنے پر بھی میرے پاس آنے سے نہیں رُک سکتی۔ اُٹھ اور سُن ــــ،

اِس کے بعد سندری نے چرنوں سے سر اٹھایا۔ اس کے اندر باہر اس کے سارے وجود پر ایک عجیب سا نشہ طاری تھا۔ روم روم میں کسی انوکھے مزے کے جھرنے سے بہہ رہے تھے اور اس کے کانوں میں رومانی مٹھاس سے بھرے ہوئے لفظ گونج رہے تھے۔ جیسے سنسار کے راگ راگنیوں نے کسی عظیم سنگیت کی شکل اختیار کر لی ہو۔ یہ الفاظ اُس کے پریتم کے داہنی طرف بیٹھا مہاتما گا رہا تھا اُس کی رباب میں سے دل کو کھینچ لینے والی لَے نکل رہی تھی۔

"ہر امرت بھِنّے لوئینا من پریم رتنا رام راجے
من رام کسوٹی لائیا کنچن سو وِنّا
گورمکھ رنگ چلولیا۔ میرا من تن بھِنّا
جن نانک مسک جھکولیا سب جنم دھن دھنّا"

سندری کی آنکھیں کھُل گئیں اور اُس نے اپنے آپ کو بھوسے والے کمرے میں پایا۔ دروازے کی جھری میں سے اس نے دیکھا۔ راگی سکھوں نے "آسا دی وار" کا کیرتن شروع کر دیا تھا۔ پہلا چھکا (چھند) ختم کرنے کے بعد اب "وار سلوکاں نال محلے پہلے کے" اُچار رہے تھے۔

وہ وہیں چوکڑی مار کر بیٹھ گئی اور کیرتن کا امرت رس پینے لگی۔ اُس نے آج پہلی بار شری گورو گرنتھ صاحب کے درشن کیے تھے۔ لیکن آگے بڑھ کر ماتھا کیسے ٹیکے؟ اِسی خواہش نے اُسے ایسا بے چین کر رکھا تھا کہ نچلی ہو کر بیٹھ نہیں پا رہی تھی۔

جیسے جیسے کیرتن ہوتا گیا، سُندری کے دل میں جوش اور اُمنگ بڑھتی جاتی تھی۔ دن کافی چڑھ آیا تھا۔ وار کے آخر کے پانچ شلوک ہی باقی رہ گئے تھے کہ اِکا دُکا آدمی آنے شروع ہوئے۔ سُندری کا دل یہی چاہتا تھا کہ آج کا دن ایک برس لمبا ہو جائے اور اس کا من اسی طرح ستگورو کے چرنوں سے جُڑا رہے کہ اسے برہما وشنو بھی یہ امرت رس پینے سے ہٹا نہ سکیں۔

راگی سنگھ بیچارے بڑے مایوس ہو گئے۔ وار کا بھوگ پڑنے والا تھا (رسم ختم ہونے والی تھی)، لیکن ابھی تک سنگت نہیں پہنچی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ایسا ہی حال رہا تو اس بار گورپُرب اُن کے لیے سُوکھا ہی چلا جائے گا۔

ان میں سے ایک نے اُٹھ کر بھائی جی کے پاس جا کر کہا: "بھائی صاحب جی۔ بھوگ پڑنے والا ہے اور سنگت ابھی تک نہیں آئی۔"

بھائی جی جو مہاراج کی حضوری میں بیٹھے اونگھ رہے تھے بھوں چڑھا کر آنکھیں کھولتے ہوئے بولے: "کیا کہا ہے آن کر کر کے۔"

راگی سکھ نے پھر اپنی بات دہرائی تو بھائی صاحب بولے: "مہاراج یہ آن کر کر کے گاؤں کے لوگ جو ٹھہرے۔ اچھا میں جا کر بلاتا ہوں آن کر کر کے۔" اور وہ سنگت کو بلانے چلے گئے۔

راگی سکھ جان بُوجھ کر دیر کر رہے تھے کہ لوگ اکٹھے ہو جائیں تو سماپتی کی جائے۔ بھائی جی ایک بار گئے۔ دو بار گئے اور پھر تیسری بار گئے۔

دوپہر ہونے تک جب کڑاہ پرشاد کی خوشبو دور دور تک پھیلنی شروع ہو گئی تو گوردوارہ عورتوں مردوں اور بچوں سے بھر گیا۔

ابھی سنگتوں کو آئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ راگی سکھوں کو دائیں بائیں سے کہنیاں لگنی شروع ہو گئیں اور ان کے کانوں میں "جلدی بھوگ پاؤ۔ ہمیں کھیتوں کو بھی جانا ہے۔" کی آوازیں آنے لگیں۔

آخر وار کا بھوگ پڑا اور بھائی صاحب بڑے جوش سے اور خوش خوش ارداس کرنے کے لیے آگے آئے۔ آج کڑاہ پرشاد سے دیگ بھر رہی تھی۔ گیارہ روپے کا پرشاد تو پالا سنگھ اور اس کی پارٹی نے کروایا تھا اور پنچایت کا اس سے الگ تھا۔

"سکھ پڑھتے سُنتے۔ سربت لاہے وندے۔ جو آوے سو راضی جاوے۔ گورو نانک نام پڑھتی کلا۔ تیرے بھانے سربت کا بھلا۔" اس کے ساتھ ہی ساری سنگت نے ماتھا ٹیکا۔

اسی وقت بھوسے والے کمرے کا دروازہ دھڑے کھلنے کی آواز آئی اور ڈھیر کا ڈھیر بھوسہ کمرے میں آگرا۔ اس کے ساتھ ہی ایک لڑکی لڑکھڑاتی ہوئی سپاٹ آگری اور شری گورو گرنتھ صاحب کے حضور جہاں ماتھا ٹیکنے کی جگہ تھی، وہاں مُنہ کے بل لڑکی کا سر ٹکرایا اور وہ لگ بھگ بھوسے کے نیچے دب گئی۔

سب کا دھیان اُس طرف کھنچ گیا۔ حیرانی اور غصے سے اُن کا تن بدن بھڑک اُٹھا، جب انہوں نے دیکھا کہ وہ قلندر کی بیٹی ہے!

رب دے اور بندا سہے۔ لوگ ٹوٹ کر پڑ گئے اُس بد قسمت پر۔ کسی نے مکا، کسی نے گھونسا، کسی نے ٹانگ، کسی نے تھپیڑ۔ غرض کہ اتنا مارا کہ لڑکی زمین چاٹنے لگی۔

ایک تو ویسے ہی لوگ اُس کے سوال پر لڑائی کرنے لیے تلے بیٹھے تھے۔ اُوپر سے اندھیر یہ ہوا کہ اچھوت کے اندر آجانے سے کڑاہ پرشاد کی من بھر کی دیگ اب کوؤں اور کتوں کے قابل رہ گئی تھی!

پتہ نہیں ابھی اُنہوں نے اُسے کتنی سزا دینی تھی لیکن بیچ میں ہی کچھ لوگوں کو فکر پڑ گئی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مر ہی جائے۔ پہلے ہی ایک مقدمے سے گاؤں کی مشکل سے جان چھوٹی تھی اور ڈرتے تھے کہ اب کوئی اور مصیبت نہ پڑ جائے۔

لڑکی کو گھسیٹتے اور گالی گلوچ دیتے ہوئے وہ باہر آنگن میں لائے۔ لڑکی کے ناک مُنہ اور سر سے مسلسل خون بہہ رہا تھا، جس سے اس کے سارے کپڑے بھیگ گئے تھے۔ کچھ لوگوں نے تو یہ سوچا کہ بس اب اس لڑکی کا کام تمام ہے۔ بیچ بیچ میں کئی آدمی فکر مند ہو کر ایک دوسرے سے کانا پھوسی کر رہے تھے کہ اتنے میں بچن سنگھ بھی آ نکلا۔

بچن سنگھ کو دیکھ کر لوگوں کا غصہ اور بھی تیز ہو گیا۔ وہ تو پہلے سے ہی اُس پر برسنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈ رہے تھے لیکن اب تو ان کو بنی بنائی بات مل گئی تھی یہی نہیں کئی لوگوں کو تو پورا پورا شک تھا کہ یہ ساری کارستانی ـــ کارستانی ہی نہیں بد چلنی بچن سنگھ کی ہی ہے ـ!

بچن سنگھ کو اس وقت کسی سے کچھ پوچھنے کا خیال ہی نہیں تھا۔ سندری کو اس طرح لہو میں

سر سے پیر تک ڈوبی دیکھ کر اُس کا دل غم اور غصے سے بھر گیا۔ اُس کا خون کھولنے لگا اور وہ کڑکتی آواز میں بولا "اِس کو کیوں مارا گیا ہے۔ اِس نے کیا قصور کیا ہے؟"

اِس ایک سوال کے جواب میں درجنوں زبانیں چلنی شروع ہوگئیں "اس کا کام کیا تھا یہاں؟ اِس کو یہاں کون لایا ہے؟ ہم سب کچھ جان گئے ہیں دھرم کا ناش ہو گیا۔ کلیگ کے چمتکار نے ہمارا بیڑا غرق کر دیا۔ اتنے کڑاہ پرشاد کا کیا ہوگا؟"

شور مچاتے ہوئے لوگ سندری کی طرف سے ہٹ کر بچن سنگھ کے گرد ہو گئے اور اس کی طرف اس طرح دیکھنے لگے جیسے چوہے کو مارنے سے پہلے بلی اس کی طرف گھورتی ہے۔

لیکن بچن سنگھ کا غصہ ذرا بھی ٹھنڈا نہ ہوا۔ وہ غصے سے کانپتا ہوا بولا "یہ حد درجے کا ظلم ہے۔ یہ بیچاری۔ شبد کیرتن سننے کے لیے اگر محبت کی ماری آ ہی گئی تو کہاں کا اندھیر ہو گیا جو اس بے دردی سے اِسے مارا گیا ہے کہ ۔۔۔"

اس کا گلا بھر آیا اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

اُس کی باتوں کا سننے والوں پر ایسا ہی اثر ہوا جیسا شراب خانے میں بیٹھے شرابیوں پر وید منتر سنانے کا ہوتا ہے، وہ سب اِس طرح ہنس رہے تھے جیسے بچن سنگھ بے ہوشی میں بڑبڑا رہا ہو۔ ان میں سے ایک آگے ہو کر بولا "کیا کہا۔ شبد کیرتن سُننے آئی تھی؟ سردار جی۔ ایسی چال بازیاں کسی اور کو جا کر دکھاؤ۔"

دوسرا بولا "ایک تو چوری اور پھر سینہ زوری!"

تیسرے نے کہا "ہم تو پہلے ہی جانتے تھے کہ ایک نہ ایک دن یہ چاند چڑھ کر رہے گا۔ سو دن چور کے اور ایک دن شاہ کا۔ کہیں گناہ چھپانے سے چھپتا ہے؟"

چوتھے نے رائے زنی کی۔ "اِس بیچارے نے شاید سب کو گیانی جی سمجھ رکھا ہے جو اس کی ہر بات میں ہاں میں ہاں ملا دے گا۔ یہ نہیں جانتا کہ ہمارا بھائی بھی ہو تو یہاں گوردوارے میں ایسی شیطانی حرکتیں کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔"

بچن سنگھ کو اب تک اُن کی اِن اوٹ پٹانگ باتوں کی سمجھ نہیں آئی تھی لیکن اب وہ اُن کا یہ نیا رُخ دیکھ کر گھبرا سا گیا۔

اُس کا دھیان سندری کی طرف گیا۔ وہ ڈر گیا۔ شاید یہ بچ ہی نہ سکے۔ اس خیال سے اُس نے وہاں مزید رُکنا خطرناک سمجھا۔ آگے بڑھ کر اس نے سندری کو بازوؤں پر اُٹھا لیا اور یہ کہتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا "ظالمو، بے رحمو! لو میں اِسے اپنے گھر لیے جاتا ہوں۔ جاؤ مجھے برادری سے الگ کر دو۔

میں تم سب سے نفرت کرتا ہوں ۔"

سب نے "اوئے اوئے" کہہ کر قہقہہ لگا کر اُس کا مذاق اڑایا۔ اور ہنس ہنس کر دوہرے ہوتے گئے اور جو جس کے مُنہ میں آیا بکتا گیا۔

اُن سب کا غصہ لگ بھگ دور ہو گیا تھا۔ جب آدمی دیکھتا ہے کہ اس کا دشمن نئی مشکل میں پھنس رہا ہے تو اُس وقت اُس کو اپنا نقصان بھی نفع معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بچن سنگھ کے خلاف وہ جو کارروائی کرنا چاہتے تھے اب اس کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ اُن کا مطلب اپنے آپ ہی پورا ہو چکا تھا۔

سنگت پھر گوردوارے جا پہنچی۔ کڑاہ پرشاد انھوں نے سارا ہی اُٹھوا دیا اور مزید سامان منگوا کر پھر سے تیار کیا گیا۔ بھلا کہاں گیا یہ واہیگورو ہی جانے۔

دن کافی چڑھ آیا تھا۔ لوگ جانے کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔

اِس وقت نمبردار نہنا سنگھ کا چھوٹا لڑکا گوردوارے میں داخل ہوا۔ اُس کے پیچھے بلی ذات کا ایک کتے کا پلا بھی پونچھ ہلاتا اندر آ گیا۔ کتے نے جیسے ہی نمبردار کو دیکھا تو فوراً اس کی جھولی میں آ بیٹھا اور پونچھ ہلاتا ہوا اس کا مُنہ چاٹنے کے لیے مُنہ اُٹھا کر اُچھلنے لگا۔ شاید اُس کو کڑاہ پرشاد کی خوشبو آئی تھی۔ نمبردار اُس کی کمر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اور اس کا مُنہ پکڑ کر نیچے کرتے ہوئے اُس سے یوں لاڈ کرنے لگا۔ جیسے چھوٹے بچوں سے کیا جاتا ہے۔

پاس سے ہی جوالا سنگھ بازو بڑھا کر پلے کی کمر تھپکتا ہوا بولا "یہ سوغات کہاں سے لائے ہو نمبردار؟ کُتا تو بھئی کمال کا معلوم ہوتا ہے۔"

نمبردار جو پہلے ہی کتے کی تعریف سننے کے لیے تیار بیٹھا تھا بولا "ہاں جوالا سیاں۔ بڑی سپارشوں سے منگوایا ہے۔ تحصیلدار ٹیک چند سے باپو کی بڑی پرانی دوستی چلی آ رہی ہے۔ پچھلا مال اپھسر جب ولایت جانے لگا تھا تو اپنی کُتیا اُس کو دے گیا تھا۔ کتیا ابھی بیاہی بھی نہیں تھی کہ باپو نے پیشگی دے دی۔ پانچ چھ بار مجھے جانا پڑا۔ مزید پچیس روپے دیے۔ تب یہ ملا۔ جوالا سیاں۔ بڑا اصیل ذات کا کتا ہے۔ باپو بتاتا تھا کہ ایک بار تحصیل دار کی بھینس چوری ہو گئی تو اس کی ماں چور کی کھونٹی سے جا کر کھلوا لائی تھی۔"

کتے کے سر کو تھپکتا ہوا پاس سے دیال سنگھ بولا "کُتا زندہ رہا تو کسی دن شیر کا مقابلہ کرے گا۔ دیکھو کتنا تگڑا ہے۔"

نمبردار بولا "آدھ سیر پکا گوشت روز ملتا ہے اور دودھ جتنا چاہے پی لے۔ (اس کے مُنہ میں چار انگلیاں ڈال کر) دیکھو نا۔ ایسے چاہے کچھ کرو، دانتوں سے نہیں کاٹتا اور اگر کوئی غیر آ جائے

تو سارے گھر کو سر پر اُٹھا لیتا ہے۔ زنجیر تڑاتے ہوئے کہتا ہے بس مجھے چھوڑ دو تو میں اِسے پکڑ لوں ۔ !"

کڑاہ پرشاد ۔ دوبارہ تیار ہو کر آ گیا اور بٹنا شروع ہوا۔ نمبردار نے کتے کے حصے کا اُسے کِھلا کر اور پھر اپنے حصے میں سے بھی تین حصے اُسے کِھلا کر مشکل سے چوتھا حصہ خود کھایا۔

پرشاد بٹنے کے بعد راگی سکھوں کے لیے چندے کا سوال اُٹھا۔ نمبردار لدھا سنگھ اِس کام کے لیے چودھری سمجھا جاتا تھا اور اسی لیے اُسے سب سے آگے بِٹھایا جاتا تھا۔

بھائی جی نے سب سے پہلے اُٹھ کر کہا۔" خالصہ جی ! ۔ راگی سنگھوں نے آن کر کر کے بڑے پریم سے پرچار کیا ہے۔ اب آن کر کر کے اِن کے لیے زیادہ سے زیادہ روپے دے کر جنم سپھل کیجیے ۔"

سب کی نظر لدھا سنگھ پر ٹکی ہوئی تھی اور سب ایک دوسرے کے مُنہ کی طرف اِس لیے دیکھ رہے تھے کہ دیکھیں کیا دیتا ہے۔ کافی دیر تک " پہلے تم ۔ پہلے تم " ہوتا رہا۔ آخر لدھا سنگھ نے پگڑی کے پلو سے ایک اٹھنی کھول کر دی۔ یہ دیکھ کر راگی سنگھوں کے دل بیٹھ گئے۔ اِتنے میں دیوا سنگھ ترکھان جو پیچھے بیٹھا تھا، اٹھا اور ایک روپیہ دے کر بیٹھ گیا۔

یہ دیکھ کر نمبردار لدھا سنگھ کو سر سے پاؤں تک آگ لگ گئی کہ گاؤں کا نیچی ذات کا آدمی ہو کر ہم سے سبقت لے جانے کی کوشش کرے ؟ اس کا دل چاہتا تھا کہ اُٹھ کر ابھی اُس کی گت بنا دے لیکن پھر کچھ سوچ کر اس کام کو کسی اور وقت کے لیے اُٹھا رکھا۔

بابا کرم سنگھ بڑا سچا اور اکھڑ آدمی تھا۔ وہ سچی بات تڑ سے مُنہ پر مار دیتا تھا۔ جھٹ بول اُٹھا "واہ بھئی نمبردار! تم نے تو لٹیا ہی ڈبو دی ہے۔ دینے لگا تھا تو کچھ تو دیتا۔ بس ایک اٹھنی ؟ نہ دو ۔ نہ چار ۔ یہ دیکھ لے ۔ دیوا سنگھ نے چڑی جتنا روپیہ چھن چھن کرتا پھینک دیا ہے ۔"

پہلی چوٹ تو نمبردار کسی نہ کسی طرح برداشت کر گیا تھا لیکن اوپر سے ایک اور پڑ گئی ۔ صبر کی کوئی حد ہوتی ہے ۔ وہ آپے سے باہر ہو کر بولا " بابا کرمیاں ! تجھے پہلے بھی کئی بار سمجھایا ہے کہ بات کرتے وقت ذرا ہوش سے بات کیا کر۔ خود کو عقل نہ ہو تو آدمی کسی اور سے لے لے۔ تو بھی ہمارا دیکھا بھالا ہے کہ کتنے پانی میں ہے ۔ کیا بھول گیا جب دیالا بنیا تیرا بیل بچھڑا نیلام کروانے لگا تھا، تب تو میرے باپ کے پیروں میں پگڑی ڈال کر روتا تھا۔ اگر باپو اُس وقت بیچ میں نہ پڑتا تو تیرے جیسے ٹکے کے تین تین بک جاتے ۔"

بابا کرم سنگھ کے دونوں لڑکے بیٹھے تھے۔ باپ کی عزت اُترتے دیکھ کر بیلا سنگھ بولا " سُن اوئے نمبردارا ۔ مُنہ کو ذرا سنبھال کر رکھ ۔ یہ بھی نجو کمہار نہ سمجھ رکھنا کہ ایک تو اُس کے روپے چھین لیے اور اُلٹا اسی کو حوالات میں ڈلوا دیا تھا۔ اب تو کہہ لیا ہے ، اگر دوبارہ ہمارے باپ کا نام لیا تو ہم سا بُرا کوئی

نہ ہوگا۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔"

نمبردار بولنے ہی والا تھا کہ پاس سے اُس کا بھتیجہ نوجا سنگھ بولا "بس کراوئے بس کر۔ ٹوٹی ہوئی جوتی کی طرح پھیلتا نہ جا زیادہ۔ ذات کی چھپکلی اچھے شہتیر سے۔ جاؤ لگالو زور جتنا لگتا ہے۔ کہا ہے کہا ہے اور سو بار کہیں گے کسی ڈگالی دے کر) کا دیا نہیں کھاتے۔"

کرم سنگھ کا چھوٹا لڑکا کھیوا سنگھ بولا "ہاں جی۔ تمہیں ٹکے ٹکے کی باتیں کیوں نہ آئیں۔ بابا روٹی کے ٹکڑے کو ترستا مرگیا اور پوتے کے مزاج ہی نہیں ملتے ہیں۔"

نمبردار بولا "اوئے مزاج کوئی تیرے سر پڑیں ہمارے؟"

کرم سنگھ کا ایک اور حمایتی بول اٹھا "ہاں جی مزاج میں تیزی کیوں نہ ہو۔ کچھ اجڑے ہوئے ننہال کی کمائی مل گئی اور پھر بیٹیاں بیچ کر دولت سے گھر بھر لیا۔ پھر مزاج کیوں نہ ہو۔ وہ دن بھول گئے ہوں گے جب تینوں بھائی ڈاکے میں پکڑے گئے تھے اور باپ دروازے دروازے روتا پھرتا تھا، اگر اُس وقت ہم مدد کے لیے نہ آئے ہوتے تو بیگانوں نے آپ کی عورتوں کے لہنگے بھی نیلام کروادیے ہوتے۔"

"بس اوئے کتے۔"

"چپ اوئے، شہدے کی اولاد۔"

"پکڑو اوئے اِسے جاتا کہاں ہے؟"

"کون پیدا ہوا ہے مجھے ہاتھ لگانے والا۔"

"اچھا"

"ہاں"

"لے پھر"

"آ پھر"

بس پھر کس بات کی دیر تھی۔ دونوں طرف سے مہابھارت شروع ہوگئی۔ پل ہی پل میں گھمسان کا رن مچ گیا۔ خیر یہی گزری کہ تھا گوردوارہ جس کی وجہ سے لاٹھی نیزے کسی کے پاس نہیں تھے۔ نہیں تو نہ معلوم آج کتنوں کے خون ہو جاتے۔ بیشک راگی سنگھوں کے باجوں اور سازوں نے کسی حد تک ہتھیاروں کا کام دیا لیکن وہ زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے۔ جس جس کے سر میں لگے، سر بعد میں پھٹے، سازوں کے انجر پنجر پہلے ڈھیلے ہوگئے۔

بھائی صاحب تو بپک کر تخت پوش کے نیچے جا چھپے اور راگی سنگھ جان بچی سولاکھوں پائے والی بھینٹ لے ننگے پاؤں جو بھاگے تو سٹیشن پر جاکر ہی دم لیا۔

شام ہوتے ہوتے تھانے سے پولس بھی آگئی اور سب چھوٹوں بڑوں کو آگے ہانک کرلے گئی۔

آخر نتیجہ کیا ہوا؟ وہی جو ہوا کرتا ہے چند دنوں میں ہی گاؤں کی دولت کچھ وکیلوں کی جیبوں میں، کچہری کے دفتروں میں اور کچھ پولیس کے جبڑوں کے نیچے چلی گئی۔

(۱۹)

بچن سنگھ سندری کو لے تو آیا لیکن یہ کام اُس کے لیے آستین کا سانپ سا بن گیا۔ سب سے پہلے تو اس کی ماں نے ہی جب یہ تماشہ دیکھا تو وہ جو پہلے ہی سندری کے نام سے ہی عاجز تھی، اس کو گھر میں آئی دیکھ کر اس قدر گھبرائی کہ اس کے ہوش اُڑ گئے۔ اس کے لیے وہ بڑا مشکل وقت تھا۔ بچن سنگھ سے پہلے ہی کچھ کہنے کی ہمت نہیں تھی اور اب یہ قلندروں کی لڑکی جس سے بچن سنگھ کا پیچھا چھڑانے کے لیے وہ پہلے ہی طرح طرح کے طریقے سوچ رہی تھی اب اُس کے گھر میں ہی آگئی تھی۔

اِس کے علاوہ بچن سنگھ کی اِس حرکت کا گاؤں کے گھر گھر میں چرچا تھا اور نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے اُن ماں بیٹوں کے ساتھ بولنا چالنا، ملنا جلنا قریب قریب بند کر دیا۔

بچن سنگھ اس بات سے بے خبر نہیں تھا۔ وہ ماں کا دکھ بھی سمجھتا تھا اور اِس کے ساتھ ہی یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ گاؤں والے اب کس حد تک پہنچیں گے۔ لیکن وہ سب کچھ جانتا ہوا بھی سندری کو گھر لے ہی آیا اور آتے ہی ایک نائی کو بُلوا کر اُس کی مرہم پٹی شروع کرادی۔ اُس نے روڈو کو بھی ساری بات جاکر بتائی اور اس کو بھی اپنے ساتھ لے آیا۔

روڈو نے جب آکر سندری کی حالت دیکھی تو اس کو غش سا آگیا ...... پھر اسے خیال آیا کہ بچن سنگھ تو پہلے ہی ہمارے لیے سارے جہاں کی تہمتوں کا بوجھ اپنے سر پر اٹھائے پھرتا ہے، اب تو پتہ نہیں اِس جرم کے لیے اِس کو برادری کی طرف سے کیا سزا بھگتنی ہوگی۔ وہ بچن سنگھ کے پاؤں پر گر پڑا اور اُس کا دل سے شکر گزار ہوتے ہوئے سندری کو اِس بے ہوشی کی حالت میں اپنے گھر لے جانے کی اجازت مانگنے لگا۔

بے شک وہ اِس حالت میں دل سے سندری کو گھر سے جانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا

کہ جس طرح کا علاج معالجہ اس کا یہاں ہو رہا ہے ویسا جھونپڑی میں جاکر ہرگز نہیں ہوگا بلکہ وہاں تو معمولی دوا دارو کی بھی امید نہیں۔ لیکن پھر بھی اس نے بچن سنگھ کی عزت خطرے میں ڈالنے کے بجائے سندری کی جان کو ہی خطرے میں ڈالنے کو ترجیح دی۔ لیکن اُس کے ہزار منت کرنے پر بھی بچن سنگھ رضامند نہ ہُوا۔

یہ تو فیصلہ ہو گیا کہ سندری جب تک تندرست نہ ہو جائے، بچن سنگھ کے گھر میں ہی رہے گی۔ لیکن روڈو کو ایک اور مشکل سامنے دکھائی دے رہی تھی یعنی یہ کہ وہ سندری سے الگ نہیں رہ سکتا تھا۔ بے شک اُسے اِس بات کا پورا بھروسہ تھا کہ سندری کی تیمارداری میں کوئی کمی نہیں ہوگی لیکن پیار کا بندھن اسے مجبور کئے ہوئے تھا۔ آخر سینے پر پتھر رکھ کر اُس نے کچھ دنوں کے لیے سندری سے بچھڑنے کے لیے خود کو تیار کر ہی لیا۔

اِس کے بعد وُہ دو تین دن سندری کو دیکھنے جاتا رہا لیکن یہ سودا اُس کو اتنا مہنگا پڑتا تھا کہ ایک دو دن بعد ہی وہ جانے سے پیچھے ہٹ گیا۔ جب وہ گلیوں میں سے گزرتا تو لوگوں کی چھیڑ چھاڑ، اُلٹے سیدھے بول اس کا ناک میں دم کر دیتے تھے۔

اِدھر بچن سنگھ کا بھی یہی حال تھا لیکن اُس کے مصمم ارادے نے اُسے اپنے مقصد سے دُور نہ ہونے دیا۔ قدم قدم پر لوگوں کے طنز کرنے اور ٹوکنے پر بھی اُس کی ثابت قدمی میں فرق نہ پڑا، اور وہ سرگرمی سے سُندری کا علاج کراتا رہا۔

لگاتار دو دن سُندری بے ہوش رہی۔ بیچ بیچ میں کسی وقت وہ تھوڑی سی آنکھ کھولتی تھی لیکن پھر بند کر لیتی تھی۔ تیسری رات کو تقریباً نو بجے جب بابا روڈو بھی لوگوں کی نظروں سے خود کو چھپاتا ہوا سندری کے سرہانے آکر بیٹھا تھا، سندری نے کروٹ بدلی۔ آج دن کو بھی وہ تین چار بار اسی طرح ہلی جلی تھی اور کچھ بڑبڑاتی رہی تھی۔

آہستہ آہستہ سندری کی آنکھوں سے پلکیں اوپر اُٹھیں اور وُہ اپنے ارد گرد کی چیزوں کو غور سے دیکھنے لگی۔ روڈو کی جان میں جان آئی۔ اور وہ سندری کے ماتھے پر ہاتھ پھیرتا ہوا بھرے ہوئے گلے سے بولا "سندرو"

سندری مدھم سی آواز میں بولی "ہاں بابا"

"بیٹا میری طرف دیکھ"

سندری نے کروٹ بدلی اور اُس نے اپنے سرہانے بیٹھے اپنے پالنے والے باپ کو دیکھا۔ سندری نے دونوں بازو اس کی طرف پھیلا دیے اور روڈو نے اپنا سر آگے کیا۔ گلے میں ہاتھ ڈال کر سندری پھر آہستہ سے بولی "بابا میں کہاں ہوں؟"

UNIVERSITY ... 22 JUL 1975

"بیٹا تو اپنے گھر میں ہے"۔

"نہیں بابا! یہ تو ہمارا گھر نہیں۔ ہمارے گھر میں تو چارپائی کوئی نہیں تھی۔" اور وہ پھر گھر کی ہر ایک چیز کی طرف حیرت کی نظر سے دیکھنے لگی۔ پھر اُسے معلوم ہوا کہ اس کے سر ماتھے اور ٹھوڑی پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔

وہ پھر ہاتھ سے روڈو کا سر ٹٹولتی ہوئی بولی "بابا۔ مجھے یہاں کون ......" اور وہ چپ ہو گئی۔ اُسے تو وہیں سارے سوالوں کا جواب مل گیا تھا۔ اس دن کی ساری بیتی باتیں اسے یاد آگئیں اور وہ پھر بولی "بابا میں بے ہوش ہو گئی تھی؟"

"ہاں بیٹا"۔

"چلو نا، بابا اب گھر چلیں"

"چلیں گے بیٹے تو ذرا ٹھیک ہو جا"۔

"میں تو بابا اچھی بھلی ہوں"۔

وہ آہستہ آہستہ سے اُٹھ کر چارپائی پر بیٹھنے لگی۔ اِس وقت رات کافی جا چکی تھی۔ روڈو نے اسے سہارا دے کر پھر چارپائی پر لِٹا دیا اور پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا "بیٹی لیٹ جا۔ سویرے تڑکے میں تجھے لے چلوں گا"۔

بچن سنگھ بھی پاس ہی بیٹھا تھا۔ روڈو نے بڑی عاجزی سے ہاتھ جوڑ کر اس سے کہا "سردار جی سُندری ہوش میں آگئی ہے! لیجیے۔ اب میں چلتا ہوں۔ سویرے تڑکے آؤں گا"۔

بچن سنگھ نے کہا "کوئی فکر نہ کیجیے۔ آپ جایئے"۔

سندری کی پھر آنکھ لگ گئی تھی اور روڈو ایک بار پھر محبت بھری نظر سے اس کے چہرے کو دیکھ کر اور چھڑی پکڑ کر دروازے سے باہر چلا گیا۔

اُس کے جانے کے آدھ گھنٹے بعد سندری نے پھر کروٹ بدلی۔ اُس نے پانی مانگا۔ بچن سنگھ پاس ہی بیٹھا ہوا تھا، اُس نے پانی لا کر گلاس اس کے منہ سے لگا دیا۔

بچن سنگھ کی طرف وہ کافی دیر دیکھتی رہی اور پھر بولی "مجھے یہاں آپ لائے تھے؟"

بچن سنگھ نے 'ہاں' کہہ کر بستر کو ٹھیک کرتے ہوئے کہا "سندری کوئی فکر نہ کر۔ اب تو اچھی ہو گئی ہے۔ ابھی زیادہ ہلنا جلنا نہیں چاہیئے۔ نہ ہی زیادہ بات چیت کر ــــ"

چنچل سُندری کو بھلا کس طرح چین پڑے۔ وہ ذرا شوخی سے بولی "نہیں میں تو اچھی بھلی ہوں"۔

اور پھر وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو الٹا سیدھا کر کے دیکھنے لگی، جن کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا ہو گیا تھا۔ پھر بولی "یہاں مجھے آپ لائے تھے؟"

"ہاں"

"کیوں؟"

"بے ہوشی کی حالت میں اٹھا کر"

"اور آپ نے مجھے چھو کر ...."

"تجھے چھونے میں کوئی حرج تھا؟"

"ہم نیچی ذات کے جو ہیں"

"نہیں میری نظر میں تو دنیا کی ساری ذاتوں سے اونچی ہے۔ سندری میں تجھے نیچ نہیں سمجھتا"

"آپ مجھے نیچ نہیں سمجھتے"

"نہیں"

"پھر کیا سمجھتے ہیں؟"

"اپنے جیسی۔ خیر ان باتوں کو رہنے دے۔ پہلے یہ بتا کہ اس دن گوردوارے کس طرح چلی گئی تھی؟"

جو بات وہ سننا نہیں چاہتی تھی، بچن سنگھ کے منہ سے وہی بات سن کر بہت گھبرائی۔ وہ پہلے ہی دل میں پچھتا رہی تھی دکھی ہو رہی تھی کہ وہ اس دن گوردوارے کیوں گئی — اپنی حماقت کی وجہ سے چلی گئی تھی۔ اس لیے تو گوروبابے نے غلطی کی سزا دی اور یہ حالت ہوئی۔ وہ شرمندہ سی ہو کر بولی "مجھ سے بھول ہو گئی تھی"

"بھول — نہیں سندری۔ مجھے تیرے جانے پر تو اعتراض نہیں۔ میں تو پوچھتا ہوں کہ وہاں پہنچی کس طرح؟ تجھے کسی نے منع نہیں کیا؟"

سندری کو کچھ حوصلہ ہوا۔ اور اُس نے اس رات کا سارا حال سنایا۔ پھر یہ بھی بتایا "راگی کیرتن کر رہے تھے اور میں دروازے کے اندر کھڑی سن رہی تھی۔ پھر جب ارداس ہونے لگی تو میں بھی ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ جیسے ہی ارداس ختم ہوئی۔ مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ میں دروازے کے پاس ہی کھڑی ہوں۔ اُسی طرح ماتھا ٹیکنے کے لیے جھکنے لگی تو میرے سر کے معمولی سے ٹکراؤ سے دروازہ اچانک ہی کھل گیا اور اس کے ساتھ پیچھے سے بھوسے کا انبار جو نیچے سے بھوسہ اُٹھا لینے کی وجہ سے اوپر سے جھکا ہوا تھا۔ مجھ پر آگرا اور میں گورو گرنتھ صاحب والے کمرے میں جا کر گر پڑی اور جس جگہ میں ماتھا ٹیکنا چاہتی تھی، میرا ماتھا ٹھیک اُسی جگہ پر جا کر لگا۔ گورو صاحب جی نے میری ماتھا ٹیکنے کی خواہش تو پوری کر دی لیکن اس کے ساتھ ہی میرے

ڈھیٹ پن کی سزا بھی مجھے دے دی۔"

سُندری کے اعتقاد اور اس کی مشکل ترین قربانی اور اتنے وشواس کو دیکھ کر بچن سنگھ کا دل اس کے لیے پیار سے لبریز ہوگیا۔ اُس نے احترام سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"سُندری تو عظیم ہے۔ میرے دل میں تیرے لیے بڑی عزت ہے۔"

سُندری کو آج تک یہی خیال تھا کہ دنیا میں ایک بوڑھے قلندر اور دوسری بندریا کے علاوہ اس سے کوئی پیار نہیں کرتا۔ بلکہ یہ کہ ساری دنیا اس سے نفرت کرتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ محبت کی اہمیت سے وہ اب تک قریب قریب انجان تھی۔ "بچن سنگھ ایک اونچے خاندان سے ہوتے ہوئے بھی مجھ سے پیار کرتا ہے۔" یہ محسوس کر کے سندری کے دل میں ایک نئی خوشی، نئی اُمنگ کا دخل ہوگیا۔ وہ چودہ پندرہ سال کی لڑکی تھی۔ پریم کی قیمت نہیں جانتی تھی لیکن پریم کی قسم تو جان سکتی تھی۔

بچن سنگھ اپنی جان کی پرواہ نہ کرتا ہوا سندری کا علاج کر رہا تھا۔ سندری کے زخم بہت جلد اچھے ہونے لگے۔ جلدی اچھے ہونے کی وجہ دوا کی خوبی تھی یا بچن سنگھ کی پاک محبت — کہا نہیں جاسکتا۔

جیسے جیسے سندری صحت مند ہوتی گئی۔ اس کے دل میں اُس فرشتے کے لیے جگہ بنتی گئی، جو اُس کی خاطر سارے گاؤں کی قہر آلود نظروں کا شکار بنا ہوا تھا۔ دوسری طرف بچن سنگھ بھی جب دیکھتا کہ پندرہ برس کی مٹیار کے سینے میں قدرت نے کتنا نرم، پاک اور قیمتی دل رکھ دیا ہے تو وہ لمحہ بہ لمحہ سندری کی طرف کھنچا چلا جاتا تھا۔

عورت کا دل اگر کسی وقت پتھر سا سخت ہو جاتا ہے تو کسی دوسرے وقت وہی دل پانی بن کر بہہ نکلتا ہے۔ سدا کور پہلے تو اس قلندر کی لڑکی کے بارے میں نفرت کا جذبہ رکھتی تھی لیکن جس دن سے بچن سنگھ سندری کو زخمی حالت میں اُٹھا کر گھر لایا اور بچن سنگھ کی زبانی اُس نے سندری کی گوردوارے والی کہانی سُنی اُسی دن سے سندری کے لیے اس کے دل میں پیار امنڈ پڑا تھا، اگرچہ وہ بھی سماج کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا دیکھ رہی تھی اور اس کے ڈر سے اس کا اپنا خون بھی خشک ہو رہا تھا۔

سندری کا پتلا گورا اور سڈول جسم اُس کی چنچل لیکن معنی سے بھرپور آنکھیں اور اس کا بھولا بھالا ہنس مکھ چہرہ دیکھ کر کوئی بھی، چاہے عورت ہو یا مرد، سندری سے نفرت نہیں کر سکتا تھا؟

پندرہ دن بیت گئے۔ سندری اب تقریباً صحت مند تھی۔ اُس کے زخم بھر چکے تھے۔ ماتھے کا زخم کچھ گہرا تھا جس کی وجہ سے اس کی پٹی کھُلنے میں ابھی دو تین دن کی دیر تھی۔

بچن سنگھ کو سندری کے زخم کی بہت فکر تھی اس وجہ سے نہیں کہ زخم گہرا تھا بلکہ اس لیے کہ اس کا نشان سندری کی خوبصورتی میں فرق نہ ڈال دے!

لیکن اِس کے برعکس جس دن پٹی کھلی اُس کی حیرانی کی حد نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ اس آدھے چاند جیسے زخم کے نشان نے سندری کے حسن کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ جیسے اُس کا سارا حُسن بچن سنگھ کو اسی زخم کے نشان میں ہی دکھائی دے رہا تھا۔

رات کے دس بجے کا وقت تھا۔ سندری کی چارپائی آنگن میں بنے ہوئے چھوٹے سے کمرے میں تھی اور سدا کور اور بچن سنگھ کی پچھلے برآمدے میں۔ سدا کور کام کاج سے فرصت پا کر سو گئی تھی۔

آج سندری بالکل صحت مند تھی۔ وہ چارپائی پر لیٹی کسی گہری سوچ میں غرق تھی اور کان اُس کے دروازے کی طرف لگے شاید کسی آواز کے انتظار میں تھے۔ کل چونکہ اُسے اپنی جھونپڑی میں چلے جانا تھا اس لیے آج وہ بچن سنگھ سے دل کھول کر باتیں کرنی چاہتی تھی۔ کیا باتیں کرنی چاہتی تھی؟ اِس کا اُسے پتہ نہیں تھا۔ وہ کچھ ایسا محسوس کر رہی تھی کہ بچن سنگھ سے بچھڑنا اس کے لیے جسم سے روح کے بچھڑنے کے برابر ہوگا۔

بچن سنگھ ابھی تک کیوں نہیں آیا؟ خیر ہو گورو کرے! وہ ذرا سی آہٹ پر بھی دروازے کی طرف دیکھنے لگ جاتی تھی۔ سدا کور کو کسی بات کی فکر نہیں تھی کیونکہ وہ بچن سنگھ کی عادت سے واقف تھی کہ وہ کبھی کبھی آدھی رات کو بھی گھر لوٹا کرتا تھا۔

آہستہ آہستہ گیارہ بج گئے۔ سندری سے لیٹا نہ جا سکا۔ بیٹھا بھی نہ گیا۔ اُٹھ کر آنگن میں ٹہلنے لگی۔ وہ بچن سنگھ سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ جو جو باتیں سوچ رہی تھی اُن کی تعداد شاید اتنی زیادہ تھی کہ اسے فکر تھی کہ وہ کیا سب یاد رہ سکیں گی؟

اِسی وقت دروازہ کھٹکھٹایا گیا اس نے جا کر دروازہ کھولا اور بچن سنگھ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اندر آیا۔

بچن سنگھ کو دیکھتے ہی سندری کے چہرے پر ایک عجیب طرح کی بچوں کی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اُس نے پوچھا "آپ آج اتنی دیر لگا کر آئے ہیں؟"

بچن سنگھ فوراً جواب نہ دے سکا اور جا کر سندری کی چارپائی کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ پیچھے پیچھے سندری بھی جا کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔

اِس وقت کچھ تیز ہوا ہونے کی وجہ سے بچن سنگھ نے محسوس کیا، جیسے سندری کو سردی لگ رہی ہے۔

اس کے سوال کا جواب دینے سے پہلے بچن سنگھ نے کہا "سندری! شاید تجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے چل بیٹھک میں تیری چارپائی بچھا دوں۔ ساتھ ہی اس نے سندری کا ہاتھ پکڑ کر اُسے چارپائی سے اُٹھا دیا۔ سندری کا ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔

"ہوں! تو تم ٹھنڈ میں پھرتی رہی ہو سندری؟ کیا پھر بیمار ہونے کا ارادہ تھا؟" کہہ کر وہ چارپائی بیٹھک میں اُٹھا کر لے گیا۔ اِس کے بعد بستر اور کرسی۔

اُسے بٹھا کر اور رضائی اُوڑھا کر بچن سنگھ نے غصے سے کہا "اس طرح تو پھر بیمار ہو جاؤ گی۔"

سندری نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔ جب بچن سنگھ نے اس کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا "کیا بات ہے سندری؟" تو سندری کی آنکھوں میں بھرے ہوئے آنسو چھلک پڑے۔

اپنے کڑوے بولنے پر بچن سنگھ کو پچھتاوا ہوا۔ وہ کرسی سے اُٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا اور سندری کے دونوں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں دبا کر کہنے لگا "سندری۔ میری بات بری لگی ہے؟"

سندری اس وقت کہاں تھی۔ کسی سپنے یا تصور کے سنہری دیش میں "بچن سنگھ کو اس کی کتنی فکر ہے۔ کتنی محبت اور کتنا پیار ہے جو معمولی ٹھنڈا ہاتھ دیکھ کر ہی گھبرا گیا ہے۔ اوہ! میں کتنی خوش قسمت —— نہیں نہیں بد قسمت ....!"

اس طرح کے خیالات سندری کے ذہن پر چھائے ہوئے تھے۔ بچن سنگھ کے جواب میں بولنے کے بجائے وہ چھلک پڑی۔

بچن سنگھ نے اُس کے ہاتھوں کو اور دبایا اور پھر بولا "سندری" اِس کے بعد اسے کیا کہنا ہے اِس کا اُسے ہوش نہیں تھا۔ وہ کسی انوکھے نشے میں ڈوب چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سندری کے ہاتھوں کو ہی ذرا اور دبا سکا۔ بس۔

سندری کی آنکھوں کے سامنے بچن سنگھ موجود ہوتا ہوا بھی کچھ دیر کے لیے جیسے اُسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اُسے دکھائی دے رہا تھا، اپنی جھونپڑی میں پڑا ہوا اس کا خالی خالی جسم۔ بچن سنگھ کے بغیر وہ خالی ہی ہوگی۔ اور شاید صبح کا سورج چڑھتے ہی، کیونکہ بابے روڈو نے آج کہلا بھیجا تھا:۔ "کل سُندری کو بھیج دینا۔"

وہ محسوس کر رہی تھی اپنے اندر کی کمی کو۔ کمزوری کو اسے ایسا لگ رہا تھا، جیسے بچن سنگھ اُس کی مستقبل کی زندگی میں داخل ہو کر اس طرح گھُل مِل گیا ہے کہ علیحدہ کرنے سے بھی الگ نہیں کیا جا سکے گا اور اگر بچھڑ ہی گیا تو شاید وہ زندہ نہیں رہ سکے گی —— !

"کیا یہ فضول باتیں بچن سنگھ پر ظاہر کرنے والی ہیں؟" سندری ابھی انہی خیالات میں غرق تھی کہ اُسے اپنے دبے ہوئے ہاتھوں میں سے امرت کی ندی بہتی ہوئی محسوس ہوئی۔ جو سارے جسم میں جذب ہو رہی تھی۔ ساتھ ہی اس کے کانوں میں آواز آئی:۔ "میری سندراں تو بولتی کیوں نہیں مجھے تو ابھی

تم سے بہت سی باتیں کرنی تھیں "۔

"سندری" یا زیادہ پیار کے لہجے میں "سندراں" تو وہ پہلے ہی بچن سنگھ کے منہ سنتی رہی تھی لیکن آج اس میں جو نیا اضافہ ہوا اُس نے سندری کے دل کو تازہ پھول کی طرح کھلا دیا۔ اس میں سرور بھر دیا۔ یہ لفظ تھا "میری"۔

اُس نے سر اُٹھا کر بچن سنگھ کی طرف دیکھا۔ ساتھ ہی دیکھا، اُس کی آنکھوں میں، جن میں بہت ہی سنجیدہ اور کچھ بڑا معنی خیز سا عنوان لکھا ہوا محسوس ہوا۔ سندری اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس عنوان کو پڑھنے لگی۔ لیکن پڑھتے پڑھتے اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ بچن سنگھ کی آنکھیں پڑھ رہی ہے یا اپنی۔

اِس مضمون کا عنوان تھا "محبت"! کافی دیر تک یہ "محبت" جاری رہی۔ بچن سنگھ نے جب اپنی کلائی کی گھڑی کی طرف دیکھا تو وہ سوچنے لگا "یہ ڈیڑھ گھنٹہ کب گزر گیا؟" گھڑی میں ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔

آخر یہ خاموش کہانی ختم ہوئی۔ اور بچن سنگھ نے دوبارہ اپنی بات کو دہرایا۔

"سُندراں۔ مجھے آج تیرے ساتھ بہت سی باتیں کرنی تھیں"۔

"کرنی تھیں"۔ سُندراں نے مسکراتے ہوئے کہا "اور اب نہیں کرنیں کیا؟"

"رات بہت چلی گئی ہے سُندری"۔

"اچھا اگر آپ کو نیند آتی ہے تو ......"

"مجھے تو نہیں آرہی۔ لیکن تیری نیند کی فکر ہے"۔

"میری نیند کی۔ مجھے تو نیند آنی ہی نہیں آج"

"آنی کیوں نہیں آج"۔

سُندری کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

بچن سنگھ نے پھر کہا "سندری"۔

"ہاں جی"۔

"تم چلی جاؤ گی"۔

سُندری کچھ نہ بولی۔ صرف ہاتھ کی پہلی انگلی کو دانتوں کے نیچے آہستہ آہستہ دباتی رہی۔

"سُندری۔ اگر تجھے چلی جانا تھا تو آئی کیوں تھی ؟"

سُندری ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

بچن سنگھ نے کہا "سندری تو نے میری زندگی میں آبِ حیات بھر دیا ہے۔"

وہ پھر بھی چپ رہی۔ چپ ہوتے ہوئے بھی وہ بچن سنگھ کی ساری باتوں کا جواب دے رہی تھی۔ لیکن زبان سے نہیں، چہرے کے تاثرات سے۔ زبان سے بھی وہ جواب دینا چاہتی تھی لیکن نہیں دے سکی بچن سنگھ کی بات وہ سمجھ سکتی تھی، سمجھ رہی تھی لیکن اپنی زبان میں وہ نہیں سمجھا سکتی تھی۔ یا یہ کہہ لیجیے کہ اپنے محسوسات بتانے کے لیے زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ وہ خاموش تھی!

بچن سنگھ نے پھر پوچھا "سندری! تم نہیں بولو گی کیا؟ اچھا تو میں جاتا ہوں" اور وہ چارپائی پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

سُندری نے اُس کی قمیص پکڑ لی اور بٹھانے کی کوشش کرتی ہوئی بولی "آپ آج اتنی دیر سے کیوں آئے؟"

جو سُندری خود ہی بچن سنگھ سے باتیں کرنے کے لیے بے چین تھی وہی جب موقعہ آیا تو باتوں کا رُخ پلٹ کر اس موضوع کو ہی چھوڑنا چاہنے لگی۔ اسی وجہ سے اُس نے بچن سنگھ کی باتوں کا جواب نہ دیتے ہوئے اور ہی بات شروع کر دی "آج آپ دیر سے کیوں آئے؟"

اصل میں سُندری بچن سنگھ کے مُنہ سے اُسی قسم کی باتیں سن رہی تھی، جس طرح کی وہ خود اس سے کہنا چاہتی تھی۔ لیکن قدرت نے عورت کا دل کس قدر کشادہ بنایا ہے، اُسے کتنا زبردست برداشت کا مادہ دیا ہے کہ وہ سمندر سے گہرے معنی اور پہاڑوں سے اٹل خیالات کو اپنے سینے کے چھوٹے سے کوزہ میں بند کر کے رکھ سکتی ہے!

صرف اس خیال سے کہ اُس کا اور بچن سنگھ کا پیار بے جوڑ اور ناممکن ہے، سندری نے اپنی زبان پر مہر لگالی اور دل کے نہ رکنے والے طوفان کو گلے سے اونچا آنے سے روکے رکھا۔

سندری نے چاہے دیر سے آنے والا سوال اس لیے کیا تھا کہ بات چیت کا موضوع بدل جائے لیکن بچن سنگھ اِس سلسلے کو پھر وہیں لے آیا۔ اُس نے پھر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا "دیر لگا کر آنے کی وجہ بھی سندری تم ہی ہو۔ شام کو روٹی کھا کر سیدھا کنوئیں پر گیا تھا اور وہاں ایسا تمہارے خیالوں میں ڈوبا کہ دس بج گئے۔"

"میرے خیالوں میں؟"

"ہاں سُندراں تیرے ہی خیالوں میں "
"یہی سوچتے ہوں گے کہ سندری کو لا کر کیا مصیبت گلے ڈال لی ؟ "
"نہیں یہ نہیں ! "
"تو پھر ؟ "
"میں سوچتا تھا۔ کل تم چلی جاؤ گی ! "
"تو پھر "
"سندری میں ... "
"بتائیے ۔ جھجکتے کیوں ہیں ؟ "
"میں تم سے الگ نہیں رہ سکتا۔ میرا دل ۔۔ "
"آپ کا دل ؟ ہاں آپ کا دل پھر ؟ "
"سُندری تیری عمر چھوٹی ہے ۔تو پریم سے انجان ہے ۔اگر تو سمجھ سکتی کہ پریم کیا ہوتا ہے تو بتائے بغیر ہی میری حالت کو سمجھ جاتی "
"میں سمجھتی کیوں نہیں ۔آپ اور گیانی جی نے مجھے سب کچھ پڑھایا ہے ۔ پھر میں پریم کو کیسے نہیں جانتی ؟ میں جانتی ہوں ۔ ہر ایک سے ہمیں پریم کرنا چاہیئے ۔ گوربانی میں لکھا نہیں ہے کیا 'جن پریم کیو تن ہی پر بھو پایو ' "

اِس سیدھے سادے جواب نے بچن سنگھ کو لاجواب کر دیا اور کچھ مایوس بھی ۔ لیکن پھر وہ ایک بار اپنے خیالات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے بولا "لیکن میرا مطلب دوسرے پریم سے ہے "

"دوسرا پریم " سندری نے پھر پہلے کی طرح حیرانی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا " وہ کیسا ہوتا ہے ۔آپ نے مجھے پڑھاتے ہوئے تو کبھی بتایا نہیں تھا "
"یہ باتیں پڑھائی میں نہیں بتائی جاتیں "
"اچھا سکولوں کالجوں میں "
"نہیں پگلی نہیں ۔تم تو بس ..... "
"تو پھر آپ بتاتے کیوں نہیں ؟ "

بچن سنگھ کو جب اور کوئی جواب نہ سجھائی دیا تو اُس نے اور آسان ڈھنگ سے اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لیے کہا " اچھا۔ اِس بات کو چھوڑ ۔ تو بتا۔ کل تو تجھے چلی جانا ہے ؟ "

"ہاں! بابے نے پیغام جو بھیجا ہے۔"
"اور اگر پیغام نہ بھیجتا تو؟"
"پھر نہ جاتی"
"اچھا! لیکن وہاں جا کر مجھے کبھی کبھی یاد کیا کرو گی؟"
"کیا آپ آیا نہیں کریں گے؟"
"نہیں"
"نہیں؟" سُندری نے ناقابلِ برداشت درد کا احساس کرتے ہوئے کہا "کیوں؟ تو پھر مجھے پڑھائے گا کون؟"
"پڑھائی کا میں کوئی اور اِنتظام کر دوں گا۔"
"میں کسی اور سے نہیں پڑھوں گی۔"
"اور تمہیں زیادہ پڑھ کر کیا کرنا ہے۔ گورمکھی تو تم اچھی طرح لکھ پڑھ سکتی ہو۔ گورو کی بانی بھی تجھے بہت سی یاد ہے۔"
"آپ خود ہی کہتے تھے کہ دسویں تک پڑھاؤں گا۔"
"اگر تیری اور پڑھنے کی مرضی ہوئی تو تجھے شہر میں کسی لڑکیوں کے سکول داخل کروا دوں گا۔"
"اور آپ بھی وہیں جا کر رہیں گے؟"
"میں؟ میں کس طرح رہ سکتا ہوں۔ گھر چھوڑ کر اور کہیں؟"
سُندری چپ ہو گئی۔ جیسے اُس نے کوئی غلط سوال کیا تھا۔
بچن سنگھ نے پھر کہنا شروع کیا "سندری تم میرے پاس نہیں رہنا چاہتیں؟"
"آپ کے پاس— آپ کے پاس لوگ مجھے رہنے دیں گے؟"
"اچھا سندری تم مجھے پیار نہیں کرتیں؟"
پیار کا نام سُنتے ہی سندری کے ہونٹوں پر میٹھی سی مسکراہٹ آگئی اور وہ اس کے کندھے سے سر لگا کر کہنے لگی "آپ..... آپ..... میں ...." اور وہ کوشش کرنے کے باوجود اپنا جملہ مکمل نہ کر سکی۔
لیکن بچن سنگھ کو اپنے سوال کا جواب مِل گیا تھا۔ سندری کے انگ انگ سے چھلکتے ہوئے پریم کے بہاؤ نے بچن سنگھ کو خوشی سے بھر دیا۔
دونو پریمی پریمیکا ایک دوسرے سے کہنے کے لیے جو کچھ اپنے اپنے دِلوں میں لیے بیٹھے تھے وہ

سب کچھ ویسا کا ویسا ہی بھرا رہا اور ان کو اسے کھولنے، دکھانے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ دونوں محسوس کر رہے تھے کہ وہ دراصل دو نہیں ایک ہیں!'

اس کے بعد بچن سنگھ نے گھڑی دیکھی تو ڈھائی بج چکے تھے۔ اُس نے کہا "اچھا سُندری۔ اب سو جا۔ رات بہت بیت گئی ہے۔ ڈھائی بج گئے ہیں"۔ اِس کے بعد اُس نے سندری کا ہاتھ چوم لیا۔ ہونٹوں کے لمس نے سندری کو اِتنا مدہوش کر دیا کہ بچن سنگھ کب چلا گیا اُسے پتہ نہ لگا۔

(۲۰)

شام کا اندھیرا آہستہ آہستہ ہر طرف پھیلتا جاتا ہے۔ پوس ماگھ کی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اور دیوان پور کے باہر ایک کنویں پر کچھ چہل پہل ہے۔ کنواں چل رہا ہے اور گدی پر بیٹھا لگ بھگ تیرہ برس کا ایک لڑکا تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد "ہوں ہوں" کہتا ہوا سفید بیلوں کی جوڑی کو ہانکے جا رہا ہے۔ کنویں کی ریں ریں کی آواز بڑی دلکش معلوم ہوتی ہے۔

گاؤں کی بہت سی مٹیاروں (لڑکیوں) نے اَدلو (وہ جگہ جہاں رہٹ سے پانی گرتا ہے) اور نسار (لوہے یا لکڑی کی نالی جس کے راستے پانی اَدلو میں گرتا ہے) کے گرد جھرمٹ ڈالا ہوا ہے اور اُن کے چھوٹے چھوٹے بچے نزدیک ہی بیٹھے کنکر چُن کران سے کھیل رہے ہیں۔

رہٹ سے تھوڑے فاصلہ پر کپاس کا ایک کھیت ہے لیکن اس وقت اِسے کپاس کا نہ کہہ کر خالی کپاس کے سوکھے پودوں یعنی جھاڑیوں کا کھیت کہنا ہی مناسب ہوگا کیونکہ کسی بھی بوٹے کے ساتھ ایک بھی پھول یا ہرا پتہ نہیں ہے۔ ہاں کپاس نکلے ہوئے خالی ڈوڈوں سے سارے پودے لدے ہوئے ہیں اور ہوا کے جھونکوں کے ٹکرانے سے کھڑکھڑ کی آواز سنائی دے رہی ہے۔

اِس کے نزدیک والے نچلے کھیت میں مولیوں کی ہری بھری کیاریاں پورے جوبن پر ہیں۔ زمین سے آدھی باہر نکلی ہوئی گوری مولیوں کے سروں پر ہرے پتوں کے گچھے اِس طرح جھوم رہے ہیں جیسے شہزادیوں کے سروں پر چنور جھول رہے ہوں۔

سُوکھی کپاس کے کھیت کی گود میں یہ ہریالی کا حصہ اِتنا دلکش معلوم ہوتا ہے جیسے کسی بوڑھے پتا کی گود میں اُس کی لاڈلی بچی کھیل رہی ہو۔

کسی وقت جب تیز ہوا کا جھونکا لگتا ہے تو یہ مُولیوں کے کومل بوٹے اس طرح کپاس کے سوکھے

پودوں کی طرف جھکتے ہیں جیسے کوئی بچہ ڈر کے مارے اپنے باپ کی طرف باہیں پھیلاتا ہے!

اس وقت ہم مُولیوں کے کھیت کے کنارے تین آدمیوں کو بیٹھے دیکھ رہے ہیں۔

کیاری سے ایک نرم سے مُولی اُکھاڑ کر اُس کی مٹی جھاڑتے ہوئے ایک نے دوسرے کی طرف دیکھ کر کہا "اب اس کا کام تمام بھی ہوگا کسی طرح کہ وہ اسی طرح ہماری چھاتی پر مونگ دلتا رہے گا؟"

دوسرا بولا "لیکن بھائی پالا سیاں — اس میں ہمارا کیا قصور — تم تو خود ہی ٹال مٹول کیے جارہے ہو۔ تمہیں نے تو کہا تھا کہ بھئی اِدھر یا اُدھر والی بات ہو تب ہی کام راس آئے گا"

پالا سنگھ "اِدھر یا اُدھر کرنے سے بھائیو میں نے کب انکار کیا ہے۔ تم نکمے خود ہی کسی لائق نہیں۔ اِس کل کے چھوکرے بچنے (بچن سنگھ) کو تم ٹھیک نہ کر سکے تو اور تم لوگوں سے کیا ہوگا، خاک!"

تیسرا "لیکن جو پالا سنگھ بڑوں بڑوں کو مارنے سے کبھی نہیں جھجکا، وہ بچنے سے اس طرح کیوں ڈرتا ہے۔ میری سمجھ میں تو یہ بات آئی نہیں"

دونوں ساتھیوں کے طعنے پالا سنگھ کو تیروں کی طرح چھید تے چلے گئے۔

وہ طیش میں آکر ساتھیوں سے کہنے لگا "کون! میں ڈرتا ہوں۔ قسم گورو کی۔ اگر کبھی میرا بس چلا تو چو تھے پل اُس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دوں گا لیکن دیکھتے نہیں کہ وہ چھچھوندر سی لڑکی کس طرح اُس پر مرتی ہے۔ میں کہتا ہوں، اگر وہ نہ ہو تو ہم بچنے کا کام تمام کردیں لیکن جس کے لیے سب کچھ کیا وہ ہی بن آئی موت مرگئی تو۔ سوایا سیاں میں چاہتا ہوں کہ کوئی ایسا ڈھنگ سوچیں جس سے ایک نشانے سے دو شکار کیے جائیں۔ بچنے کا بھی آئے دن کا کام ختم ہو اور وہ پری بھی قابو میں آجائے — !"

دیرو "بھائی اور وہ جو تیرا کانا کھلاڑی ہے"

پالا "اُس کی خیر ہے۔ ہمیں تو ڈر ہے اپنی جان کا۔ اُس بوڑھے کو ہم کیا سمجھتے ہیں۔ اس کو تو میں ہاتھ کی اُنگلیوں سے مسل کر پھینک دوں گا۔ اس کی داد فریاد کون کرے گا؟ آج مرا کل دوسرا دن!"

سوایا "اچھا اب لمبے جھگڑے چھوڑ — یہ بتا — اب بُلایا کس کام کے لیے ہے۔ بڑی غضب کی سردی پڑ رہی ہے"

پالا "سردی کیوں — سیدھا کیوں نہیں کہتا کہ مُنہ کڑوا کرنے کو جی چاہتا ہے"

پالا سنگھ کی بات سُن کر اس کے دونوں ساتھی ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے مُسکرانے لگے۔

پالا سنگھ نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا "سردی بھی مٹا دوں گا۔ قریباً ڈیڑھ بوتل رکھی ہے اس دن کی بچی ہوئی"

"ڈیڑھ بوتل!" اُس کے دوستوں کے چہروں پر لالی آگئی۔ ویرو کہنے لگا: "بھائی ہم کب تم سے انکاری ہیں۔ جب تک تمہیں دولہا نہ بنالیں تب تک ہم آرام سے بیٹھنے والے نہیں؟"

سوایا: "لیکن ہماری بھابھی کے آتے ہی کہیں وہ بات نہ ہو کہ اِدھر کوٹھا بنا اور اُدھر ترکھان کی یاد بھول گئی۔"

پالا سنگھ پر اپنے ساتھیوں کی باتیں سُن کر بغیر شراب پیے ہی نشہ طاری ہو گیا۔ وہ بولا: "لڑکی کھیت بچہ پیٹ۔ آدا ماد میٹھی روٹی کھا؛ وہ بی بی رانی تو ابھی بچنے کے گھر کی چار دیواری میں قید ہے اور ان کو بھابھی کے سپنے آرہے ہیں۔"

"کون کہتا ہے؟" ویر سنگھ نے جلدی سے کہا: "اُسے تو پانچ دِن ہوئے بوڑھا گھر لے آیا ہے۔"

"اچھا"— پالا سنگھ نے حیرانی سے کہا: "چلی گئی ہو گی۔ تمہیں پتہ ہی ہے میں تو آج سات دِن بعد باہر سے آیا ہوں۔"

ویرو: "تو جب سے زخمی ہوئی ہے، اُس کے بعد اسے تم نے دیکھا ہی نہیں؟"

"نہیں"

"اب تو بھائی سوں (قسم) گورو کی۔ دیکھنے والی چیز ہے۔ سسری کا رنگ ایسا نکھرا ہے جیسے میدا اور سندور ہوتا ہے اور چند ہی دنوں میں بڑھی بھی بیل کی طرح ہے۔ تمہاری تو بھائی قسمت کھُل جائے گی اگر مورچہ فتح ہو جائے تو ....."

پالا سنگھ: "مجھے تو اُس نے پہلے ہی دیوانہ بنا رکھا ہے۔ اب بچا کھچا بھی کھانا حرام کر دے گی۔ اور کیا...... اگر تمہارے راج میں میرا اِتنا کام بھی نہ بنا تو یاد رکھنا کہ تم دونوں کے سر چڑھ کر مر جاؤں گا۔"

سوایا: "بگلوں کے سر کونی سینگ ہوتے ہیں بھلا۔ یہ کونسا اتنا بڑا کام ہے۔ یہ تو رب نے چاہا تو چٹکی بجاتے میں ہو جائے گا لیکن پہلے بچنے (بچن سنگھ) کی فکر کرو۔ بچنے کے ہوتے ہوئے وہ قابو نہیں آنے گی۔"

پالا: "لیکن سوایا سیاں۔ تیرا کیا خیال ہے۔ بچنا اُس سے شادی کرے گا؟"

ویرو: "تو کیا ایسے ہی پڑھا پڑھا کر اُسے گیانی بنا رہا ہے۔"

پالا: "لیکن مجھے تو حیرانی اِس بات کی ہے کہ بچنے کو کیا کمی ہے لڑکیوں کی؟ بارہ جماعت

پڑھا ہوا ہے۔ سُنا ہے اُس کو بڑے بڑے سرداروں کے ہاں سے کڑمائیاں (رشتے) آرہی ہیں۔ وہ تو بھئی میرے جیسے یک وتنہا کے لایق ہے جس بیچارے کا کوئی آگے پیچھے نہیں ہے۔"

سوایا:" بات تو بھائی تمہاری سچی ہے لیکن کہنے پر تو کوئی گھڑی نہیں اُٹھاتا نا۔ اب تو کھلے میدان کا مقابلہ ہے، جو جیتے سو پائے۔"

دیرو:" تم نے تو جوان فضول بکواس میں ہی سارا وقت ضایع کر دیا۔ کام کی کوئی بات کرنی ہے تو کرو۔ میری تو گھنٹے بھر سے ٹانگیں بھی اکڑی ہوئی ہیں۔"

سوچ سوچ کر پالا سنگھ کہنے لگا:" میری صلاح ہے۔ بچنے کو کسی مقدمے میں پھنسایا جائے۔ بس پھر تو ہتھیلی پر ہی سرسوں جمے گی۔"

دیرو:" میرا بھی یہی خیال ہے۔"

سوایا:" میرا بھی یہی خیال ہے۔ بلکہ میں تو تم لوگوں سے کہنے والا بھی تھا۔ لیکن بوڑھے کو ؟"

اس کے بعد پالا سنگھ نے باری باری دونوں کے کانوں سے مُنہ جوڑ کر کچھ کہا۔ تھوڑی دیر کھسر پھسر ہوتی رہی اور پھر تینوں کسی فیصلہ پر پہنچ کر ایک طرف کو چل دیے۔

(۲۱)

سُندری کو بچن سنگھ کے گھر سے گئے کافی دن ہو چکے ہیں اور اِن دِنوں میں بچن سنگھ کا بابے روڈو کے گھر آنا جانا برابر جاری رہا تھا، جس کی وجہ سے سُندری کی پڑھائی بھی اچھی طرح ہو رہی تھی۔

آج جب دوپہر کو بچن سنگھ کنویں سے گھر آیا تو ماں کو اُس نے بہت اُداس پایا۔ جب بچن سنگھ نے اِس کی وجہ پوچھی تو سدا کور نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا:" کیا بتاؤں بیٹا۔ تم سے کیا چھپا ہے ؟"

" تب بھی کیا بات ہے ماں ؟"

سدا کور:" بیٹا تم دیکھتے نہیں۔ یہی گھر ہے جس میں آٹھوں پہر لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا

تھا۔ اور آج کوئی اِدھر رُخ ہی نہیں کرتا۔ آج سویرے سرنے کالڑکا ہوشیار پور سے چھٹی آیا تھا۔ دروازے کے سامنے سے گزرتا ہوا مجھے ماتھا ٹیکنے کے لیے اندر آگیا۔ مجھے کیا پتہ تھا۔ لسی کا کٹورا لا کر دے بیٹھی۔ لسی پی کر وہ گھر چلا گیا۔ باہر دروازے میں سے کسی نے اُسے لسی پیتے ہوئے دیکھ لیا۔ گھر جاتے ہی سارے اُس کے پیچھے پڑ گئے کہ تو نے اُن کے گھر کی لسی کیوں پی؟ اُن کے ساتھ ذات برادری میں سے کوئی ملنا جلنا ہی نہیں۔ پھر دینا ناتھ برہمن کے گھر سے گنگا جل منگوا کر اُسے پلایا گیا، تب جا کر وہ اپنی رسوئی میں داخل ہو سکا۔"

بچن سنگھ اپنے بارے میں لوگوں کے رنگ ڈھنگ کافی دنوں دیکھتا آرہا تھا۔ اب کچھ لوگوں کی زیادتی اور اُس پر ماں کے دُکھ کو محسوس کر کے اُس کے دل پر گہری چوٹ لگی۔ لیکن بظاہر حوصلہ دِکھاتے ہوئے بولا "تو ماں پھر کیا ہوا؟ نہیں ملتے جُلتے تو نہ ملیں۔ ہمیں کونسا کسی کے گھر کھانے جانا ہے۔"

"کھانے کو تو کاکا، نہیں جانا۔ لیکن آدمی، ذات برادری میں ہی اچھا لگتا ہے۔ جو مزہ کونج کو قطار میں سب کے ساتھ اڑ کر آتا ہے وہ الگ رہ کر نہیں آتا۔ مرنا جینا، دکھ سکھ، آدمی کے ساتھ ہے، جہاں آدمیوں سے کام چلتا ہے، وہاں پیڑوں سے کام تھوڑی ہو گا۔ ابھی تو خیر سے تیرا بھی سب کچھ کرنا دھرنا ہے۔ کہاں تو نے یہ نئے رشتے لا لا کر لوگوں نے ہمارے گھر کی دہلیز گھس دی تھی اور اب کوئی ہمارے دروازے کی طرف دیکھتا بھی نہیں۔ بتاؤ۔ اب میں کس طرف جاؤں؟"

بچن سنگھ اب تک معمولی طور پر ہی اپنے خیال کے مطابق سب کچھ کر رہا تھا۔ لیکن ماں کے دل کو اتنی چوٹ لگی ہے، اِس بات کو آج ہی سمجھ سکا۔ ماں کی باتوں کا کیا جواب دیتا؟ اُس کے پاس کوئی جواب تھا ہی نہیں۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر وہ بولا "پھر اب کیا کرنا چاہیئے؟"

"کرنا کیا ہے۔ برادری کو چھوڑا نہیں جا سکتا۔ اُس قلندروں کی لڑکی کے بغیر ہمارا کیا نقصان ہو جائے گا۔ وہی تو سب مصیبتوں کی جڑ ہے۔ نہ وہ اس گاؤں میں آتی اور نہ ہمارے لیے یہ مصیبت کھڑی ہوتی۔"

بچن سنگھ طیش میں آکر بولا "ماں اُس بیچاری غریب کے سر الزام تھوپنے سے کیا فائدہ؟ اگر ایک غریب لاچار لڑکی کی جان بچانا بھی اتنا بڑا گناہ ہے جس کے لیے ہمیں یہ سزا دی جا رہی ہے تو (جوش میں) سو بار ایسی سزائیں بُھگتنے کو تیار ہوں۔"

ماں نے جب بیٹے کو آپے سے باہر ہوتے ہوئے دیکھا تو اُٹھ کر گھر کے کام دھندے میں

لگ گئی۔ اور بچن سنگھ بھی مزاج ٹھیک کرنے کے لیے گھر سے باہر نکل گیا۔ آخر گھومتا پھرتا بابے رڈو کی جھونپڑی کی طرف جا نکلا۔ جا کر دیکھا۔ بابا رڈو وہاں نہیں تھا اور سندری کسی گہری فکر میں غرق تھی بچن سنگھ نے دروازے میں کھڑے ہو کر آواز دی "سندری"

چونک کر سندری بولی "ہاں جی"

"آج کون سی گہری سوچ میں غرق ہو؟"

"آپ آگئے — میں آپ کا ہی انتظار کر رہی تھی"

بچن سنگھ نے جب اُس کے مُنہ کی طرف دیکھا تو وہ سمجھ گیا کہ سندری رو کر بیٹھی ہے۔ اُس نے بے قراری سے پوچھا "سندری معلوم ہوتا ہے تو روتی رہی ہے"

سندری نے کوئی جواب نہ دیا۔ بچن سنگھ کی بیتابی اور بڑھ گئی۔ اس نے پھر پوچھا "اگر تم کچھ حرج سمجھتی ہو تو میں نہیں پوچھتا لیکن ۔۔۔"

"آپ کو بات بتانے میں کیا حرج ہے" سندری نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کرتے اور بچن سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہماری لچھو گُم ہو گئی ہے"

"گم ہو گئی؟ وہ کس طرح؟ وہ تو کبھی کہیں جانے والی نہیں تھی۔ کھلی پھرتی رہتی تھی"

"کیا پتہ" ٹھنڈی سانس بھر کر سندری نے کہا "جانے والی تو نہیں تھی لیکن کوئی لے ہی گیا۔ رات سے نہیں مل رہی۔ بابے نے رات سے کھانا نہیں کھایا اور ساری رات روتا رہا۔ صبح سے ڈھونڈنے نکلا ہوا ہے اور ۔۔۔"

"ہاں اور کیا؟"

"بابا — آپ کے گھر جا رہا تھا لیکن میں نے اُسے جانے نہیں دیا۔ مجھے معلوم تھا آپ آئیں گے"

"کیوں؟" بچن سنگھ نے پوچھا "کوئی ضروری کام تھا"

سندری کے چہرے پر پھر اُداسی چھا گئی۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ بچن سنگھ کا دل ڈوبنے لگا۔ اُس نے جیب سے رومال نکال کر اُس کی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "کہتا تھا ہم یہاں سے چلے جائیں گے"

"چلے جائیں گے؟" حیرانی سے اس کی طرف دیکھ کر بچن سنگھ نے پوچھا "کہاں؟"

"کسی اور بستی میں جا کر رہیں گے"

"لیکن کیوں؟"

سُندری رومال کے کونے کو بل دے کر انگلی سے لپیٹ رہی تھی، جیسے اِس شغل میں مصروف رہ کر اپنے دل کے درد کو بھول جانا چاہتی تھی۔ اُس نے کیوں کا جواب دینے کے لیے سر اونچا اُٹھایا لیکن بات اُس کے گلے میں ہی پھنس کر رہ گئی۔

بچن سنگھ نے اُس کے ہاتھ کی اُنگلی پکڑ کر آہستہ سے جھٹکتے ہوئے کہا "بتا سُندری جلدی بتا؟"

"نہیں۔ رہنے نہیں دیتے؟ ہمارے ساتھ روز شرارت کرتے ہیں"

بات کا مطلب چاہے بچن سنگھ اب بھی پورا نہیں سمجھا تھا لیکن اب اُس میں اِس سے زیادہ سننے کی ہمت نہیں تھی۔ سُندری کی توجہ دوسری طرف دِلاتے ہوئے بولا "لیکن تمہاری بندریا کو لے جا کر کسی کو کیا کرنا تھا؟"

سُندری نے بھی شکر کیا کہ اُس کو اور کچھ نہ کہنا پڑا۔ وہ بولی "کیا پتہ کیا کرنا تھا؟"

اِسی وقت بابا روڈو اندر آیا۔ بچن سنگھ کے آگے جھک کر اس نے فتح بلائی اور ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ اُس کے پوچھنے پر کہ بندریا کا پتہ لگا یا نہیں۔ روڈو زور سے رو پڑا اور اُس کے مُنہ سے کوئی بات نہ نکلی۔

سُندری جلدی سے اُٹھی اور اس کے گلے میں بازو ڈال کر گھبرائی ہوئی بولی "کیا بات ہے بابا؟"

"سُندری" روڈو نے دھوتی کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "سُندری تیری لچھو مر گئی"

"مر گئی" سندری نے چیخ ماری اور جھنجھوڑتی ہوئی بولی "کس طرح مر گئی بابا؟"

"کسی نے اُسے کنوئیں میں پھینک دیا"

"ہائے ہائے۔ کنوئیں میں؟ میں مر گئی!"

جس طرح ایک ہی دوربین سے کوئی دو چیزیں دیکھتا ہے اِسی طرح بچن سنگھ ایک ہی دل سے دونوں کے درد کو محسوس کر رہا تھا۔ دونوں رو رہے تھے۔

تھوڑی دیر رونے کے بعد جب بوڑھے کا دِل کچھ ہلکا ہوا تو وہ ہاتھ جوڑ کر بچن سنگھ سے کہنے لگا "سردار جی! آپ نے ہم پر بہت کرم کیے ہیں۔ آپ کے احسانوں کا بدلہ میں سو بار جنم لے کر بھی نہیں

چکا سکتا۔ میری بچی کو آپ نے جانور سے آدمی بنا دیا۔ پھر اس کی جان بچانے کے لیے اپنے سر پر آپ نے جو کچھ جھیلا ہے اس کے لیے میں کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔ دل تو یہی چاہتا تھا کہ آپ کے چرنوں میں ہی جہاں اتنی زندگی گزاری ہے، وہاں باقی کے چار دن بھی کاٹ لوں لیکن معلوم ہوتا ہے، دانہ پانی ہمیں یہاں اور نہیں رہنے دے گا۔ ہمیں خوشی سے اجازت دیجیے کہ کسی اور جگہ چلے جائیں۔"

بچن سنگھ کے دل پر جیسے تیر برس رہے تھے، اُس کا کلیجہ مٹھی میں آ گیا۔ وہ بولا "لیکن بابا جی کیوں؟"

"سردار جی کیا بتاؤں۔ (سندری کی طرف دیکھ کر) اس لڑکی کو میں نے بڑے دُکھوں سے پالا ہے۔ مٹھی میں پکڑنے بھر کی، چڑیا کے پوٹے سی تھی، جب میں اسے لایا تھا۔"

اس کے بعد اُس نے سُندری کس طرح ملی۔ یہ ساری درد بھری کہانی کہہ سنائی اور پھر بولا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ سگی اولاد کے ساتھ لوگوں کی کس طرح کی محبت ہوتی ہے لیکن میرے دل میں اس کے لیے جو محبت ہے وہ کہنے سننے سے ماورا ہے۔ جب یہ نادان تھی تب مجھے اس کے پالنے پوسنے کی ہی فکر تھی لیکن اب تو آپ جانتے ہیں۔ اس کی عمر بچوں والی نہیں۔ اور میں سردار جی ٹھہرا ایک کمین (نیچ) منگتا۔ گلیوں کے تنکوں میں ہلنے جلنے کی طاقت ہو گی لیکن مجھ میں نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں۔ میں کسی کا کیا بگاڑ لوں گا۔"

وہ پھر پھپھک پھپھک کر رونے لگا۔ پھر بولا "کئی مہینوں سے میں دیکھتا چلا آ رہا ہوں کہ گاؤں کے لوگوں کا سلوک ہم سے اچھا نہیں ہے۔ رات کو کئی جوان اکٹھے ہو کر جھونپڑی کے گرد گھیرا ڈالے آوازے کستے رہتے ہیں اور پھر آپ کا بھی نام لے لے کر۔۔۔"

بچن سنگھ سے اس کی ماں نے جو جو باتیں کہی تھیں، اُن کو سُن کر وہ خود ہی بہت دکھی تھا اور اس مصیبت سے بچنے کا حل سوچ رہا تھا لیکن روڈو کا حال سُن کر وہ اپنے دُکھ بھول گیا۔ کافی دیر وہ فکر میں غلطاں رہا۔ پھر بولا "مجھے یہ سُن کر بڑا دُکھ ہو رہا ہے، لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا کیا علاج کیا جائے۔ اچھا تو پھر اب آپ نے کیا سوچا ہے؟"

"چلے جانے کا" روڈو نے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا "سردار جی! کیا بتاؤں۔ اگر سندراں کی فکر نہ ہوتی تو مرتے دم تک یہاں سے نہ جاتا۔ اس جگہ سے اور اس تنکوں کی جھونپڑی سے مجھے بہت پیار ہو گیا ہے۔ اس کو چھوڑتے وقت پتہ نہیں میرا کیا حال ہو گا۔ لیکن کیا کروں جوان لڑکی دروازے پر ہو تو پھر بتائیے آدمی سے کہاں تک اس طرح کی باتیں برداشت

ہو سکتی ہیں۔ اور پھر اِس کی بھی کوئی فکر کرنی ٹھہری۔ آخر 'رُوڑی کا کوڑا'، سردار جی کوڑے پر پھینکنا ہی ہے نا۔"

کچھ دیر ٹھہر کر روڈو پھر بولا "اور سردار جی ــ اس ہیرے کو اب میں کوڑیوں کے کوڑے میں بند کردوں، یہ بھی مشکل بات ہے۔ آپ کی مہربانی سے اِتنی پڑھی لکھی لڑکی قلندرروں یا بازی گھروں کے گھر جائے یہ مجھ سے کیسے برداشت ہوگا۔ میں تو چاہتا تھا۔ جیسی سُندری ہے ویسا ہی اِس کے لیے بر ملتا۔ لیکن ایسی قسمت کہاں؟"

بچن سنگھ اِس وقت کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ آخر وہ کسی نتیجے پر پہنچنے کے بعد بولا "باباجی! میں آپ کو نہیں جانے دوں گا۔"

روڈو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بچن سنگھ پھر بولا "سندری کو قدرت نے اِس طرح خاک چھاننے کے لیے نہیں بنایا۔ میں چاہتا ہوں یہ ابھی اور پڑھے لکھے۔"

روڈو نے یہ بات اس طرح سُنی جیسے عمر قید پانے والے ملزم سے کوئی وکیل یہ کہے کہ میں تجھے بری کرادینے کا ذمہ لیتا ہوں۔ وہ دھڑکتے دل سے بولا "سردار جی۔ آپ نے پہلے کونسی کمی چھوڑی ہے۔ ہمارے لیے آپ کو کونسی کم مصیبتیں دیکھنی پڑی ہیں۔ آپ کی زندگی اور عزت قایم رہے اور آپ پھلیں پھولیں۔ لیکن میرے لیے آپ کیوں فکر و پریشانی میں پڑتے ہیں۔ میری قسمت میں تو جو لکھا ہے برداشت کروں گا۔ آپ کوئی فکر نہ کیجیے اور ہمیں جانے دیجیے۔"

بچن سنگھ اعتماد سے بولا "لیکن باباجی! میں لوگوں کا یہ ظلم برداشت نہیں کرسکتا۔"

خوش ہوتے ہوئے روڈو نے کہا "جو آپ کو اچھا لگے۔ میں تو ....."

"لیکن جو حال آپ سُن چکے ہیں۔ وہ ....."

سُندری جواب تک چُپ بیٹھی تھی اِس طرح بچن سنگھ کی طرف دیکھنے لگی کہ جیسے زندگی سے نااُمید بیمار کو کوئی زندگی بخش دے۔ اُس نے مسکراتے ہوئے بچن سنگھ کی طرف دیکھا اور بچن سنگھ بھی اُسی طرح جواب دے کر وہاں سے چلا گیا۔

(۲۲)

بابے روڈو کی بات سچ نکلی۔ سارا اُودھم سُندری کی موجودگی سے ہی تھا۔ جس دن سے سُندری دیوان پور سے گئی ہے ہر طرح کا ذکر تقریباً ختم ہوگیا ہے۔ لیکن پالا سنگھ کے دل پر کڑی چوٹ لگی ہے۔ کہاں تو وہ سُندری کو اڑا لے جانے اور باندھ رکھنے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا اور کہاں سُندری کا سایا دیکھنے کو بھی ترس گیا۔

پالا سنگھ کے دل میں پہلے ہی بچن سنگھ کے خلاف آگ بھڑکتی رہتی تھی اب تو وہ اور بھی دہک اٹھی کیونکہ وہ سمجھ رہا تھا کہ بچن سنگھ نے اس کا شکار چھین لیا ہے۔ وہ اور سب کچھ بھول گیا سوائے اس کے کہ کسی طرح سُندری کو واپس لایا جائے۔ لیکن کس طرح سے لایا جائے؟ ہزاروں طرف سوچ کے گھوڑے دوڑانے پر بھی اس کے لیے اسے کوئی راستہ نہ سوجھا۔

آخر سوچ سوچ کر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ جب تک بابے روڈو اور بچن سنگھ پر کوئی بڑی مصیبت نہیں پڑتی تب تک سُندری کا پڑھائی چھوڑ کر آنا یا اس کے جال میں پھنسنا مشکل ہے۔

آہستہ آہستہ اُس نے اپنی کوشش جاری رکھی لیکن اس کوشش کا نتیجہ نکلنے میں تھوڑی مدت نہیں بلکہ تین سال لگ گئے۔

سُندری کو لاہور کے ایک کنیا آشرم میں داخل کرا کر بچن سنگھ سوچنے لگا کہ نہ صرف اُس کے سر سے ذمہ داریوں کا بوجھ ہلکا ہوگیا ہے بلکہ وہ کئی اور آنے والی مصیبتوں سے بھی بچ گیا ہے۔ لیکن اندر ہی اندر اس کے مخالف کیا کر رہے تھے اور کیا سوچ رہے تھے اس کا اُسے کچھ علم نہیں تھا۔ ہاں ظاہرا طور سے بات ایک طرح سے ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔

سُندری کا الگ ہونا بچن سنگھ کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اُس کی دنیا میں سے کوئی چیز گُم ہوگئی ہے۔

وہ ہر مہینے سُندری کی پڑھائی کا خرچ بھیج دیتا اور ساتھ ہی بابے روڈو کا خیال بھی رکھتا تھا۔ روز ایک آدھ بار اس کی جھونپڑی میں پل دو پل جا بیٹھتا اور ادھر اُدھر کی بات چیت سے سُندری کے ہجر میں تڑپتے ہوئے روڈو کا دل بہلایا کرتا۔ وقت کا چکر اپنی رفتار سے چلتا رہا۔

... ٭ ...

سُندری نے پورے تین برس اپنی پڑھائی جاری رکھی اور اس کے بعد دسویں کا امتحان پاس کر کے اس کو واپس دیوان پور لوٹنا پڑا۔ وہ کس طرح اور کیوں آئی؟ یہ تین برس دونوں محبوب اور محبوبہ کے لیے کس طرح گزرے؟ اس کا حال ان کی تحریر کردہ چٹھیوں سے معلوم ہوگا۔ ان بہت سے خطوں سے جو مختلف وقتوں میں ایک دوسرے کو بھیجتے رہے تھے یہ سچے اور آدرش پیار میں ڈوبے ہوئے خطوط لطف سے خالی نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے ناول کی کہانی کو آگے بڑھانے

سے پہلے ان خطوں کو اپنے قارئین کے سامنے رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمارے کچھ قارئین کو یہ چٹھیاں شاید بے کار معلوم ہوں۔ ایسے دوستوں سے ہم یہی کہیں گے کہ وہ کچھ صفحے بغیر پڑھے بھی آگے بڑھ سکتے ہیں لیکن ہمارے لیے یہ نا ممکن ہے کہ ہم دو پریمیوں کے خطوں کو بغیر پڑھے ہی چھوڑ دیں جن میں نہ صرف ان کی روح سموئی ہوئی ہے بلکہ پیار کے وہ ولولے، وہ جذبے ان چٹھیوں میں سے پھوٹ پھوٹ کر نکلتے ہیں جن کا انسانی دلوں پر گہرا اثر پڑتا ہے۔

(پہلا خط)

کنیا آشرم

لاہور

ستکار یوگ! میرے ...

استانیاں سب ہی مجھ پر جان چھڑکتی ہیں۔ جماعت کی لڑکیاں مجھ سے بہنوں کا سا پیار کرتی ہیں۔ بورڈنگ کی سپرنٹنڈنٹ تو ایک پل بھی مجھے آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی۔ کسی بات کی تکلیف نہیں۔ لیکن سب کچھ ہوتے ہوئے بھی دل کی پریشانی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جاتی ہے۔ کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ جی سنسان سا لگتا ہے۔ دل کو کچھ اس طرح محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی چیز گم ہو گئی ہے اور اندر کی ساری طاقتیں اُسے ڈھونڈنے میں مصروف ہیں۔ کیا آپ مجھے بتا سکیں گے کہ یہ کیوں ہوتا ہے اور یہ حالت دور کرنے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟

دل ہر وقت ڈوبا ڈوبا سا رہتا ہے لیکن اس وقت جب کہ میں یہ خط لکھ رہی ہوں، دل کو بہت ڈھارس سی ہے اور یہ جی چاہتا ہے کہ اسی طرح لکھتی ہی چلی جاؤں لیکن پھر کچھ سوچ کر رُک جاتی ہوں۔ آپ کے خط کا انتظار بڑی بے چینی سے کرتی ہوں۔ بابے کو میری طرف سے ست سری اکال! اور آپ سے یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ اس کا سہارا واہگورو کے بعد آپ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔

سُندری

(دوسرا خط)

دیوان پور

سندری جی

آپ کا بھیجا ہوا خط ٹھیک اس وقت ملا جب میں آپ کی فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔ کس طرح کی فکر؟ بتا نہیں سکتا۔ خط پڑھ کر دل کو خوشی یا کیا محسوس ہوا، نہیں کہہ سکتا۔ بلکہ میں اس بات کو خود بھی نہیں سمجھ سکتا۔ اپنی جو حالت آپ نے اپنا خط لکھنے سے پہلے بیان کی ہے، پڑھتے وقت میری حالت بھی شاید ویسی ہی تھی۔ ہاں دل کو دُکھ ضرور ہوا جب آپ کی اُداسی کا ذکر پڑھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ نئی جگہ اگر اپنوں کی یاد اُداس کر ہی دیتی ہے، اور پھر جس نے اتنی عمر تک گھر سے باہر قدم نہ

نکلا ہو اُس کا تو نئی جگہ پر اُداس ہو جانا ایک قدرتی بات تھی۔ امید ہے بہت جلد آپ دیوان پور کی گلیوں کو بھول جائیں گی اور پھر آپ کے دھرم پتا کی محبت بھی کوئی معمولی بات نہیں، جس کی وجہ سے آپ کی ایسی حالت نہ ہوتی ۔۔۔!

پھر بھی اتنی تاکید ضرور کرتا ہوں کہ خوب دل لگا کر پڑھنا اور سندری جی اب آپ بچی نہیں ہیں، اپنے فائدے نقصان کو اچھی طرح سوچ سمجھ سکتی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد تعلیم سے فرصت پا جائیں تاکہ کل کو جس گھر آپ جائیں اُن کو بھی آپ کی موجودگی سے سچی خوشی ملے اور آپ کو حاصل کرنے والا یہ دیکھ کر پھولا نہ سمائے کہ سندری صرف حُسن کی دیوی نہیں، علم اور عقل کی بھی مورتی ہے ۔۔۔!

آپ کے باباجی راضی خوشی ہیں۔ کسی بات کی فکر نہ کریں۔

بچن سنگھ

(تیسرا خط)

کنیا آشرم

لاہور

بڑے انتظار کے بعد آپ کا خط ملا۔ مجھے اس کا انتظار اسی وقت سے تھا جب سے میں نے اپنا خط سپردِ ڈاک کیا تھا۔ کیا بتاؤں کہ آپ کا خط پڑھ کر میرا دل کیسا ہو رہا ہے۔ جب خط لکھنے بیٹھی تھی تو یہ خیال تھا کہ آج کئی ورق کالے کر کے رکھ دوں گی لیکن اب جب لکھنا شروع کیا ہے تو جو کچھ لکھنے لگتی ہوں وہ لکھا نہیں جاتا۔ پتہ نہیں کیا چیز قلم کو تھام لیتی ہے۔ کئی کاغذ لکھے اور کئی پھاڑ دیے۔

آپ کو میری فکر؟ اور پھر آپ بتا نہیں سکتے کہ کاہے کی فکر۔ لیکن میں کوئی انجان نہیں۔ جیسا کہ آپ نے خود ہی لکھا ہے کہ تو بچی نہیں ہے۔ ایک بے سہارا لڑکی کی جان بچانے کے لیے، اور پھر یہ ہی نہیں اُسے جہالت کے اندھیرے سے نکال کر علم کی روشنی اور اونچی گدی پر بٹھانے کے لیے آپ نے جو مصیبتیں اٹھائی ہیں اُن کا بدلہ چکانا تو دور رہا، ان کا شکریہ ادا کرنا بھی میرے لیے محال ہے اور پھر آپ کے ہی لگے ہ

آپ نے جتنے خطروں میں سے مجھے نکالا ہے اُن سے دس گنا خطروں میں آپ خود گھر گئے ہیں۔ ابھی اور پتہ نہیں کیا کیا مصیبتیں آپ کے سر پر آئیں۔ کیا میں ان ساری باتوں کو سمجھ نہیں سکتی؟ یہ حالت ہوتے ہوئے بھی اگر آپ کو فکر نہ ہو گی تو کس کو ہوگی۔ میں جب ان باتوں کے بارے میں سوچتی ہوں تو یہی جی چاہتا ہے کہ دھرتی ماں مجھے اپنے میں چھپا لے اور میں آپ کے دُکھوں اور فکروں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دوں لیکن کیا کروں، میں ڈھیٹ بن کر جیے جا رہی ہوں۔

آپ نے جو لکھا ہے کہ نئی جگہ ہونے کی وجہ سے میرا دل اُداس ہے، یہ غلط ہے۔ جس جگہ بھی آپ کا سایہ میرے سر پر ہوگا، وہ چاہے آتش فشاں کی چوٹی ہی کیوں نہ ہو، میرے لیے سورگ ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میری اُداسی

کی وجہ یہ نہیں۔

یہ کیا لکھا آپ نے کہ دیوان پور کی گلیوں کو بھول جاؤں گی؟ مجھے معاف کیجیے، یہ بات جان بوجھ کر آپ نے میرے دل کی گہرائی ناپنے کے لیے لکھی ہے۔ دیوان پور کی گلیاں تو میں اس جنم میں تو کیا سو جنموں میں بھی نہیں بھول سکتی دھرم پتا کی محبت کوئی معمولی چیز نہیں لیکن ...

آپ کے خط کی آخری سطریں پڑھ کر دل ڈوبنے سا لگا ہے۔ بیاہ کے بارے میں میں نے آج تک کبھی نہیں سوچا۔ کیا مجھے وہ دن دیکھنا ہوگا جب میری ساری امنگوں کا خون ہو جائے گا۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میں ایسا وقت آنے سے پہلے ہی اس دنیا میں نہیں رہوں گی۔ کیا اس بدقسمت پر اتنی مہربانیاں اسی لیے کرتے ہیں کہ اُسے زندہ ہی بھٹی میں جھونک دیں؟

آہ! اس سلسلے میں لکھنے کے لیے تیار ہو گئی ہوں لیکن ہوش ابھی قائم ہے۔ ایسی حماقت نہیں کروں گی۔ خط یہیں پر ہی ختم کرتی ہوں۔

سُندری

(چوتھا خط)

سُندری جی

آپ کا خط ملا۔ میری حماقت نے آپ کے دل کو اتنا دکھایا ہے، اس خیال سے میں اس وقت پانی پانی ہو رہا ہوں۔ آج تک میرا یہی خیال تھا کہ میں یہ کتنا غیر مناسب اور غیر مہذب کام کر رہا ہوں۔ میرا دل یہ کیسی الٹی طرف جا رہا ہے کہ جس پھول کو میں نے کسی اور کو اس لیے نہیں توڑنے دیا کہ ایسا کرنے سے اس کی خوبصورتی ضائع ہو جائے گی، جس بوٹے کو سینچنے اور اس کی رکھوالی کرنے کے لیے سارا زور لگا دیا، اُس پھول کی مہک نے مجھے اس قدر دیوانہ بنا دیا کہ میں اس پر اپنا حق جمانے کے لیے ہی تیار ہو بیٹھا۔

سُندری جی! انسان کا دل کس قدر غیر یقینی اور چنچل ہے، جو ایک وقت میں تو آسمان پر پرواز کر رہا ہوتا ہے تو دوسرے وقت پاؤں میں گرا ہوا ہوتا ہے۔ اصل میں اس دل کی کمزوری کو میں آپ سے چھپانا چاہتا تھا۔ آپ سے نہیں بلکہ خود سے بھی اور یہی وجہ ہے کہ میں آپ کو جو کچھ لکھتا تھا، اپنی چھاتی پر پتھر رکھ کر لکھتا تھا۔ اس کے لیے آپ مجھے حقیر سمجھیں اور یہی فرض کر لیں کہ آپ کا کسی غیر مہذب آدمی سے واسطہ پڑ گیا ہے۔

میرا اب تک یہی خیال تھا کہ میں اپنے دل کے محسوسات کو کبھی آپ پر ظاہر نہیں ہونے دوں گا اور اپنی ساری طاقت خرچ کر کے بھی آپ کے راستے کا روڑا نہیں بنوں گا لیکن سب سے بڑی یہ فکر میرے دل کو کھا رہی تھی کہ کہیں میں اصولوں سے گر نہ جاؤں اور سارے کیے دھرے پر پانی پھر جائے۔ اسی فکر کا ذکر میں نے خط میں کیا تھا جس کا مطلب آپ نے کچھ اور نکال لیا۔

باقی جو آپ میری طرف سے کوئی مہربانی سمجھ کر اپنے دل کو ناحق بوجھل کیے رکھتی ہیں، میں سمجھتا ہوں، یہ آپ میرے ساتھ سخت ناانصافی کر رہی ہیں۔ آپ کی اس غلطی کو میں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ کیا میں نے آپ کے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ انسانی فرض سے کچھ زیادہ تھا؟

لیکن سُندری جی! اب جب میں دیکھتا ہوں کہ جس چیز کو حاصل کرنے کے لیے میں بے چین ہو رہا ہوں اور وہ چیز خود بخود ہی میری طرف کھنچی چلی آ رہی ہے۔ یہی نہیں بلکہ میرے پیچھے ہٹنے کے سچّے یا جھوٹے تصور سے ہی اُس کے سُکھوں کے ختم ہو جانے کا خطرہ ہے تو اب میں کیوں نہ آپ کے سامنے اپنے آپ کو اصلی روپ میں ظاہر کر دوں۔

سُندری جی! آپ کی خوبیوں نے تو میرے دل میں اس دن ہی گھر کر لیا تھا جس دن گوردوارے کے باہر میں نے آپ کو زمین پر حروف لکھتے دیکھا تھا لیکن اب تو آپ کی روحانی عظمت اور سیرت کے بھی سارے پہلو ایک ایک کر کے میرے دل پر آہستہ آہستہ قبضہ جما چکے ہیں۔ اس لیے اب تو کوشش کرنے کے باوجود بھی میں آپ سے دور نہیں رہ سکتا۔

لیکن یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ایک ایسی رکاوٹ ہم دونوں کے راستے میں ہے جس کا خیال کر کے میں سوچتا ہوں کہ کیا قدرت کو ہمارا ساتھ منظور نہیں اور ہم دونوں کو ایک دوسرے سے الگ ہی رہنا پڑے گا! کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ اس راستے پر آگے بڑھنے کی بجائے ہم ابھی سے پیچھے ہٹنے کی کوشش کریں — !!!

آپ کا
بچن سنگھ

(پانچواں خط)

میری دولتِ جاں!

آپ کے ساتھ میں نے اس زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ جو کچھ اس بار آپ نے لکھا ہے ٹھیک اسی طرح کا مضمون اپنے خط میں کل شام کو میں نے لکھا تھا۔ میرا خیال ہے جس وقت آپ یہ خط لکھ رہے ہوں گے، عین اسی وقت میں بھی یہی کچھ لکھ رہی تھی جس وقت آپ کے دل کا شیشہ اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہو کر کاغذ پر اپنی شعاعیں ڈال رہا تھا اس وقت میرے دل کی ندی بھی اپنے کناروں سے اوپر اچھل رہی تھی۔ سارے شکوک، ساری بے چینیاں اور سارے وہم اس میں بہہ رہے تھے اور باقی رہ گئے تھے دل کے پاک و پوتر محسوسات!

میں آپ کو کیا لکھ رہی تھی، سُننا چاہتے ہیں؟ تو سنیے میں بتاتی ہوں۔ میں لکھ رہی تھی اور خط کے جواب کا انتظار کرنے سے پہلے لکھ رہی تھی۔

میرے مالک! میں نہیں برداشت کر سکتی کہ آپ سے دھوکا کروں کہ دل میں کچھ ہو اور اوپر سے کچھ اور بن کر دکھاؤں۔ یہ میں گناہ کر رہی تھی، لیکن اب نہیں کروں گی۔ دنیا میں ایک آپ ہی ہیں جس کو میرے دل نے پیار کیا ہے۔

س کی شروعات کب ہوئی اس کا مجھے کچھ پتہ نہیں لیکن اتنا جانتی ہوں کہ اس دل میں اب کسی اور کے لیے جگہ نہیں۔ رہی کبھی اس جنم میں ہو گی — لیکن میں پہاڑ کی جس اونچی چوٹی پر چڑھنے کے لیے ترس رہی ہوں کیا وہاں تک میری پہنچ بھی ہے؟ اس بات کو بھی میں اچھی طرح جانتی ہوں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ وہاں پہنچنا تو دور رہا، پہنچنے کا تصور کرنا بھی میرے لیے انہونی بات ہے —!

لیکن یہ سب جانتے ہوئے بھی میں مایوس نہیں ہوں، مجھے اعتماد ہے کہ جہاں میرا دل پہنچ چکا ہے، جہاں میرے ہر ایک سپنے، میرے ہر ایک احساس اور ہر ایک سانس کا مرکز واقع ہے، وہاں اگر میرا جسم نہ پہنچے تو بے شک نہ پہنچے، میں جسمانی دوری پر بیٹھی بھی اس چندن کی باغیچی کی خوشبو سے ہی خود کو چندن بنا سکتی ہوں۔ یہ ہے میری اس چٹھی کا نچوڑ!

کیا کہا؟ ہمارے درمیان رکاوٹ؟ نہیں پریتم میں اس بات کو نہیں مانتی۔ رکاوٹ یہی نا کہ بیاہ ..... او میرے بھولے پریتم۔ اس بات کو دل سے نکال دیجیے۔ اس بات کا جواب تو آپ کو میرے اوپر کے جملوں سے ہی مل گیا ہو گا لیکن اتنا ضرور کہتی ہوں کہ آپ اپنی شادی ضرور کر لیجے۔ بلکہ میں آپ کو مجبور کروں گی کہ جلدی سے جلدی گھر کا دروازہ کھول لیے اور ماتا جی کی دیرینہ خواہش پوری کیجیے۔ آپ کے بیاہ کی خبر سن کر مجھے کتنی خوشی ہو گی اس کا جواب وقت ہی دے گا —!

آپ کی سُندری

(چھٹا خط)

سُندری جی!

میں کس قدر خوش قسمت ہوں کہ آپ جیسی عظیم دیوی کی محبت کو جیت سکا ہوں۔ میری اندھیری دنیا کو آج سُندری جی آپ کے پاک احساس نے، آپ کے اونچے خیالات نے اور آپ کی سچی محبت نے جگمگا دیا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے اندر کسی میٹھی راگنی کا انوکھا الاپ ہو رہا ہے جس نے دل کی ہر ایک لے کو چھیڑ کر میرے روم روم میں کبھی نہ ختم ہونے والی گونج پیدا کر دی ہے۔ آپ کے خط کا ایک ایک لفظ میرے لیے سورگ کی پھلواری کا ایک ایک پھول ہوتا ہے جس نے میرے دل و دماغ کو اتنا مہکا دیا ہے کہ اس کے مقابلے میں مجھے دنیا کے سارے سُکھ اور عیش و آرام ہیچ معلوم ہوتے ہیں۔

سُندری جی! آپ کے خیالات اتنے اونچے ہیں کہ آپ کے تصورات میں کائنات کا سارا پریم بسا ہوا ہے اور آپ کے ننھے سے دل میں قربانی کا اتنا بڑا جذبہ! یہ بات مجھے معلوم نہیں تھی۔

آپ نے میرا مطلب غلط سمجھا ہے۔ میں نے جو لکھا تھا کہ ہم دونوں کے درمیان ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے، وہ رکاوٹ دوسری ہے۔ اور یہ جو ذات برادری کے ڈر کی وجہ سے آپ کے ساتھ بیاہ نہ کرنا، اس تصور کو میں کب کا چھوڑ چکا ہوں۔ میرے اس طرح لکھنے کا مطلب تھا کہ گیانی جی کے اُپدیشوں اور اپنے فرائض کو سامنے رکھ کر اپنے دل میں ایک قسم کھا چکا ہوں کہ اپنی ساری زندگی سماج سدھار کے لیے صرف کر دوں گا۔ جب تک ماں کا دم ہے تب تک ہی میں یہاں

بیٹھا ہوں۔ اس کے بعد گھر کی محبت کو تلانجلی دے کر اسی کام میں خود کو لگا دوں گا۔

سُندری جی! میں دیکھ رہا ہوں اپنے بے رحم اور مورکھ سماج کی حالت۔ کس طرح آئے دن ان گنت معصوم جانیں اس کے ہون کنڈ میں راکھ ہو رہی ہیں۔ اسی وجہ سے میں سوچتا ہوں کہ بیاہ کے بندھن میں جکڑے جانے کے بعد مجھے اپنی منزل سے بھٹک جانے کا اندیشہ ہے۔ اگر میں دل پر پتھر رکھ کر اس بندھن سے پیچھے نہ ہٹا تو اس کے نتیجے کے طور پر آپ کی زندگی کے سُکھ اور آرام تو ایک طرح سے ختم ہو کر رہ جائیں گے اور آپ کو یا تو ہمیشہ کے لیے مجھ سے بچھڑ کر رہنا پڑے گا یا میرے ساتھ ہی بھوکے پیاسے سفر اور بے آرامی کی زندگی گزارنی ہوگی۔

لیکن آپ کا خط پڑھ کر میرے سارے اندیشے دور ہو گئے بلکہ میں یہ سوچ کر شرمندہ بھی ہو رہا ہوں کہ ایک الف بے پڑھنے والا طالبِ علم ہوتے ہوئے میں اپنی جماعت کے سیانے اور قابل مانیٹر سے کہہ رہا تھا کہ تیری میری دوستی نہیں نبھ سکتی، کیوں کہ میں صرف ایک سال میں ہی سارا سبق ختم کرنے کی قسم کھا چکا ہوں۔

سُندری جی! مجھے سارے سوالوں اور تمام شکوک کا تسلّی بخش جواب مل گیا ہے۔ اب میں خود کو اس دن خوش قسمت سمجھوں گا جس دن دیکھوں گا کہ آپ پر سماجی طور پر بھی میرا پورا حق ہے اور آپ میری ہیں۔ مجھے اگر ساری دنیا بھی اس کام سے باز رکھے گی تب بھی نہیں رکوں گا۔ چاہے مجھے کتنے ہی دکھوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے اور آپ کے ساتھ کو اپنے لیے فخر اور بڑائی کی بات سمجھوں گا۔

آپ کا
بچن سنگھ

(ساتواں خط)

کنیا آشرم
لاہور

زندگی کے سہارے!

میری زندگی کی ندی کا بہاؤ جیسے جیسے آپ کی طرف بڑھتا جاتا ہے، مجھے یہی معلوم ہوتا ہے کہ میں جنت کے قریب ہوتی جا رہی ہوں۔ دل میں پریم کے نئے جھرنے امڈتے آ رہے ہیں۔

ہم جس قدر اس موضوع کی طرف شک بھری نظر سے دیکھتے ہیں، ایک دوسرے سے اس کا جواب مانگتے ہیں تو آخر ان باتوں کے بارے میں ایسے نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ شکوک جو اوپر سے شکوک معلوم ہوتے تھے، اصل میں وہ دونوں دلوں کی وہ خواہش اور امنگ ہیں جن کا دنیا میں کوئی مقابلہ ہی نہیں۔

میری زندگی کے مالک! آپ کی فراخدلی نے میری آسوں اور امیدوں سے ہزار گنا زیادہ مجھے سکھی اور خوش قسمت

بنا دیا ہے۔ یہ کیسی خوشی ہے ؟ اس کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں ____

کہتے ہیں حد سے آگے جاکر ہر ایک چیز اپنی خوبصورتی اپنی ترقی اور اونچائی سے واپس لوٹنا شروع ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی بے تحاشا ہنستا چلا جائے تو آخر میں اس کی ہنسی رونے میں بدل جاتی ہے، اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ اس میں کچھ سچائی ہے تو اس کے تصور سے ہی دل دہل جاتا ہے۔ ڈر سے سہم کر میں بڑبڑا اٹھتی ہوں اور میرے تن من میں کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ میری خوشیاں اور میرے دل کی امنگیں اب تکمیل کی آخری حدوں تک جا پہنچی ہیں، اتنی زیادہ کہ انھیں سنبھالنے کے لیے مجھے اب دل میں جگہ نہیں ملتی اور وہ اس طرح پھوٹ پھوٹ کر باہر نکل رہی ہیں جیسے بھرے ہوئے گھڑے میں اور پانی ڈالیں تو وہ چھلک کر بہنے لگتا ہے۔

آہ پریتم! یہاں پہنچ کر پتہ نہیں کہاں سے نکل کر ایک انجانی سی فکر میرے ارد گرد چھا جاتی ہے اور میں بے چین ہو جاتی ہوں! یہ فکر بڑھتی بڑھتی کسی وقت اتنی ڈراؤنی شکل اختیار کر کے میرے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے کہ میرے دل میں بسا سُکھوں اور خوشیوں کا بھنڈار اس کی تہہ کے نیچے بالکل ہی دب جاتا ہے۔ میرا چنچل من طرح طرح کی دلیلیں گھڑنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے صبح کے وقت نسیمِ سحری جب باغ کی کلیوں کو نیچی نظر کیے اپنی طرف مسکراتے اور خوشبو کی لپٹیں چھوڑتے ہوئے دیکھتی ہے تو مست ہو کر اپنے آپ کو بھول جاتی ہے اور کلیوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگتی ہے۔ اس پیار کے کھیل کے انوکھے رس کو کلی کا نازک دل برداشت نہیں کر پاتا اور وہ خوشی اور مستی میں آکر اپنے آپے سے باہر ہو جاتی ہے۔ پھر اس کے کھلتے ہی مدھ ماتی ہوا کا پریم اس کی نازک پنکھڑیوں کو بکھیر کر رکھ دیتا ہے اور اس کی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اے میری زندگی کے سہارے مجھے بچا لیجیے، اس خیالی فکر کے پنجے سے۔ مجھے اپنے وجود میں چھپا لیجیے اور اسی جگہ چھپا کر رکھیے جہاں ایسے بے معنی خیالات میرے نزدیک نہ بھٹک سکیں ___ ہوش ہی نہیں رہا کہ خط میں کیا لکھنے بیٹھی تھی اور کیا لکھ گئی ہوں۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے کے لیے اب کوئی اور بات نہیں رہ گئی۔ یا یہ کہ اتنا کچھ باقی ہے کہ جسے ساری عمر لکھتی رہوں تو بھی شاید ختم نہ ہو۔ جو کچھ لکھنے لگتی ہوں اُسے لکھنے سے پہلے ہی آپ کے وجود میں چمکتا ہوا پاتی ہوں۔ تو پھر جانی بوجھی بات کو کیا بتاؤں؟

پریتم! بیاہ کا ذکر بار بار کیوں کرتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں بیاہ ہی ایک ایسی چیز ہے جو انسانی زندگی کو سُکھی اور سورگ کے برابر بنا سکتا ہے۔ اگر یہ ٹھیک ہے تو میں اس سے بہت دور جانا چاہتی ہوں کیوں کہ جو خوشیاں اور سُکھ مجھے آپ کی فراخ دلی، کشادہ ذہنی اور آپ کی محبت کے صدقہ میں اس وقت تک مل چکے ہیں ان کے ہوتے ہوئے میں کسی اور سُکھ کا تصور ہی نہیں کر سکتی، حاصل کرنے کی خواہش تو دور رہی۔ جیسا کہ پہلے کہہ چکی ہوں یہاں اور کی گنجائش ہی نہیں۔

آپ نے اپنی زندگی کو جس سانچے میں ڈھالنے کا اظہار کیا ہے میرے جیتے جی پریتم! اکیلے ہی اس سفر پر آپ نہیں چل سکتے۔ ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے۔ اوہ! کتنا عظیم اور مصمم ارادہ ہے آپ کا۔ جب سماج نے آپ کو

اس حالت تک پہنچایا ہے اس کے لیے ابھی تک آپ کے دل میں رحم کا جذبہ ہے؟ آپ پچھلے جنم کے کوئی تپسوی معلوم ہوتے ہیں ۔ جانتے ہیں کہ اس سلسلے میں میرا کیا خیال تھا جس کو آپ کی لکھی ہوئی دو سطروں نے بدل کر رکھ دیا ہے؟ سُنیے، میں اپنے سینے میں ایک زہر چھپائے بیٹھی تھی کہ اس بھائی چارے سے، اس سماج سے، جس نے میرے دل کے مالک کے ساتھ اس کے بے گناہ ہوتے ہوئے ظلم کیے ہیں، بدلہ لوں گی؟ اس کے دوغلے اور پاکھنڈی رہنماؤں کو وہ ناکوں چنے چبواؤں گی کہ ایک بار تو دنیا یاد رکھے اور یہ بھی سوچا تھا کہ ایسا کرنے کے لیے آپ کو تیار کروں گی۔

لیکن اب میرے پریتم! میری زندگی آپ میں جذب ہو چکی ہے ۔ اس لیے جس طرف آپ لگائیں گے اُسی طرف لگوں گی ۔ ہاں ایک بار پھر گذارش کرتی ہوں کہ جس مشکل راستے پر آپ چلنے والے ہیں، اس پر اکیلے نہ چل دینا ۔ مجھے بھی ساتھی بنا لینا ۔ آپ دیکھیں گے کہ میں آپ کی راہ کا روڑا نہیں بنوں گی اس بات پر شک نہ کیجیے گا۔

ہاں شادی کے بارے میں پھر لکھ دوں کہ اس کا خیال ابھی دل سے نکال دیں ۔ ہمیں اس کی قیمت چکانی ہے، کچھ دیر تپسیا کرنی ہے اور پھر ہم ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں گے قیامت تک کے لیے اور اس کے بعد بھی ہم ایک ہی رہیں گے۔ اس کے علاوہ یہ بھی بتا دوں کہ میرے اوپر بتائے ہوئے شک کو بھی بے معنی نہ سمجھیں ۔ اتنی خوشیوں کو ایک بار ہی نہ ہم اور نا ہی کوئی اور ہضم کرسکتا ہے۔

آپ کی سُندری

(آٹھواں خط)

دیوان پور

سُندری جی،

آج میں آپ کو جس تکلیف دہ واقعے کا حال لکھ رہا ہوں اس کو پڑھ کر دل کی چوٹ کو آپ کیسے برداشت کریں گی؟ یہ سوچ کر میرا دل ڈوبا جاتا ہے ۔ لکھتے ہوئے ہاتھ کانپ رہے ہیں ۔ اچھا ہوتا اگر یہ بری خبر آپ کو کوئی اور ہی سُناتا لیکن بدقسمتی سے یہ کام میرے ہی سپرد ہے ۔ میں کیا لکھوں سُندری جی، آپ کا بابا ۔ آہ ہر وقت آپ کے نام کی مالا جپنے والا آپ کا دھرم پتا، آپ کو آخری پیار بھیج کر، آپ کو دیکھنے کی خواہش کو دل میں ہی لے کر ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے چلا گیا ہے۔!

اس سے بھی بڑھ کر دل کو تکلیف دینے والی بات یہ ہے کہ بیچارے کی موت کتنی بھیانک ہوئی ۔ سُندری جی! میں آپ کو کیا بتاؤں ۔ کئی دنوں سے اس کا جسم اتنا کمزور ہو رہا تھا کہ جھونپڑی سے کم ہی باہر نکلتا تھا ۔ ہمیشہ کی طرح جب پرسوں شام کو میں روٹی دینے گیا تو وہ رو رہا تھا ۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا "سُندری سے ملنے کے لیے دل بہت بے چین ہے ۔ پتہ نہیں کتنے دن زندہ رہوں ۔ ایک بار لڑکی کو دیکھ لیتا تو اچھا ہوتا۔"

میں نے کہا" باباجی، یہ کون سی مشکل بات ہے۔ میں ہی سویرے جا کر سُندری کو لے آتا ہوں۔"

لیکن اس نے ایسا کرنے سے روکتے ہوئے کہا" اس کی پڑھائی کا حرج ہو گا اور پھر اس کو یہاں لانا خطرے سے خالی نہیں۔ گاؤں کا بدمعاش پالا سنگھ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑا ہوا ہے کہ میں سُندری کا اس کے ساتھ بیاہ کر دوں۔ پہلے تو اس نے مجھے لالچ دیے لیکن جب میں نہ مانا تو پھر کئی طرح کی دھمکیاں دینے لگا۔ آخر یہاں تک کہہ دیا کہ اگر تم سیدھی طرح سے میری بات نہیں مانو گے تو میں اپنے آدمیوں سے تجھے مروا ڈالوں گا اور سُندری جب تیرے مرنے کی خبر سُن کر آئے گی تو اس کو زبردستی اُٹھا کر لے جاؤں گا۔"

سُندری جی! جس وقت بابا یہ باتیں کر رہا تھا اُس وقت اُس کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ میرا جسم بھی غصے سے کانپ رہا تھا۔ میں نے اُسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا" باباجی۔ میرے ہوتے ہوئے کس کی ہمت ہے جو سُندری یا آپ کی طرف میلی آنکھ سے دیکھ جائے؟"

اس کے بعد میں نے اُسے گھر لے جانے کی بڑی کوشش کی لیکن وہ نہ مانا اور کہنے لگا" سردار جی، میرا کیا ہے میں تو پہلے ہی دریا کے کنارے اُگا ہوا پیڑ ہوں۔ آج مرا، کل دوسرا دن۔ میں پرماتما کے آگے دونوں ہاتھ جوڑتا ہوں کہ مجھے چلتے پھرتے ہی اُٹھا لے۔ جسم اب بالکل ہی رہ گیا ہے۔ زیادہ فکر سُندری کی تھی، سو وہ آپ کی مہربانی سے دور ہو گئی ہے۔"

پھر میں نے اس سے کہا" باباجی، آپ میرے ساتھ لاہور چل کر سُندری سے مل آئیے۔" اس پر وہ رضامند ہو گیا اور دوسرے دن میرے ساتھ لاہور چلنے کی صلاح پکی ہو گئی۔

اُسی روز کو قریباً آدھی رات کے وقت شور کی آواز سے میری نیند کھل گئی۔ "آگ! آگ!" کی چیخ پکار سُن کر میں بھونچکا سا گھر سے باہر نکلا۔ گلی میں آکر سُنا کہ بابے روڈو کی جھونپڑی میں آگ لگ گئی ہے۔ میں تیز تیز بھاگتا ہوا گیا۔ جا کر دیکھا تو بہت سے لوگ اکٹھے ہو چکے تھے۔ لوگوں نے بابے کا جُھلسا ہوا جسم نکال کر ایک طرف رکھ دیا تھا۔ جھونپڑی راکھ کا ڈھیر بن چکی تھی۔ پانی پڑنے کی وجہ سے اس کی ادھ جلی لکڑیاں سُلگ رہی تھیں۔ میں بھیڑ کو چیرتا ہوا بابے کے پاس پہنچا۔

آہ سُندری جی! اس وقت اس کا حلیہ بیان کر کے میں آپ کے دکھوں کی جلتی ہوئی آگ پر تیل نہیں چھڑکنا چاہتا۔ مجھ میں دیکھنے کی طاقت نہیں تھی۔ میں نے دل کڑا کر کے اس کے جسم کو ٹٹولا۔ تھانیدار اور دو تین سپاہی موجود تھے۔ پہلے کافی دیر تک تو سب یہی سمجھتے رہے کہ وہ مر چکا ہے۔ لیکن کچھ دیر بعد اُس کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ میں نے اُسے کئی آوازیں دیں۔ اس نے نظر بھر کر میری طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا" سردار جی!"

میں" ہاں جی" کہہ کر اس سے کچھ اور پوچھنے لگا تو تھانیدار نے اس موقعے کو غنیمت سمجھ کر اس سے سوال کرنے شروع کر دیے۔ بابا تھوڑا بہت ہوش میں معلوم ہوتا تھا۔ تھانیدار نے پوچھا" بابا"

اُس نے سر ہلایا۔

تھانیدار نے پوچھا "آگ کس نے لگائی تھی؟"

بابے نے اس کے جواب میں ایک بار آسمان کی طرف دیکھا، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ نیک دل بابا اپنے قاتل کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور اس واردات کو ایک ہونی سمجھ کر صبر کا اظہار کر رہا تھا۔

اس نے تھانیدار کو کوئی جواب نہ دیا۔ اس میں اب اشارہ کرنے کی بھی طاقت نہیں تھی۔ اس نے آس پاس کھڑی بھیڑ کی طرف ایک نظر بھر کر دیکھا اور پھر مجھ پر آ کر اس کی نظر ٹھہر گئی۔ میں نے سر جھکا کر کہا "کیوں بابا جی۔ کچھ کہنا ہے؟"

وہ کچھ نہ بول سکا اور اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ پھر معلوم ہوا جیسے کچھ بولنا چاہتا ہے لیکن بول نہیں پا رہا۔ کئی بار اس کے ہونٹ پھڑ پھڑائے لیکن میں اس کا کچھ بھی مطلب نہ سمجھ سکا۔ پھر اس نے مجھے نزدیک آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے جب کان بالکل اس کے ہونٹوں سے جوڑ دیے تو بڑی کوشش کرنے پر صرف اتنا ہی سمجھ آیا "س س سند۔ ری"

میں نے پوچھا "بابا جی۔ سُندری سے ملنا ہے؟"

اُس نے ہاتھ کو آہستہ آہستہ اس طرح گھمایا جیسے کوئی ڈمرو بجانے والا گھماتا ہے۔ میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ کہہ رہا تھا "اب کھیل ختم ہو گیا ہے۔ سُندری سے میں نہیں مل سکتا۔" پھر میں نے پوچھا "سُندری سے کچھ کہنا ہے؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا لیکن اس کی چھلکتی آنکھیں ایک ٹک میرے چہرے پر دیکھ رہی تھیں جیسے وہ مجھ سے کسی بات کا جواب حاصل کرنا چاہتا ہو۔ میں اس کا مطلب سمجھ کر بولا "بابا جی۔ سُندری کی فکر نہ کیجیے۔ میں اس سے شادی کروں گا۔"

یہ بات کہنے کی دیر تھی کہ اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی اور ہونٹوں پر ہلکی سی مُسکراہٹ۔ پھر اس نے شاید میرا شکریہ ادا کرنے کے لیے اپنے دونوں ہاتھوں کو اس طرح ملایا جیسے انھیں جوڑنا چاہتا ہو۔ آہستہ آہستہ وہ اپنے ہاتھوں کو ایک دوسرے کے نزدیک لانے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن ابھی ہتھیلی بھر کا فاصلہ باقی تھا کہ اس کے دونوں بازو بے جان ہو کر چھاتی پر گر پڑے اور اس کی گردن کندھے کی طرف ڈھلک گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے منہ سے یہی بات سننے کے لیے اس کی سانس اٹکی ہوئی تھی۔ آہ سُندری جی! وہ ہمیشہ کی نیند سو گیا!

پولیس نے شک میں بالا سنگھ اور اس کے چاروں ساتھیوں سوایا سنگھ اور ویر سنگھ وغیرہ کو گھر پر جا کر گرفتار کر لیا۔

اُف کتنا ڈراؤنا واقعہ تھا۔ ابھی تک اس کی شکل میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ میری ماں جی نے جب سے یہ بات سُنی ہے اُن کے آنسو نہیں تھمے۔ معلوم ہوتا ہے ان کے دل میں بڑی تبدیلی آ گئی ہے۔

سُندری جی۔ پرماتما کی مرضی میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔ ہمیں کسی سے بدلہ لینے کا خیال کبھی دل میں نہیں لانا چاہیے۔ بدلہ لینا بھگوان کے ہاتھ میں ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں ہمارے اصولوں سے نہ گرا سکے، ہماری بہادری اسی میں ہے۔

آج کا خط پڑھ کر آپ کے دل کی کیا حالت ہو گی اس کو میں سمجھ رہا ہوں۔ اسی وجہ سے اور کچھ نہیں لکھتا۔ میں آپ کو تاکید کرتا ہوں کہ دل کو زیادہ دُکھی نہ کریں بلکہ حوصلے اور ثابت قدمی سے اس دُکھ کا سامنا کریں۔

ابھی ابھی خط لکھتے ہوئے خبر ملی ہے کہ پالا سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو پولیس نے معمولی ضمانتیں لے کر چھوڑ دیا ہے۔ اس کی وجہ ایک تو روپے کا چمتکار اور دوسرے گاؤں کے لوگوں کی فراخدلی بتائی جاتی ہے۔ جوان کو بچانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ مجھے پہلے ہی یہ امید تھی۔

آپ کا

بچن سنگھ

(نواں خط)

کنیا آشرم

پران ناتھ

چٹھی ملی۔ آہ بابے کی موت کی خبر نے میرے دل میں جو ہلچل مچائی ہے اس کا میں کیا ذکر کروں؟ سب سے بڑی حسرت یہ ہے کہ اس کے ساتھ آخری ملاقات بھی نہ ہو سکی کہ وہ پیار بھرا ہاتھ میری پیٹھ پر پھیرتا اور میں پدرانہ محبت کا آخری پیار پاتی لیکن قسمت میں نہیں لکھا تھا۔ دل رو رہا ہے اور ہزار کوشش کرنے کے بعد دل کو تسکین نہیں ہو پاتی۔ ہر لمحہ اندر سے کوئی اُبال سا اٹھتا ہے اور دل کو چیرتا ہوا اندر ہی اندر گم ہو جاتا ہے لیکن جب آپ کا خیال آتا ہے تو مجھ گرتی کو ستون کا سہارا مل جاتا ہے۔

آہ! ایک مرے ہوئے غریب کو، جس کا کسی سے کچھ لینا دینا نہیں تھا، جو گلی کے تنکوں کو بھی تکلیف دینے سے ڈرتا تھا، ظالموں نے جینے نہ دیا۔ اس کو مارنے والے خونیوں کو سزا دلانے کی بجائے لوگ ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اس وجہ سے بچانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ان کے سماج میں ظالموں اور خونیوں کی کمی نہ ہو جائے۔!

آہ میرے مالک! آپ اس سماج کے سُدھار کے لیے تڑپ رہے ہیں اور اس کو سدھار لینے کی امید رکھتے ہیں؟ کیا آپ نے اتنا کچھ دیکھنے کے باوجود یہ نتیجہ نہیں نکالا کہ جن کے دل گناہوں کی آگ سے جھلسے پڑے ہیں ان کا کوئی علاج نہیں۔ کیا آپ اُن لوگوں کے سُدھار کے خواب دیکھ رہے ہیں جن کے دل کینے کی آگ میں جھلسے ہوئے ہیں، جن کے دماغ غرور سے بھرے ہوئے ہیں اور جن کے بازو سفید لہو سے مردہ ہو چکے ہیں۔ کیا آپ اس پتھریلی زمین میں سُدھار کا بیج بونے اور پھر اس کے اُگنے کی امید رکھتے ہیں؟

نہیں نہیں میرے سر کے تاج۔ اس خیال کو دل سے نکال دیجیے۔ جس پہاڑ کو آپ سر کی ٹکروں سے توڑنا چاہتے ہیں وہ اس طرح کبھی نہیں ٹوٹے گا بلکہ آپ خود ہی اپنا آپ گنوا دیں گے۔ اس پہاڑ کو توڑنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی جڑیں کھوکھلی کی جائیں اور ان لوگوں کے جسموں میں دوڑتے ہوئے سفید خون کو نکال کر زمین پر گرا دیا جائے۔ جب تک ان کے جسموں میں سفید خون کی ایک بوند بھی باقی رہے گی تب تک آنے والی نسلوں پر ان کا اثر پڑنے سے

نہیں رُکے گا۔

اوہ! میں غصّے میں کیا اوٹ پٹانگ لکھے جا رہی ہوں۔ پریتم۔ میری غلطی معاف کیجیے گا۔ اس وقت میری دماغی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ بے شک آپ کو اس میں میرے دلی جذبات کا رنگ جھلکتا محسوس ہو گا لیکن یہ میری کم عقلی کی وجہ سے ہے۔ اس وجہ سے میں ان بے ڈھنگے خیالات کو ہر وقت دل سے نکالنے کی کوشش کرتی رہتی ہوں۔ شاید ان کا اظہار ہی نہ کرتی اور کسی حد تک ان کو عملی جامہ پہنانے کی بھی کوشش کرتی لیکن یہ آپ ہیں جن کے سامنے مجھے ہر ایک الٹے خیال کو اپنے دل سے نکال دینے یا باد دینے کے لیے مجبور ہونا پڑتا ہے۔

میری دلی خواہش ہے کہ واہیگورو آپ کے ہی خیالات کو کامیابی بخشے اور مجھے بھی ایسی ہی طاقت دے کہ میرے دل میں کوئی ایسا جارحانہ خیال آئے بھی تو میں سانپ کی طرح اس کے سر کو کچل کر خود کو اس سے نجات دلاتی ہوئی آپ کے ہی اصولوں پر چلنے کی کوشش کروں۔

میرے سرتاج! مجھے اپنے اس چنچل من پر بھروسہ نہیں رہا۔ یہ مجھے گمراہی کی طرف لے جانے کی کوشش کرتا ہے اور بدلے کی آگ کسی کسی وقت میرے دل میں ایسی بھڑک اٹھتی ہے کہ میں اپنے آپے سے باہر ہو جاتی ہوں۔ اس لیے اب میری آپ سے یہی گزارش ہے کہ مجھے اپنے حکم کے تحت اور اپنے ہی سائے میں رکھیں۔

آج جی بہت خراب ہے۔ اور کچھ نہیں لکھتی۔ جو کچھ لکھا ہے وہ بھی بھیجنا نہیں چاہتی تھی لیکن بھیج رہی ہوں۔ مجھے پتہ ہے کہ آپ کا دل کتنا کشادہ اور وسیع ہے۔ سنجیدگی آپ میں کس قدر کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ آپ میری ہر ایک غلطی کو معاف کر سکتے ہیں۔ مجھے آ کر لے جائیے۔ میں اپنے دھرم پتا کی جلی ہوئی جھونپڑی دیکھنے کے لیے بے چین ہوں اور میری پڑھائی بھی لگ بھگ ختم ہو چکی ہے۔

آپ کی سُندری

(دسواں خط)

دیوان پور

سُندری جی

اتنی بے قراری؟ اتنا غصّہ؟ لیکن پھر بھی آپ کی تحریر اس قدر بامعنی دلیلوں سے بھری ہے کہ ان کے سامنے میں سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ لیکن میری سُندری جی، آپ نے یہ جو مثال پہاڑ کی دی ہے اسے پڑھ کر مجھے ہنسی آ رہی ہے۔ اس میں آپ خود ہی پھنس گئی ہیں۔ جب آپ کہتی ہیں کہ پہاڑ ماتھا ٹکرانے سے نہیں ٹوٹے گا، جڑیں کھوکھلی کرنے سے ہی ٹوٹے گا اور اس سلسلے میں آپ کا جو پروگرام ہے وہی تو بالکل سر ٹکرانے والی بات ہے۔ یعنی سماج میں کسی کے خون کا بدلہ کسی کے خون سے لے کر اس کے سُدھار کی امید رکھنی تو سچ مچ پہاڑ سے ٹکریں مارنے کے برابر ہے۔ اس کے

برعکس عملی پرچار اور اونچے خیالات سے اس پر اثرانداز ہونا، یہ ہوا اُس پہاڑ کی جڑوں کو کھوکھلا کرنا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی آپ کی کشادہ دلی کی بھی میں داد دیتا ہوں۔ آپ اپنے خیالات پر یقین رکھتے ہوئے بھی انھیں چھوڑ کر میرے پیچھے چلنے کی بات سوچتی ہیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ جب آپ میرے اس سفر کی ساتھی بنیں گی تو آپ کو اپنے یہ آج والے خیالات اتنے ہی غلط معلوم ہوں گے جتنا کہ دن کو رات کہنا۔

یہ میں دیکھ رہا ہوں کہ ہمارے سماج کا خون دن بدن سفید ہوتا جا رہا ہے لیکن اس کا سُدھار کرنے کے لیے جو علاج آپ کرنا چاہتی ہیں وہ اتنا ہی بھیانک ہے جتنا کہ پاگل کتے کے کاٹے ہوئے کو کوئی نہلا کر ٹھیک کرنا چاہے۔

سُندری جی۔ ہمیں پرچار کے ٹیکے سے ایسے سفید لہو والے بیماروں کے اندر ایسی دوائی داخل کرنی ہو گی جس کی مدد سے لوگوں کے خون میں شامل سفید (بے جان) جرثومے خارج ہوتے جائیں اور ان کی جگہ لال (زندہ) جرثومے پیدا ہوتے جائیں۔

اس کام کے لیے میں نے ہر طرح سے کمر کس لی ہے اور اب ہم اس کام کے لیے ایک اور ایک دو نہیں بلکہ گیارہ ہوں گے۔ میں چار یا پانچ دنوں بعد آپ کو لینے آؤں گا۔ ماں جی کو میں نے رضامند کر لیا ہے کہ وہ میرے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالیں گی، نہ ہی آپ کے ساتھ مل کر کام کرنے میں ان کو کوئی اعتراض ہو گا لیکن اس کے عوض ان کی ایک شرط مجھے ضرور ماننی پڑی ہے کہ جب تک وہ زندہ ہیں تب تک میں کہیں دور نہیں جا سکتا۔ اس لیے مجھے امید ہے کہ آپ بھی اپنے آپ کو ابھی سے اس کام کے لیے تیار کر لیں گی۔

ہماری اس سلسلے میں کیا منزل ہو گی یہ تو دونوں اکٹھے بیٹھ کر فیصلہ کریں گے لیکن ابھی ہمیں گھر پر ہی ایک چھوٹا سا کام مل گیا ہے جس سے ہم اپنی اس نئی زندگی کی شروعات کریں گے۔ تھوڑے دنوں کے بعد ہمارے گاؤں کے لالہ رلا رام کی لڑکی کا بیاہ ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ اس بیاہ کے موقعے پر بیسواؤں کا ناچ گانا، بھانڈوں کے کھیل، شراب کے دور اور کئی طرح کی فضول خرچیوں میں ہزاروں روپے پانی کی طرح بہائے جائیں گے۔

سُندری جی۔ کتنی شرم والی بات ہو گی جب ہمارے بڑے بڑے بزرگ گھیرا بنا کر بیسوا کا ناچ گانا دیکھ سُن رہے ہوں گے اور ان کی بیٹیاں، بہنیں اوپر کھڑکیوں میں بیٹھ کر یہ سب کچھ دیکھ رہی ہوں گی۔ کیا ان کے لیے چلّو بھر پانی میں ڈوب مرنے کی بات نہ ہو گی۔ میرا خیال ہے کہ شاید سمجھانے بجھانے سے وہ اس ذلیل کام سے باز آ جائیں۔

بس اور زیادہ کیا لکھوں۔ آج سے پانچویں دن آپ کے پاس ہی ہوں گا۔

آپ کا
بچن سنگھ

ایک بات اور۔ چٹھی ختم کر چکا تھا کہ آپ کو مبارکباد دینے کا خیال آیا۔ آپ کے نام سے پنجابی رسائل میں آج کل کافی کہانیاں چھپ رہی ہیں۔ اس دن شہر گیا تو دیکھ کر میں دنگ ہی رہ گیا۔ یہ تو آپ نے کمال کر دیا۔ اپنے سماج کی سنگ دلی

بیان کرنے میں آپ نے حد کردی ہے۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ کسی دن میری سُندری بہت اونچے درجے کی کلاکار بنے گی۔

بس سندری جی۔ جہاں آپ کے لکھنے کی کامیابی کے لیے دل سے مبارکباد دیتا ہوں وہاں معمولی سا مشورہ دینے کی بھی اجازت چاہتا ہوں کہ آپ کی تحریروں میں کوملتا اور ٹھہراؤ کی زیادہ ضرورت ہے۔ مانا کہ سماج کے ہاتھ سے ستائی ہوئی دُکھی روح کے قلم سے یہی کچھ نکل سکتا ہے لیکن مجھے آپ سے ایسی تحریروں کی امید ہے جس میں ہنسا اور سنگ دلی کے لیے کوئی گنجائش نہ رہے۔ لہو سے لہو نہیں دھویا جاتا۔ کیا آئندہ اپنی تحریروں میں اتنی سی تبدیلی لانے کی کوشش کریں گی؟

(۲۳)

سُندری نے دیوان پور پہنچ کر سب سے پہلے اپنے دھرم پتا کی آتش زدہ یادگار کو نمسکار کیا اور اس کی راکھ ماتھے پر لگائی۔ بجھی ہوئی لکڑیوں کے ٹکڑے اور کچھ راکھ وہاں ابھی تک موجود تھی۔ سُندری کے لیے یہ معمولی راکھ نہیں تھی۔ اس کی بیتی زندگی کی تصویر تھی۔ ہوش سنبھالنے سے لے کر لاہور جانے کے دن تک ایک لمبے وقت کا عکس اس کے سامنے تھا۔ روڈو کی پدرانہ محبت کا ایک ایک لمحہ اُسے یاد آتا اور اس کے دل کو پاش پاش کر دیتا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر وہاں بُت بنی بیٹھی آنسو بہاتی رہی اور پھر بچن سنگھ کے بار بار کہنے پر وہاں سے اٹھی۔

سُندری کے رہنے کا انتظام بچن سنگھ نے پہلے ہی کر رکھا تھا۔ اُسے اپنے گھر لے جا کر وہ ماں کا دل دُکھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

روانی گاؤں کے کچھ باشندوں نے کچھ عرصے سے اپنے گاؤں میں ایک کنیا پاٹھ شالا کھولی ہوئی تھی۔ وہاں کے کچھ آدمی بچن سنگھ کی کافی عزت کرتے تھے۔ وہاں چار پانچ آدمیوں کی ہمت سے اچھی جاگرتی پیدا ہو گئی تھی۔ اسی وجہ سے بچن سنگھ کی وہاں بڑی عزت تھی۔ اپنے پرچار کا مرکز بنانے کے لیے بچن سنگھ نے اسی جگہ کو پسند کیا تھا۔

سُندری کو اس اسکول میں استانی مقرر کیا گیا۔ اُسے من پسند ٹھکانے پر پہنچا کر بہت بڑی فکر دور ہو گئی اور پھر دیوان پور سے روانی گاؤں کا زیادہ فاصلہ بھی نہیں تھا۔ صرف پون میل کی دوری تھی۔

. . . .

لالہ رلا رام کے گھر بارات آنے والی تھی۔ اس وقت ہونے والے شور شرابے کو روکنے کے لیے بچن سنگھ کتنے ہی دنوں سے بھاگ دوڑ کر رہا تھا لیکن ابھی اُسے کامیابی نہیں ملی تھی۔ سارا گاؤں ایک تو ویسے ہی بچن سنگھ کا مخالف تھا دوسرے وہ لوگ بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے کہ وہ وقت جلد آئے جب وہ دو پل تفریح سے لطف اندوز ہوں۔ اس کے لیے لالہ رلا رام نے سارے گاؤں کو دعوت دے رکھی تھی۔ گاؤں کے لوگ جیسے جیسے سنتے تھے کہ دتی کی ایک مشہور رنڈی آنے والی ہے، اُن پر شراب سی چڑھتی جاتی تھی اور وہ ایک ایک لمحہ گن گن کر وقت گزار رہے تھے۔

اِدھر جس وقت سُندری رَوانی پہنچ کر اپنے رہائشی مکان میں اپنی چیزیں ترتیب سے رکھ رہی تھی اسی وقت بچن سنگھ سارا دن دوڑ دھوپ کرنے کے بعد اس کے مکان پر آیا اور باہر سے آواز دی۔ سُندری ہاتھ کا کام وہیں چھوڑ کر اُس کے پاس آکر بولی "صبح جب سے گئے، لوٹ کر مُنہ ہی نہیں دکھایا؟"

پیار بھری مسکراہٹ کے ساتھ بچن سنگھ بولا۔ "کیا بتاؤں سُندری جی۔ میں تو پریشان ہو گیا ہوں ٹکریں مار مار کر۔" یہ کہتے ہوئے وہ اندر جا کر ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ سُندری نے گھبراتے ہوئے پوچھا "کیوں؟"

اس نے قمیض کے بٹن کھول کر رومال سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا "آپ کو بتایا تھا کہ منگل کے دن رلا رام کے ہاں بارات آنے والی ہے۔"

"جی بتایا تھا۔"

"اور آج ویروار ہے۔"

"پھر؟"

"کل بارات آئے گی۔"

"تو پھر؟"

"یہی کہ ہمیں کام کی فکر کرنی چاہیے۔" سُندری پیار سے اُس کے چہرے کی طرف دیکھتی ہوئی بولی "تو پھر ڈھیل کیوں کرتے ہیں؟"

"میں سوچ رہا ہوں شاید مجھے اس میں کامیابی نہیں ملے گی۔"

"کیوں؟"

"اگر اکیلے رلا رام کو رضامند کرنا ہوتا تو بات مشکل نہیں تھی۔ لیکن یہاں تو مدعی سُست اور گواہ چُست والی بات ہے۔ سارا گاؤں ہی آنے والی رنڈی کے لیے بے قرار ہے۔"

"تو کیا ہمارے اس نئے بیوپار کا پہلا ہی سودا گھاٹے والا رہے گا؟"

"گھاٹے والا ہی نہیں، ساری کی ساری پونجی برباد۔"

"پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟"

"یہی کہ ایک بار پھر رلا رام کے ہاں جاؤں۔ شاید تیر تکا لگ ہی جائے۔"

"اور اب کہاں سے آرہے ہیں؟"

"کئی جگہوں پر سے دھکے کھا کر آرہا ہوں۔"

"پھر کیا جواب ملا؟"

"بس ٹال مٹول۔"

"اور رلا رام کی طرف ہوتے ہوئے کیوں نہ آئے۔ اب پھر میل بھر سفر کرنا پڑے گا۔"

"آنے کی وجہ صرف آپ سے ملنا ہی نہیں تھا بلکہ یہاں کے ایک دو معتبر آدمیوں کو ساتھ لے جانے کا ارادہ ہے۔"

تھوڑی دیر اور بات چیت کرنے کے بعد بچن سنگھ چلا گیا اور سُندری اکیلی بیٹھی کسی گہری فکر میں غرق ہو گئی۔

... * ...

کچھ دیر بعد بچن سنگھ دیوان پور پہنچ کر رلا رام کی بیٹھک میں جا پہنچا۔ روانی گاؤں کا کوئی آدمی اس کے ساتھ نہ گیا۔ بیاہ کی تیاریاں بڑی سرگرمی سے ہو رہی تھیں۔ ایک طرف درزی بیٹھے جہیز کے کپڑے سی رہے تھے۔ دوسری طرف گاؤں کے چودھری، پنچ حکم کے انتظار میں کھڑے تھے۔ شاہ کا لڑکا دینا ناتھ ان کے ذمّہ کام سونپ رہا تھا۔ اندر سے مٹھائیوں اور پکوانوں کے پکنے کی خوشبوئیں آ رہی تھیں اور لڑکیوں نے ڈھولکوں پر اودھم مچایا ہوا تھا۔

گاؤں کے پنچوں میں پالا سنگھ بھی بیٹھا تھا اور اس کے ساتھی بھی۔ اُس کی طرف دیکھ کر پالا سنگھ کا خون ایک بار اور کھول اُٹھا لیکن پھر بھی اُس نے اپنی اِس حالت کو چھپانے کی کوشش کی۔ اُسے اندر آتے دیکھ کر اشارے ہونے لگے۔

اُس نے سب کو فتح بلائی اور پھر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ کسی کو دم مارنے کی فرصت نہیں تھی۔ سب اپنے اپنے کام دھندے میں لگے ہوئے تھے۔ بچن سنگھ کے دل کو جیسے کوئی چٹکیوں سے مَسل رہا تھا۔ وہ جس کام کے لیے آیا تھا، اس کام کا ہونا تو دور رہا، یہاں تو اس کا ذکر چھڑنے کا موقعہ بھی نہیں مل سکتا تھا۔

کافی دیر وہ دلیلوں میں ڈوبا رہا۔ اتنے میں اُس نے دیکھا کہ کھڑاؤں کی کھٹ کھٹ کرتے بھائی جی بھی اندر آئے۔ بچن سنگھ بے شک بھائی جی کی کرتوتوں اور حرکتوں سے ناواقف نہیں تھا پھر بھی اُسے کچھ امید ہوئی کہ میری بات کی یہ تائید ضرور کریں گے۔

جتنے آدمی بیٹھے تھے سب نے بڑے ادب اور احترام سے بھائی جی کو فتح بلائی اور "یہاں بیٹھیے" کا شور سا مچ گیا۔ لالہ رلا رام کو اس وقت تھوڑی سی فرصت تھی، وہ آ کر بھائی جی سے باتیں کرنے لگا۔ بچن سنگھ نے بھی موقعہ دیکھ کر دل کو مضبوط کیا اور بولا "شاہ جی؟"

شاہ جی نے لاپرواہی سے بلکہ روکھا سا مُنہ بنا کر اُس کی طرف دیکھا اور بولا "ہاں جی کیا بات ہے بچن سوں جی؟"

وہ بچن سنگھ کے متعلق پالا سنگھ سے شاید بہت کچھ سُن چکا تھا۔

اُس کی تیکھی نظر نے بچن سنگھ کے پاؤں کے نیچے سے پوری طرح زمین نکال دی اور وہ گھبرا گیا۔ جیسے گرتی ہوئی چھت کو آدمی بازوؤں کے سہارے تھوڑی دیر کے لیے روک لیتا ہے اسی طرح بچن سنگھ نے زبردستی دل کو تھام کر کہا "میں وہی عرض کرنے آیا تھا۔"

"بتائیے ؟"

"آپ کو پتہ ہے اس میں میرا کوئی فائدہ تو ہے نہیں ۔ برادری کے نفع نقصان کا سوال ہے ۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم اتنا تو ضرور ہونا چاہیئے کہ گاؤں میں رنڈی نہ آئے ۔ اس کا سب سے بُرا اثر ہماری بہنوں بیٹیوں پر پڑے گا ۔"

شاہ جی کے چہرے پر غصے کے آثار پیدا ہو گئے اور وہ ذرا طیش میں آ کر بولے ۔ "بچن سوں جی آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ آپ خواہ مخواہ ہماری خوشی کے کام میں رکاوٹ نہ ڈالیں ۔ اور پھر جس کام میں میرا ہاتھ نہیں، تعلق نہیں اُسے میں روک بھی کس طرح سکتا ہوں ؟ آپ جانتے ہیں سمدھیوں کا پیار ، سوت کے کچے دھاگے سا ہوتا ہے ۔ اگر تھوڑا سا بھی دلوں میں مَیل آ جائے تو ساری عمر کی ناراضگی پیدا ہو جاتی ہے ۔ کسی نے کہا ہے "منگنی کا مزا بیاہ تک اور بیاہ کا مزا عمر دن تک ۔ اسے ..."

اس نے ابھی بات ختم نہیں کی تھی کہ پاس سے ایک بولا ۔ "اور یہ کوئی بات ہے ؟ ناچ مجرا تو پیسے والوں کا سنگار ہوتا ہے ۔ بچن سنگھ کاکا ، خوشی کے کام میں اڑچن نہیں ڈالنی چاہیئے اور پھر شاہ جی کے ہاں چار گھروں میں خیر سے ایک ہی لڑکی ہے ، اگر اس کی خوشیاں نہ دیکھیں تو اور کس کی دیکھیں گے ؟ (بھائی جی کو) کیوں بھائی جی ، میں نے بات سچی کہی ہے یا جھوٹی ؟"

بھائی جی ، جواب تک ناخن سے دانتوں کی مَیل اتار کر کُرتے سے پونچھ رہے تھے ، آگے نکلے ہوئے دانتوں پر زبان پھیر کر بولے ۔ "ٹھیک ہے مہاراج آن کر کر کے ۔ ایسے دن کوئی بار بار آتے ہیں ؟"

بچن سنگھ گھبرا کے بولا ۔ "بھائی جی ! کیا یہی گورو دھرم کا اصول ہے کہ آپ ایسے شریف آدمی بیچ میں بیٹھ کر رنڈیوں اور شراب کا پرچار کریں ۔ آپ گوردوارے کے گرنتھی ہیں ۔ اپنے فرائض کو اس طرح نہیں بھولنا چاہیئے ۔"

بھائی جی تو ذرا سہم گئے لیکن پالا سنگھ سے نہ رہا گیا ۔ "تو گورو دھرم کا اصول یہ ہے کہ جن بیچاروں کی کمائی کرنے والا کوئی نہیں اُن کے مُنہ سے نوالا چھین لیا جائے ؟ اور وہ پیسہ کوئی ایسے تو نہیں لے جاتیں ۔ سینکڑوں آدمیوں کا دل خوش کرتی ہیں راگ سُنا کر اور پھر شراب میں بتائیے بھلا کون سی بُری چیز پڑتی ہے ، ببول کے چھلکے اور گڑ ۔"

پالا سنگھ کی بات کا بچن سنگھ نے کوئی جواب نہ دیا ۔ اور دیتا بھی کیا ؟ جہاں "خدا نزدیک کہ لاٹھی" والی بات ہو ۔ ادھر پالا سنگھ کی مدد سے بھائی جی کو حوصلہ ہو گیا اور ٹانگ کھجلاتے ہوئے بولے ۔ "شراب تو آن کر کر کے ایک دوائی ہے ۔ یہ چیز بُری نہیں لیکن زیادہ پینی ضرور بُری ہوتی ہے آن کر کر کے ۔"

بچن سنگھ کا جوان خون کھول رہا تھا لیکن اس نے سوچا ان تلوں میں تیل نہیں ۔ تب بھی بھائی جی کی بھدی دلیل کا جواب دینے سے وہ نہ رہ سکا اور ان کی طرف گھور کر بولا ۔ "ٹھیک ہے ۔ بُری چیز نہیں ، بہت اچھی چیز ہے لیکن گیول جی شبد کی اس سطر کے کیا معنی ہیں ؟"

" جھوٹا مدمول نہ ہیجٔی جیکا پاردسائے۔"

کچھ دیر سوچ کر بھائی جی کان کے چھلے کو گھماتے ہوئے بولے " مہاراج اس کے معنی تو آن کر کر کے ٹھیک ہے، بھئی شراب نہیں پینی چاہیئے، جہاں تک بس چلے۔ لیکن اگر آدمی کے بس کی بات نہ ہو تو آن کر کر کے وہاں کیا کیا جائے؟"

غصے میں بھی بچن سنگھ کو زبردستی ہنسی آ گئی۔ اب سب لوگ اپنی اپنی دلیلیں دے کر ثابت کرنے لگے کہ دونوں کام برے نہیں ہیں۔

بچن سنگھ نے اپنی طرف سے سمجھانے کی کافی کوشش کی لیکن آخر وہ یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ یہاں اس کی کوئی پیش نہیں جا سکتی۔

آخر اس پانی کو بلونے کی بجائے اس نے چپ رہنا ہی مناسب سمجھا اور وہ دبے پاؤں وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

اسی وقت پالا سنگھ نے ایک ساتھی کے کان میں منہ لگا کر کہا۔ " ویرو دیکھی اس گدھے کی عقل!"

وہ بولا " عقل کی بات چھوڑو۔ یہ جان بوجھ کر شیطانی کرنے میں لگا ہے کہ جہاں ہم بیٹھے ہوں، وہاں تو اسے ضرور ہی کوئی شوشہ چھوڑنا ہے۔ بے شرم کے ساتھ اتنی ہوتی ہے پھر بھی باز نہیں آتا۔"

" اور یہ اس طرح تھوڑی ہی باز آئے گا۔ ٹیڑھا تنکا بھائی جوتی سے ہی سیدھا ہوتا ہے۔"

" میری رائے ہے اس کا روز روز کا کام . . . "

ہاتھ کی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پالا سنگھ بولا " چپ چپ دیکھے جاؤ تم۔ اگر کہیں میرا داؤ چل گیا تو پھر اس کا کہیں نام و نشان بھی مل جائے تو میرے منہ پر تھوک دینا اور پھر جب تک اس کا کام تمام نہیں کیا جاتا تب تک وہ منکی، کیسے قابو آئے گی۔"

(۲۴)

شام کا وقت تھا۔ بارات کی آمد کی خبر سن کر اور یہ سن کر کہ مشہور رنڈی مس انور جان آ رہی ہے، کیا بڈھا کیا بچہ اور کیا جوان، سارا گاؤں اکٹھا ہو کر گاؤں سے باہر نکل آیا۔ یہی نہیں ارد گرد کے گاؤں بھی خالی ہو گئے۔

لالہ رلا رام کے گھر بارات کا آنا کوئی معمولی بات نہیں تھی اور پھر جو بیاہنے آ رہے تھے وہ بھی اپنے علاقے کے مانے ہوئے ساہوکاروں میں سر بلند تھے۔

شام کے پانچ بجے کی گاڑی سے جب بارات اتری تو بڑی سج دھج سے گاؤں پہنچی۔ جس نے انور جان کو دیکھا بس مجنوں ہی بن گیا۔ عمر اس کی تیس پینتیس سال کے لگ بھگ تھی لیکن بازاری غازہ سرخی کے استعمال سے وہ

بیس سے بھی کم ہی کی لگتی تھی۔اُس کا گٹھیلا جسم، گلابی پاؤڈر سے رنگا چہرہ، سرمگیں آنکھیں، سرخ ہونٹ اور لمبے بال۔ یہ سب چیزیں لوگوں کے دلوں کو گھائل کرنے کا ٹھیکہ لے کر آئی تھیں۔

بارات گاؤں سے باہر باغ میں ٹھہرائی گئی تھی۔ لوگ اور سب کچھ بھول گئے بس مُجرا دیکھنے کے لیے وہ اس قدر بے چین ہو گئے کہ ہر ایرا غیرا باراتیوں سے مُجرے کی فرمائش کرنے لگا۔ باراتیوں کو بھی اس کا کچھ کم انتظار نہیں تھا۔ سب نے کہہ کر دولھے کے بھائی کو رضامند کر ہی لیا اور باغ میں مجرے کی تیاری ہونے لگی۔

کافی کُھلا گول دائرہ بنایا گیا۔ اس میں دریاں بچھ گئیں اور اس دائرے کے بیچ غالیچہ بچھا کر اس پر سازندے سج کر بیٹھ گئے۔

سب سے اگلی قطار میں دولھا، اس کا بڑا بھائی اور ان کے اہم صلاح کار ایک بوڑھے پنڈت جی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ہی آٹھ دس چودھری اور باقی ساری بارات درجہ بدرجہ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئی۔

دائرے کے زیادہ حصے میں باراتیوں اور باقی حصے میں دوسروں کو اس انداز سے بٹھایا گیا کہ باراتی اور غیر باراتی الگ الگ پہچانے جا سکتے تھے۔

جب سارا انتظام ٹھیک ہو گیا تو دولھے کے بھائی نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے پنڈت جی سے اجازت چاہی۔

پنڈت جی نے بڑے میٹھے انداز میں کہا "تتھا استو"

پنڈت جی مہاراج زندگی کی آخری سیڑھی پر کھڑے تھے۔ آپ کی کمر پیچھے کی طرف اور اوپر کا دھڑ آگے کی طرف جُھک چُکا تھا۔ جب چلتے تو ایسا لگتا جیسے زمین کو نمسکار کر رہے ہوں۔ آپ کا پھولا ہوا پیٹ ڈھلک کر رانوں تک چلا گیا تھا۔ رخساروں اور آنکھوں کے نیچے کی چمڑی بھی ڈھلکی ہوئی تھی اور سر کی چمڑی بھی کہیں کہیں سے اپنی جگہ چھوڑ چکی تھی۔

محفل میں بادل سے گرجنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی بادلوں کی اوٹ سے چاند نکل آیا۔ انور جان کے پہلے گانے نے ایسا رنگ باندھا کہ سارے لوگ بُت بن گئے۔

کمر لچکاتی، لمبی چوٹی کو لہراتی ہوئی اور موٹی موٹی آنکھوں سے تیر چلاتی ہوئی انور جان جس طرف بڑھتی، غضب ہی ڈھا دیتی تھی۔ اس نے قوالی شروع کی۔

"تماشا تیری کُن کا اے مسیحا ہم بھی دیکھیں گے
مُردہ ہوتے ہیں کتنے زندہ یہ ہم بھی دیکھیں گے"

سب کو تو اس کی اداؤں نے دیوانہ بنا دیا لیکن دولھے کے بھائی اور پنڈت جی پر جیسے عشق کی بجلی ہی گر پڑی۔ انور اب گانے کے ساتھ ساتھ ترچھی نظر سے یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ اُس کے تیروں کی بوچھار سے کون زخمی ہوا ہے، کس کو کم چوٹ لگی ہے اور کون پانی مانگ رہا ہے۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ نشانہ اچھی جگہ پڑا ہے یعنی جہاں اُسے سب سے کم

کامیابی کی امید تھی وہیں پر ہی اس کا نشانہ سب سے زیادہ ٹھیک بیٹھا ہے تو وہ ان دونوں پر ہی ذرا اور تیز نگاہ پھینکتی اور مسکراتی ہوئی گا اٹھی:

"کہا میں نے کہ مرتا ہوں، کیا افسوس قاتل نے
کل مرنا ہے آج مرجا، جنازہ ہم بھی دیکھیں گے"

کرم چند (دولھے کا بھائی) کا دل ہاتھ سے جاتا رہا اور پنڈت جی اس سے بھی دور جا پہنچے۔ کرم چند نے دس روپے کا نوٹ نکال کر ہاتھ آگے بڑھایا۔ انور جان نے نوٹ کو کچھ ایسی نخریلی ادا سے پکڑا کہ کرم چند متوالا ہی بن گیا۔ دولھا پاس بیٹھا بڑے بھائی کی حالت دیکھ رہا تھا۔ پنڈت جی کا اشارہ پاکر کرم چند نے کچھ نوٹ آہستہ سے ہاتھ پیچھے کرکے اُن کی مٹھی میں تھما دیے۔ فوراً ہی پنڈت جی نے ایک نوٹ انور کی طرف بڑھایا۔

نوٹ پکڑتے ہوئے اس نے پنڈت جی کی انگلی کو ذرا سا چھو دیا۔ بس اتنے سے ہی پنڈت جی کا دل بے قابو ہو گیا۔ اب اور طرف سے بھی نوٹوں کی بارش ہونے لگی، یہاں تک کہ انور جان کے لیے ان کو سمیٹنا مشکل ہو گیا اور گانے ناچنے کی فرصت ہی نہ رہی۔ وہ عجیب کٹارسی نظر سے پنڈت جی اور پھر کرم چند کی طرف دیکھتی ہوئی گانے لگی،

"ذرا تیر نظر پھینکو، جگر اور دل بھی حاضر ہے
کیسے مارتے ہو تم نشانہ ہم بھی دیکھیں گے"

پنڈت جی بے بس ہو کر "قربان قربان" کہہ اٹھے اور اس کے ساتھ ہی انھوں نے ہاتھ میں پکڑے سارے نوٹ اس کی طرف اچھال دیے۔ کرم چند بھی کہاں کم تھا۔ اس نے نہلے پر دہلا دے مارا۔ ان کی فراخ دلی دیکھ کر لوگ خوش ہو رہے تھے اور انور جان کی انوکھی طاقت کی داد دے رہے تھے۔

اب انور جان نے دوسری غزل شروع کی:۔

"سانوریا گھنگھور پر کالی گھٹا چھائی نہ ہو
مے کی پیالی بن کے دلہن باغ میں آئی نہ ہو"

ساتھ ہی اس نے بوتل میں سے گلاس بھر بھر کر بانٹنے شروع کیے جس کی ابتدا پنڈت جی سے ہوئی۔

"واہ وا! کیا کہنے! شاباش!" کی آوازوں سے ماحول گونج اٹھا۔

اِدھر شراب کا دَور اور سنگیت کا بہاؤ، دوسری طرف روپوں کی جھنکار اور پھر شراب بھی بے حساب، بے اندازہ۔ چھوٹے سے لے کر بڑے تک کو، غریب سے لے کر امیر کو، سب کے حصّے میں پیٹ بھر آئی۔ بلّی نے گلاس گرایا تو چوہوں کو بھی کلّی کرنے کا خیال آیا۔ جن لوگوں نے آج تک شراب کی شکل نہیں دیکھی تھی، مفت بٹتی دیکھ کر وہ بھی نہ رہ سکے۔ خوب ہاتھ صاف کیے۔ غیر براتیوں کی ٹولی کے سرتاج سردار پالا سنگھ اور ان کے بہت سے ساتھی بھی موجود تھے اور ان میں ہمارے

گرنتھی صاحب بھی جلوہ افروز تھے۔

جاٹ جب شراب کے نشے میں جھومنے لگے تو اُدھر سے آوازیں آنی شروع ہوئیں کوئی پنجابی کا "چوندا چوندا (رسیلا) گیت ہوجائے۔

انور نے پنجابی گیت شروع کیا۔

"مینوں کملی کملی آکھدے

کملی والا توں

میرے دل کولوں پچھ کے ویکھ لے

بہت نہالا توں

نہن کلیاں سیج وچھانیاں

بھر بھر جام پلانی آں

میں ساقی میخانے دی

بن متوالا توں"

گیت گاتی ہوئی انور اصلی روپ میں میخانے کی ساقی بن گئی۔ اس وقت کون بدقسمت تھا جو اس کے ہاتھ سے جام پی کر متوالا نہ بنتا۔

بالا سنگھ اور اس کے ساتھی تو شراب کے کیڑے ہی تھے، لیکن بھائی صاحب کو کبھی ایک چھٹانک آدھ پاؤ سے زیادہ نصیب نہیں ہوتی تھی۔ ایسا خوبصورت موقع جہاں پینے پلانے کی تو بات ہی چھوڑیے 'نہانے' تک کی اجازت تھی، بھائی جی نے بھی آج پیٹ کو اچھی طرح بھرا۔

کرم چند اور پنڈت جی بس یہی سمجھ رہے تھے کہ سنسار میں آنا بس آج ہی سپھل ہوا ہے۔ انور دوسروں کو تو گلاس پکڑا ہی دیتی تھی لیکن ان دونوں کے ہونٹوں سے لگا کر خود ہی پلاتی تھی۔

آہستہ آہستہ انور کا ناز و غمزہ ایک قدم اور آگے بڑھا۔ اس بار جو دو گلاس لاتی تھی ان میں سے پہلے ایک ایک گھونٹ خود پیا پھر دونوں کے ہونٹوں کے ساتھ گلاس لگا دیے اور اس ادا سے کہ جس نے دونوں کو گھائل کر دیا۔

آہستہ آہستہ جلسے کا رنگ بدلنے لگا۔ ہمارے باراتی اب کسی اور دنیا میں تھے۔ کوئی آنکھیں بند کیے جھوم رہا تھا کوئی انور جان کے لیے نشنے اور معنی خیز الفاظ میں پیار کا اظہار کر رہا تھا لیکن ان میں زیادہ گنتی ان لوگوں کی تھی جو بالکل بے سُدھ ہو چکے تھے۔

انور نے آخر اپنے کھیل کو ختم کیا اور سازندوں کو ساز باندھنے کا اشارہ کیا۔ سارنگی نے آج زیادہ محنت کی تھی

اس لیے اس کا پیٹ روپوں اور نوٹوں سے بھر گیا تھا۔ سازندے اپنے ساز سنبھالتے ہوئے اپنے چوبارے میں۔ جوان کے لیے مخصوص کیا گیا تھا جا پہنچے اور دوسرے لوگ بھی جھومتے ہوئے چل دیے۔ کئی جو بہت ہی زیادہ پی گئے تھے وہیں لیٹے رہے۔

(۲۵)

رات کے آٹھ بجے بچن سنگھ جب روانی پہنچ کر سُندری کے مکان پر گیا تو مایوسی سے اُس کی عجیب حالت ہو گئی تھی۔ سُندری اُس کی حالت دیکھ کر بڑی گھبرائی اور پیار سے اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی "کیوں اتنے پریشان ہیں، خیر تو ہے؟"

ٹھنڈی سانس بھر کر بچن سنگھ نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا "سُندری جی، میں ناکام رہا۔" اور اس کے بعد اُس نے بتایا کہ کس طرح وہ سارا دن پھرتا رہا لیکن ہر جگہ اس کو منہ کی کھانی پڑی۔ پھر اُس نے آج والے تجربے کا حال سنایا کہ دیوان پور میں کس طرح شراب کی نہریں بہہ نکلیں اور چاندی سونے کا مینہ برستا رہا۔

سُندری کا گلابی چہرہ پیلا پڑ گیا۔ وہ اس خیال سے پریشان ہو رہی تھی کہ اپنے محبوب کے اس کام میں وہ کچھ بھی مدد نہیں کر رہی تھی۔ جس کام کا بوجھ دونوں کو اٹھانا تھا اُسے بچن سنگھ اکیلا ہی اٹھا کر گردن تڑوا رہا تھا۔

سوچ سوچ کر آخر اس کے دل میں کوئی ایسا خیال آیا جس نے اس کی فکر کسی حد تک دور کر دی۔ اس کے چہرے سے خوشی چھلکنے لگی اور وہ اچانک بول اٹھی "تو پھر اب میری باری ہے۔"

"آپ کی؟" بچن سنگھ حیرانی سے بولا "سُندری جی آپ اسے کیا سنوار سکتی ہیں؟ جس کام کو میں اتنے دنوں کی کوشش کے باوجود نہیں کر سکا اُس کام میں آپ کس طرح کامیاب ہو سکتی ہیں؟"

سُندری اعتماد سے بولی "اگر کامیاب نہ ہوں گی تو بھی کیا حرج ہے؟ میں بھی لوٹ آؤں گی۔ اپنی طرف سے کوشش تو کرنی چاہیے۔ کامیابی دینا نہ دینا تو واہگورو کے ہاتھ ہے۔"

"نہیں سُندری جی۔ میں آپ کو اس خطرناک کام میں ہاتھ ڈالنے کی صلاح نہیں دے سکتا۔"

"آپ سُنیے تو سہی۔"

"ہاں۔"

"مجھے ایک ترکیب سوجھی ہے۔"

"کیا؟"

"ٹہنیاں پکڑنے کا خیال چھوڑ کر اگر جڑ پر ہی ہاتھ ڈالا جائے تو؟"

"یعنی؟"

"یعنی اس رنڈی ہی کو کیوں نہ جا کر سمجھایا جائے۔"

بچن سنگھ بے تحاشا ہنستا ہوا بولا "واہ سُندری جی۔ جس منتر سے بھڑوں کا چھتا قابو میں نہیں آسکا اس منتر سے آپ سانپ پکڑنا چاہتی ہیں۔ بھلا یہ بھی کبھی ہو سکتا ہے؟"

"بندوق کی جس گولی سے آدمی کسی وقت خرگوش کو نہیں مار سکتا، ہو سکتا ہے وہی گولی شیر کو مارنے کے کام آجائے۔ آپ مجھے اجازت دے دیجیے۔"

"اچھا اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو میں آپ کو روکنا نہیں چاہتا لیکن یہ پانی بلونے والی بات ہے۔"

"کچھ بھی ہو۔"

"بہت اچھا۔ جیسے آپ کی مرضی۔"

"تو چلیے۔ مجھے ابھی دیوان پورے چلیے۔ میں بھی ایک بار اپنا زور لگا دیکھوں۔"

"لیکن اتنی رات گئے آپ یہاں واپس کیسے آسکیں گی؟"

"واپس آنے کی ضرورت نہیں۔ میں رات کا باقی حصہ آپ کے گھر میں ہی رہ کر گزار لوں گی۔"

"اچھا چلیے۔" کہنے کے بعد بچن سنگھ نے سُندری کو ساتھ لیا اور دونوں دیوان پور کی طرف چل دیے۔

(۲۶)

رات کے دس بج چکے تھے۔ انور جان کے چوبارے پر اب تک بہت سے شریف زادوں کی بھیڑ تھی لیکن اس نے سر درد کا بہانا کر کے بڑی مشکل سے ان لوگوں سے اپنی جان چھڑائی۔ اس کی نوکرانی نے دروازہ بند کر کے انور کے لیے بستر تیار کیا اور وہ جا کر لیٹ گئی۔

اُس کی آنکھ لگنے ہی والی تھی کہ نیچے سے پھر دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ وہ تنگ آکر بڑبڑانے لگی۔

"کم بخت دو پل نیند بھی نہیں لینے دیتے، بڑی مشکل سے دفع ہوئے تھے۔"

پہلے تو اس کے دل میں آئی کہ نوکرانی سے کہلوا دے کہ سو گئی ہے لیکن پھر اس نے دروازہ کھولنے کے لیے بھیج ہی دیا۔

آنے والے کے قدموں کی آواز سُن کر انور اٹھ بیٹھی۔ اس وقت اس نے دیکھا تو نوکرانی کے پیچھے پیچھے ایک سولہ سترہ سال کی جوان لڑکی چلی آرہی ہے۔ پتلی لمبی شاخ سی۔ بڑے پیارے ناک نقشے والی۔ وہ حیران تھی کہ اس لڑکی کا یہاں کیا کام؟ اُس نے عزت سے اُسے اپنے پاس آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آؤ بیٹی۔ تم کہاں آئی ہو اس وقت؟"

سُندری نے کسی عورت کے مُنہ سے اپنے لیے بیٹی کا تخاطب شاید اب تک کی زندگی میں آج پہلی بار سُنا۔

بچپن میں جب وہ دیکھتی تھی کہ لڑکے لڑکیوں کو اُن کی مائیں "بیٹا بیٹی" کہہ کر بلاتی ہیں تو اُس کے دل میں کچھ ہونے لگتا تھا۔ اگر میری ماں ہوتی تو مجھے بھی ایسے ہی بلاتی، جیسے اس کے کانوں کو یہ چھوٹا سا لفظ سُننے کا جنم ہی سے چاؤ تھا۔ وہ جن خیالات کو دل میں لے کر سیڑھیاں چڑھی تھی وہ اس بیٹی لفظ کے سنتے ہی اس طرح غائب ہو گئے جیسے آگ جل جانے پر دھواں۔

وہ سوچتی ہوئی آئی تھی کہ عورت ذات کی عزت کو مٹی میں ملانے والی اس نیچ اور بدمعاش رنڈی کے سامنے میں کیسے جاؤں گی؟ جس کے کمرے کی ہر ایک چیز پر بدکاری کی پرت چڑھی ہوئی ہے میں اس کو کس طرح چھوؤں گی؟ اس کا خیال تھا کہ وہ دور ہی کھڑی رہ کر اس سے بات کرے گی لیکن اب وہ خود بخود کھنچتی ہوئی اُس کی چارپائی کے پاس جا پہنچی۔

اس وقت انور کی نوکرانی اپنی کوٹھری میں جا چکی تھی۔ سُندری چپ چاپ کھڑی رہی۔ انور نے پھر پوچھا "بچی! مجھ سے کوئی کام تھا؟"

اس پہلے لفظ نے سُندری کے دل پر کچھ ایسا اثر چھوڑا کہ اُس کی ساری نفرت دُھل گئی تھی لیکن اس کے دوبارہ 'بچی' کہنے پر سُندری کے دل میں محبت کی کھڑکی سی کُھل گئی اور وہ سر نیچا کیے ہوئے بولی "ہاں ماں جی، کام تھا۔"

انور کو اس کی ادا بڑی پیاری لگی اور اس طرح 'ماں جی' کے لفظ نے جیسے اُس کے کانوں میں مصری گھول دی، سُندری کا ہاتھ پکڑ کر اُسے چارپائی پر بٹھاتے ہوئے بولی،

"بتاؤ۔"

سُندری کسی ہچکچاہٹ کے بغیر چارپائی پر بیٹھ گئی اور اس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی: "ماں جی میں ایک عرض کرنے کے لیے آئی ہوں لیکن ..."

وہ چپ ہو گئی۔ انور نے اُس کے چہرے پر ایک گہری نظر ڈال کر اس کے چہرے کے محسوسات جاننے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ بازو بڑھا کر سُندری کی کمر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے تھوڑا سا اپنی طرف کھینچتی ہوئی بولی "بتاؤ بچی، بتاتی کیوں نہیں؟"

رنڈی کے جس ہاتھ کو وہ ناپاک اور نفرت کے قابل سمجھتی تھی وہ ہاتھ اپنی کمر سے چھوتے ہی اُسے اپنے جسم میں لطیف سی گرمی محسوس ہوئی۔ سُندری نے اس کا دوسرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور سر کو اس کے بازوؤں سے جوڑ کر بولی "ماں جی میرا کام بہت مشکل ہے۔ کہتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔"

انور نے دوسرا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے چھڑا کر اس کی کمر کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا "نہیں بیٹی۔ جھجک کاہے کی؟ تم جو کہو گی میں مانوں گی۔" لیکن شاید وہ یہ جملہ جلدی میں کہہ گئی تھی۔ تبھی سوچنے لگی 'مجھے بغیر بات پوچھے اسے پورا کرنے کا وعدہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔'

سُندری اُس کے جسم کے ساتھ چمٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ وہ بولی "ماں جی ...." اور اس کے مُنہ سے اور کچھ نہ نکلا۔

وہ اپنے آپ میں اس طرح محسوس کر رہی تھی جیسے یہ "ماں جی" لفظ کہنے سے وہ رس کے گھونٹ بھر رہی ہے اور اس کی رگ رگ میں محبت اور پیار کی سنسناہٹ سی چھڑ جاتی ہے۔ پھول کو سونگھنے سے جس طرح آدمی کی پیاس نہیں مٹتی اور وہ بار بار اُس کو سونگھتا ہے اِسی طرح سُندری کا دل چاہتا تھا کہ وہ بار بار اس لفظ کو دہراتی جائے۔ وہ پھر بولی "ماں جی"۔

انور نے شاید اس کی بات نہیں سُنی۔ اس نے اسے ویسے ہی کھینچ کر اپنی ٹانگوں پر بٹھا لیا اور پیار بھرے انداز سے اُس کے بالوں کو سنوارنے لگی۔ اُسے کچھ دیر کے لیے اس بات کا خیال ہی نہ رہا کہ وہ اس سے کیا پوچھ رہی تھی۔ اسے قدرت کی کاری گری کا یہ نازک سا کھلونا بہت پیارا لگ رہا تھا۔ اُسے اِس میں سے مٹھاس ملنے کا احساس ہو رہا تھا۔ مادری مٹھاس کا! جس کی غیر موجودگی میں اس کا کلیجہ ہر وقت جلتا سا رہتا تھا۔

سُندری نے اُس کے سینے سے اپنا سر جوڑ لیا اور پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی "ماں جی"۔

انور نے دھیان سے دیکھا۔ سُندری کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں تو اس نے سرہانے کے نیچے سے رومال نکال کر اس کی آنکھیں پونچھیں اور پھر پتہ نہیں کس وقت اس کے ہونٹ سُندری کے ماتھے سے جا کر جُڑ گئے۔ بے بس ہو کر — زبردستی —

سُندری نے اب اپنے دونوں بازو اس کے گلے میں ڈال دیے تھے۔

انور کا دل بھر آیا تھا۔ اُسے پھر بات پوچھنے کا خیال آ گیا اور وہ پیار سے اس کی کمر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی "بیٹی بتا کیا کہنے لگی تھی۔ تو جو کہے گی، وہ مانوں گی"۔

سندری اُس کے چہرے سے اس کے جملوں کی سچائی کا اندازہ کرتے ہوئے بولی "ماں جی۔ آپ کو اس کام سے نفرت نہیں ہوتی؟"

"نفرت" انور اس کی آنکھوں میں کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "مجھے اس کام سے اتنی ہی نفرت ہے جتنی تمھیں"۔

"تو پھر آپ یہ کام چھوڑ کیوں نہیں دیتیں، ماں جی؟"

"کیوں کہ میرے لیے اس دنیا میں اور کوئی جگہ نہیں"۔ انور کی آنکھوں سے ایک بے گناہ ملزم کے تاثرات جھانک رہے تھے۔

"اس کا مطلب؟" سُندری نے سوال کیا

"اس کا مطلب تو نہیں سمجھ سکتی بیٹی"۔

"کیوں ماں جی؟"

"تو شاید ابھی کنواری ہے۔ کیوں؟"

"ہاں" سندری نے آنکھیں نیچی کر کے جواب دیا۔

"اسی وجہ سے میں نے کہا ہے کہ تم ابھی میری اس حالت کو نہیں سمجھ سکتیں۔ نہ ہی اس کی وجوہات کو۔ میری باتوں کا مطلب وہی عورت سمجھ سکتی ہے جو شادی شدہ ہو اور بیاہتے ہی بیوہ ہوگئی اور بیوہ ہوتے ہی جسے گھر والوں نے دودھ سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا ہو اور پھینکا بھی ہو بدمعاشوں، مکاروں اور شیطانوں کی دنیا میں۔"

یوں کہتے کہتے انور کے چہرے سے باغیانہ اور قہر آلود جذبات ٹپکنے لگے۔ اس کے ماتھے کی نسیں پھول گئیں اور آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا تھا۔

سندری کو اب اس سے ڈر لگنے لگا۔ جیسے اس کے سامنے کوئی بھوکی شیرنی دہاڑ رہی ہو۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ آنکھ بچا کر وہاں سے بھاگ نکلنے کی سوچنے لگی۔

انور اپنے آگ برساتے جملے بولتی گئی "اس دنیا میں جہاں قدم قدم پر دھوکے بازی، بے ایمانی، دوست دشمنی اور بے غیرتی انسانی شکلوں میں بول رہی ہو، جہاں میری ایسی بدقسمت کو روٹی کا ٹکڑا حاصل کرنے کے لیے سوائے عصمت فروشی کے اور کوئی چارہ باقی نہ رہ جائے، جہاں کوئی باپ بن کر اور کوئی بھائی بن کر مجھ جیسی بے گھر عورتوں کی عزت سے کھیلنا چاہتا ہو، جہاں کسی ماں کے کلیجے کے ٹکڑے! آہ! اس کی دودھ پیتی بچی کو اس کی چھاتیوں سے نوچ کر کووں اور کتوں کے سامنے بے دریغ پھینک دیا جائے، اس دنیا میں سوائے اس پیشے کے اور کیا باقی بچتا ہے۔ شاید میں نے ابھی کہا تھا کہ مجھے اس پیشے سے نفرت ہے۔۔۔۔ نہیں نہیں، بالکل نہیں۔ مجھے اس پیشے سے نفرت نہیں ہے۔ میں کیوں نفرت کروں اس چیز سے جس کی مہربانی سے آج شرافت کا لبادہ اوڑھے بڑے بڑے امیر کبیر، بڑے بڑے لیڈر اور چودھری میری دہلیز پر آکر سجدے کرتے ہیں۔ میں تو اس پیشے کو ایک معجزہ، کرامات، خدا کی رحمت سمجھتی ہوں۔ اس پیشے نے مجھے کیا کچھ نہیں دیا؟ عزت، دولت، عیش، شہرت، سب ہی کچھ تو دیا ہے ــــ! ہاں اگر اس نے کسی چیز سے مجھے محروم رکھا ہے تو صرف میری اس بچی سے جسے زچگی کے دنوں میں ہی کسی ظالم، کسی شیطان نے دھوکے سے مجھ سے چھین کر۔۔۔۔ اُف کتنی آگ جل رہی ہے میرے اندر۔۔۔۔ میں۔۔۔۔ میں۔۔۔۔ اس۔۔۔۔ میں۔۔۔۔ انھوں نے۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔!" کہتی ہوئی انور اس طرح ہانپنے لگی جیسے اس کا جسم پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ وہ سرہانے پر منہ کے بل گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

یہ حالت دیکھ کر سندری کا دماغ چکرا گیا۔ ڈر اور پریشانی کی وجہ سے اس کی آنکھوں کے سامنے گول دائرے سے بننے لگے اور بغیر کچھ اور سنے اور ناکامیابی کی تھکاوٹ سے چور چور وہ وہاں سے اٹھ کر سیڑھیاں اتر آئی۔ انور کو اسی حالت میں چھوڑ کر۔

نیچے اتر کر وہ جدھر سے آئی تھی اُدھر ہی چل دی لیکن دس پندرہ قدم جا کر رکی اور اُسے پتہ ہی نہ لگا کہ وہ کب

لوٹ کر انور کے دروازے پر پہنچی۔ ایسا کیوں ہوا اس کی کوئی وجہ اُسے نہیں مل رہی تھی۔ سیڑھیوں کا دروازہ ابھی تک کُھلا تھا۔ اس نے جیسے ہی پیر رکھا، اندھیرے میں اُسے کسی چیز کی ٹھوکر لگی اور سندری ڈر کر اس چیز سے یوں چمٹ گئی جیسے سویا ہوا بچہ ڈر کر ماں سے چمٹ جاتا ہے۔!

... ٭ ...

سُندری کے چلے جانے کے بعد انور ویسے ہی اپنے دل کا غبار آنکھوں اور گلے کے راستے نکالتی رہی اور جب اس نے تکیہ سے سر اٹھا کر کمرے میں نظر دوڑا کر دیکھا تو وہ مٹیار وہاں نہیں تھی۔ انور کو لگا جیسے کلیجے سے جان کھینچی جا رہی ہے اور وہ بلا وجہ ہی اٹھ کر سیڑھیاں اُتر گئی۔ نیچے اُترتے ہی اُسے اندھیرے میں کسی باہر سے آئی چیز کی ٹھوکر لگی جواب اس کی چھاتی سے چمٹی ہوئی تھی۔ یہ وہی مٹیار تھی۔ سُندری۔!

دونوں بنا کچھ بولے چالے اوپر چڑھ کر واپس اپنے کمرے میں جا پہنچیں۔ کچھ دیر بعد سُندری انور کی گود میں تھی۔ کچھ دیر اور ٹھہر کر انور نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا "بیٹی تیرا نام کیا ہے؟"

"سُندری"

"اور تم کہاں رہتی ہو؟ بیٹی پتہ نہیں کیوں تجھ سے میرا دل محبت کرنے لگا ہے۔ اگر تم نیچے دروازے میں نہ مل جاتیں تو مجھے دور تک تیرے پیچھے جانا پڑتا۔ ہاں تیرا باپ کیا کرتا ہے بیٹی؟"

سُندری بولی "وہ مر گیا ہے"

"کیا کام کرتا تھا؟"

"ایک قلندر تھا"

"قلندر؟ بندر ریچھ کو نچانے والا؟"

"جی"

انور نے ایک بار پھر نظر بھر کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور سوچنے لگی۔ اتنی خوبصورتی قلندروں کے گھر؟ پھر وہ بولی "اور تیری ماں؟"

"ماں نہیں ہے میری"

"اوہ بیچاری یتیم بچی! بیٹی کتنی مدت ہوئی ماں کو مرے؟"

"پتہ نہیں جی"

"پتہ نہیں؟"

"میری کوئی ماں نہیں تھی"

انور اس جواب کو سُن کر ہنس پڑی اور بولی "تمھارے پیدا ہوتے ہی مر گئی تھی کیا؟"

"نہیں۔"

"تو پھر؟"

"وہ تھی ہی نہیں۔"

"تو پھر تو کیسے پیدا ہوئی؟"

"میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔" جلدی سے سُندری کے مُنہ سے نکل گیا لیکن پھر وہ اپنے اس احمقانہ جواب کا خیال کر کے دل میں شرمندہ سی ہونے لگی۔ اُس نے کہا "ہاں سچ میرا بابا مجھے جھاڑی کے نیچے سے ڈھونڈ کر لایا تھا۔"

انور کے چہرے پر کئی طرح کے اتار چڑھاؤ دیکھ کر سُندری سوچنے لگی میں اس کی نیند بھی خراب کر رہی ہوں۔ مجھے اب جانا چاہئے۔ وہ اٹھتی ہوئی بولی۔ "اچھا ماں جی، مجھے اب اجازت دیجیے۔ آپ کا بڑا وقت لیا۔ آپ کو شاید تکلیف ہو رہی ہے۔ پھر کسی وقت ملوں گی۔"

اُس کا بازو پکڑ کر بٹھاتے ہوئے انور نے پوچھا "اور بیٹی وہ تمھیں کون سے گاؤں سے ڈھونڈ کر لایا تھا؟"

سُندری بولی "اور کسی گاؤں سے نہیں، اسی گاؤں سے باہر اپنی جھونپڑی کے نزدیک سے۔"

اس کے بعد سُندری نے اس جگہ کا اتا پتا بتایا اور پھر اپنے آج تک کے حالات ایک ایک کر کے سُنائے۔ جب اُس نے انور کی طرف دیکھا تو وہ زار زار رو رہی تھی۔ اس کی ہچکی بندھی ہوئی تھی۔

سُندری نے سوچا اس کا بھی کوئی لڑکا یا لڑکی مر گیا یا گم ہو گیا ہو گا جس کو یاد کر کے یہ رو رہی ہے۔ اُس نے پیار سے اُس کے ساتھ لپٹ کر کہا "ماں جی! آپ کیوں روتی ہیں؟"

انور سے اب نہ رہا گیا۔ اس نے سندری کو زور سے اپنے گلے سے چمٹا لیا۔ روتے روتے اس کا جسم بے جان سا ہو گیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن حلق سے آواز نہیں نکلتی تھی۔ بڑی مشکل سے وہ بولی۔ "میری بدنصیب بیٹی۔ میں ہی تیری ماں ہوں جس سے دھوکے سے چھین کر تمھیں جنگل میں پھینک دیا گیا تھا۔"

"کیا سچ مچ؟" کہنے کے بعد سُندری پر غشی سی طاری ہونے لگی۔ اس کے بعد کتنی ہی دیر تک وہ ایک دوسرے سے گلے لگ کر روتی رہیں۔

اور جب دونوں کے پاس ایک بھی آنسو باقی نہ رہا تو مدہوشی کی حالت میں وہ ایک دوسری کو دیکھتی رہیں۔ سُندری کے اندر سے پھر محبت کی ندی امڈ پڑی اور وہ چیخ مار کر انور کے گلے سے لگ کر بولی "ماں جی آپ... آپ!"

لیکن انور نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُسے پتہ نہیں کیا سوجھا کہ اچانک اُٹھ کر سُندری سے اپنا آپ چھڑاتے ہوئے کئی قدم پیچھے ہٹ کر بولی "اوہ میری بچی! میرے اس ناپاک اور گناہ آلود جسم کو چھو کر تم نے کتنی بڑی غلطی کی — اے

کمبخت ماں کی بیٹی۔ اس غلیظ سے نفرت کر۔ جس جگہ کی ہر چھوٹی بڑی چیز گناہ کی گندگی سے آلودہ ہے، اس جگہ، اے میری پاکدامن بچی! تجھے ایک منٹ بھی ٹھہرنے کا حق نہیں۔ بس جلد سے جلد تو یہاں ۔۔۔۔" اس کے ساتھ ہی وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے مُنہ چھپا کر اپنے آپ کو اس طرح سمیٹ رہی تھی جیسے ہوا میں تحلیل ہو کر کمرے سے اُڑ جانا چاہتی ہو۔ ابھی ابھی اُس کے دل سے جو پریم کی لہریں اُچھل اُچھل کر اُسے شرابور کر رہی تھیں، ان کی جگہ اس کے دل میں شرمندگی تھی، پشیمانی تھی، پچھتاوا تھا۔ "میری بیٹی اپنے آپ کو آج رنڈی کی بیٹی سمجھ کر دل میں کیا خیال کر رہی ہوگی۔" یہ خیال آتے ہی وہ پاگلوں کی طرح دوڑ کر ایک کونے میں چھپ گئی اور سِسک سِسک کر رونے لگی۔

سُندری کو اس وقت کچھ دیر کے لیے پتہ ہی نہیں رہا کہ وہ کیا دیکھ رہی ہے۔ اس کو یہ سب کچھ خواب ہی معلوم ہو رہا تھا۔ انور کی پھر آواز آئی۔ وہ پاگلوں کی طرح یوں بڑبڑا رہی تھی جیسے کوئی امتحان میں فیل ہونے والا لڑکا اپنے والدین کا غصّہ دور کرنے کے لیے خود کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اُس کی آواز تھرتھرا رہی تھی۔

سُندری کی طرف وہ دونوں بازو پھیلا کر وہ ہچکیاں لیتی ہوئی کہہ رہی تھی "نہیں نہیں بیٹی۔ اس میں میرا ذرا بھی قصور نہیں۔ میں نے جان بوجھ کر کچھ بھی نہیں کیا۔ یہ سب کچھ مجھ سے کسی نے کرایا تھا۔ تم جب یہ بات سنو گی تو خود مان جاؤ گی کہ میں بے قصور ہوں۔"

سُندری کے جسم کی جیسے کوئی بوٹیاں نوچ رہا تھا۔ اس کے کلیجے پر برچھیاں چل رہی تھیں وہ فوراً بھاگ کر انور پر جا گری اور اس کو سنبھالتے ہوئے بولی "ماں جی آپ کے بے قصور ہونے میں مجھے ذرا بھی شک نہیں لیکن آپ مجھے یہ بتائیے کہ کس ظالم نے آپ کو اس حالت تک پہنچایا ہے؟"

انور نے بیٹی کے سوال کا جواب دینے کے لیے خود کو سنبھالا اور پھر اسی طرح آ کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اس کے بعد اس نے شروع سے لے کر اس دن تک سُندری کو سارا حال کہہ سُنایا جس دن وہ اس ننھی سی جان کو جنگل میں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

یہ سب سُن کر سُندری کے دل میں شعلے بھڑکنے لگے۔ جس سماج کے ظلم و ستم سے وہ روم روم دکھی تھی، جس سماج نے اس کے محبوب کو اور اس کے دھرم پتا کو ستایا تھا اسی سماج نے اس کی ماں کا بھی یہ حال کیا ہے۔ یہ جان کر سُندری سر سے پاؤں تک جل اٹھی۔ اس وقت بچن سنگھ کے سارے اپدیش اس کے دل سے فراموش ہو گئے۔ اس کے لیے وہاں بیٹھے رہنا مشکل ہو گیا اور وہ اٹھ کر بھاپ چھوڑتے ہوئے انجن کی طرح لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ اس کا جسم کانپنے لگا۔ لیکن ابھی اور حال سُننا باقی ہے، یہ سوچ کر اس نے خود کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی۔ پھر بیٹھ گئی اور بولی "ماں جی، پھر؟"

انور نے کہنا شروع کیا "بیٹی تیری ننھی سی جان کے لیے میرے دل میں کتنی محبت تھی، یہ بتانے کی مجھ میں

طاقت نہیں۔ کھلے آسمان کے نیچے تجھے چیلوں اور گدھوں کی خوراک بننے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ جب تیرا ظالم باپ (تاراچند) مجھے بیماری کی حالت میں چھوڑ کر چلا گیا تو اس وقت میرے پاس گھر میں نہ تو کوئی پیسہ تھا اور نہ رسوئی میں برتنوں کے علاوہ کوئی اور چیز۔ سب کچھ وہ پہلے ہی سمیٹ کر لے جا چکا تھا۔"

سُندری نے دیکھا کہ تاراچند کا ذکر کرتے کرتے انور کے چہرے پر وہی تاثرات آجاتے جو کسی ایسے آدمی کے چہرے پر آجاتے ہیں جو کسی کا خون کرنے کے لیے جا رہا ہو۔ اس کی سانس تیز ہو گئی تھی اور چھاتی لوہار کی دھونکنی کی طرح پھول پچک رہی تھی۔ یہاں تک کہ بات کرتے کرتے اُسے بات ہی بھول گئی۔ پھر وہ اٹھی اور ایک گلاس پانی پینے کے بعد پھر بولی۔ "وہ چلا گیا اور میں زمین پر پڑی ایڑیاں رگڑتی رہی۔ رات کے کوئی دو بجے تھے۔ دور دور تک کھتریوں کا کوئی گھر نہیں تھا۔ اتنے میں دو مُسلمان عورتیں ساتھ والی چھت پھلانگ کر آئیں۔ شاید انھوں نے میرے گھر سے بچے کے رونے کی آواز سُن لی تھی۔ بھلا ہو اُن کا جنھوں نے آکر مجھے سنبھالا۔ جان کمبخت اتنی ڈھیٹ تھی کہ اتنی ہونے پر بھی نہ نکلی اور میں بچ گئی۔ اُن میں سے ہی ایک تھوڑا بہت دائی کا کام جانتی تھی۔ اس نے بڑی محنت سے میری تیمار داری کی۔

"دوسرے دن ان کے آدمیوں نے قریب کے ایک کھتریوں کے محلے میں خبر کی اور محلے کے چودھری کو ساتھ ہی لے آئے لیکن جب وہ میرے پاس پہنچا تو بد قسمتی سے ایک مُسلمان نے، جس کی بیوی نے واقعی میری جان بچائی تھی، کہہ دیا کہ ہم رات سے اس کی خدمت کر رہے ہیں۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ پہلے اس کے مُنہ میں پانی ڈال کر ہماری عورتیں اسے ہوش میں لائیں، پھر گرم دودھ پلایا اور کئی طرح سے اس کے جسم کو گرمائی دی گئی تب جا کر بڑی مشکل سے اس کی جان بچی ہے۔

"یہ سُننے کی دیر تھی کہ محلے کا چودھری کانوں پر ہاتھ رکھ کر وہاں سے بھاگ گیا اور جاتے ہوئے کہہ گیا مسلمانوں کے ہاتھ کا کھا پی کر اب یہ ہماری دہلیز دل کے اندر نہیں آسکتی۔ اس کا دھرم داغدار ہو گیا ہے۔

"مسلمان بیچارے ہکا بکا رہ گئے اور اپنے کیے پر پچھتانے لگے۔ میں اس وقت قدرے ہوش میں تھی۔ کچھ تو میرے ساتھ شروع سے ہی ایسی گزرتی آئی تھی اور کچھ اب چودھری کی بے رحمی نے میرے دل کو پتھر کر دیا۔ میں نے جوش میں آکر ان مُسلمانوں سے کہا" بھائی جی اگر ہندو مجھے سہارا دینے کے لیے تیار نہیں تو کیا آپ بھی دس دن مجھے اپنے گھر ٹکنے نہیں دیں گے؟"

"ان میں سے ایک بولا" بہن جی۔ دس دن چھوڑ، آپ دس سال ہمارے پاس رہیں تو جیسی ہماری اپنی بیٹیاں بہنیں روکھی سوکھی کھا رہی ہیں وہی سب سے پہلے آپ کے سامنے رکھیں گے لیکن کیا کریں، ہمیں تو فکر ہے کہ آپ کے یہاں رہنے پر ہندو سماج اعتراض کرے گا۔"

"میں نے غصّے سے تلملا کر کہا" ہندو سماج؟ جس سماج نے مجھے گلی کے تنکوں کی طرح ہلکا بنا کر رکھ دیا ہے،

جس نے مجھے بغیر کسی تصور کے مٹی میں ملا دیا کیا آپ اس سماج کو انسانوں کی جماعت سمجھتے ہیں؟ میں ایسے سماج سے نفرت کرتی ہوں اور مرتے دم تک نفرت کرتی رہوں گی۔ اگر آپ کے دلوں میں پرماتما کے بنائے کسی آدمی کے لیے درد ہے تو مجھے کچھ دن یہیں پڑا رہنے دیجیے۔"

"پھر ایک دوسرا کہنے لگا "بہن تو ہماری ماں جائی سے بھی بڑھ کر ہے۔ جہاں تک ہمارا بس چلے گا ہم تجھے سُکھی رکھنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے لیکن کیا کریں، ہم مزدور پیشہ لوگ ہیں اور اتنے غریب ہیں کہ تیرے لیے کسی ہندو رسوئیے کا انتظام نہیں کر سکتے۔" میں نے ان سے کہا "مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ میں آپ ہی کے ہاتھوں کا پکایا ہوا کھاؤں گی۔ میں ہندو مذہب سے نفرت کرتی ہوں۔"

"اس دن کے بعد سے وہ میری خدمت کرنے لگے اور میرا رواں رواں انھیں دعائیں دینے لگا۔ تقریباً دو ہفتے میں نے انھیں کے ہاں گزارے۔"

انور نے اپنا بیان جاری رکھا۔ "تیرے پیدا ہونے کے پندرہ دن بعد محلّے کا وہی چودھری میرے پاس آیا اور بڑے پیار سے کہنے لگا 'بی بی جی، میں اُس دن سے تیرے لیے غور و فکر کر رہا تھا اور اب تجھے دلّی کے ایک بیوہ آشرم میں بھیجنے کا انتظام کر لیا گیا ہے۔ وہاں تجھے ہر طرح کا آرام ملے گا اور تعلیم بھی دی جائے گی۔'

"میں پہلے تو رضامند نہ ہوئی کیوں کہ اس کا اس دن والا سلوک مجھے یاد تھا لیکن میرے مُسلمان بھائیوں نے بھی مجبور کیا اور میں جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

"دوسرے دن وہ آیا اور مجھے تانگے میں ساتھ بٹھا کر لے گیا۔ اسی دن ہم دونوں دہلی کا ٹکٹ لے کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اس کے دھیرج دلانے اور میٹھی زبان سے مجھے کافی تسلی ہوئی — گاڑی تیز چلی جا رہی تھی۔ میں کھڑکی کی طرف پیٹھ کیے بیٹھی تھی۔ وہ میرے سامنے والی سیٹ پر تھا۔ آشرم کے سلسلے میں وہ مجھے وہاں کے بڑھیا انتظام کے بارے میں کئی طرح کی باتیں سُنا رہا تھا۔ آخر وہ کچھ فکرمند سا ہو کر بولا "لیکن ایک بات کا تو اب تک خیال ہی نہیں آیا۔"

"میں نے پوچھا "کیا؟"

"وہ بولا "اس آشرم کا یہ اصول ہے کہ وہاں داخل ہونے والی کی گود میں دودھ پیتا بچہ نہیں ہونا چاہیے۔"

"بچی! تجھے اس وقت میں دودھ پلا رہی تھی۔ تیرے چہرے کی طرف ارمان بھری نظر سے دیکھتی ہوئی بولی "پھر؟"

"وہ بولا" اگلے اسٹیشن کے نزدیک ہی میرا ایک رشتہ دار رہتا ہے۔ اگر تم کہو تو ابھی لڑکی کو ان کے حوالے کر دیا جائے۔ جب یہ دودھ چھوڑ دے گی پھر اس کو منگوا لیں گے۔" میں اس کی بات سُن کر ڈر گئی اور میرے دل پر پتہ نہیں کیا گزرنے لگی۔ آخر اس نے کئی طرح کے دھوکے فریب سے مجھے اس کام کے لیے راضی کر ہی لیا۔ اس کے بعد اگلے اسٹیشن پر وہ اُتر پڑا اور مجھ سے بھی اُترنے کے لیے کہا۔ ایک تانگہ کرایے پر لے کر ہم ایک گاؤں پہنچے۔

وہ یہی دیوان پور تھا جس کی بابت مجھے بعد میں پتہ لگا۔

" مجھے اس گاؤں کے باہر درخت تلے بٹھا کر وہ خود چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد آکر کہنے لگا " میں اپنے رشتہ داروں کے ذمے لڑکی کے پالنے کا کام سونپ آیا ہوں۔ تو جا کر اس کو ان جھاڑیوں کے بیچ، وہ جو جھونپڑی کے نزدیک اونچی سی جھاڑی ہے، اس کے نیچے بچی کو رکھ آ۔ وہ خود آکر لے جائیں گے۔ تجھے ان لوگوں کے سامنے کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ مجھ انجان نے ڈرتے جھجکتے، دل کو قابو میں کر کے اسی طرح کیا لیکن بعد میں مجھے پتہ چلا کہ یہ اس کا فریب تھا۔ اصل میں وہ کسی کو بھی تجھے سونپ کر نہیں آیا تھا۔

" اس کے بعد اس نے مجھے دلاسہ دے کر اس بات کا بھروسہ دلایا کہ تھوڑے دنوں کے بعد جب لڑکی ذرا سیانی ہو جائے گی تو وہ اسے میرے پاس پہنچا دے گا۔ میرا خیال ہے اگر وہ مجھے اس طرح کہہ کر دھیرج نہ دیتا تو میں وہیں پر بے ہوش ہو جاتی۔

" دہلی پہنچ کر ہم ایک بڑھیا بیٹھک میں ٹھہرے جو قیمتی سامان سے سجی ہوئی تھی۔ اس میں اور کوئی نہیں تھا۔ وہ مجھ سے کہنے لگا " یہ میرے ایک دوست کا مکان ہے "

" رات کو وہ ایک نوکرانی کو میرے پاس چھوڑ کر خود یہ کہہ کر چلا گیا " صبح آکر تجھے بیوہ آشرم میں داخل کراؤں گا "

" میں نے رات ویسے تو آرام سے کاٹی لیکن تیرا خیال مجھے بار بار بے چین کر دیتا تھا۔ ساری رات نیند نہ آئی۔ نوکرانی نے ہر طرح میری خدمت کی لیکن میرے آنسو نہیں تھمتے تھے۔

" صبح جب میں نے نہانے دھونے سے فرصت پائی تو اتنے میں کیا دیکھا کہ ایک بوڑھی خرانٹ عورت جو لباس اور رکھ رکھاؤ سے رنڈی معلوم ہوتی تھی، آکر میرے پاس بیٹھ گئی۔ میرے کوئی بات کرنے سے پہلے ہی وہ بولی۔ " بیٹی! رات کو کسی بات کی تکلیف تو نہیں ہوئی؟ میں تو کئی کاموں کی وجہ سے آ ہی نہیں سکی لیکن یہ بوڑھی نوکرانی بڑی وفادار ہے۔ امید ہے اس نے تجھے ہر طرح آرام پہنچایا ہوگا "

میں اس کی باتیں سن کر ہکی بکی رہ گئی اور اس کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے پوچھا " یہ مکان آپ کا ہے؟ "

" ہاں بچی اس خداوند کریم کا ہے "

میں نے اس سے پوچھا " لالہ جی ابھی نہیں آئے؟ "

وہ بولی " کون سے لالہ جی؟ "

میں نے کہا " وہی جو مجھے بیوہ آشرم میں داخل کرانے آئے ہیں "

وہ میری بات پر ہنستی ہوئی بولی " بیٹی اس مکان پر لالوں اور خان صاحبوں کی بھلا کون گنتی کر سکتا ہے۔ جہاں دن میں سیکڑوں آتے ہیں سیکڑوں جاتے ہیں لیکن میں سمجھ گئی ہوں تو اس آدمی کے بارے میں پوچھ رہی ہے

جو تجھے میرے پاس پہنچ گیا ہے۔ وہ تو رات کی گاڑی سے ہی واپس چلا گیا اور اپنا وعدہ۔ جو اس نے تیرے ساتھ کیا تھا۔ پورا کر گیا ہے۔ بچی وہ تجھے بیوہ آشرم میں ہی داخل کر کے گیا ہے اور کہیں نہیں! اور جس کو تو بیوہ آشرم سمجھتی ہے وہ تو ایسے ہی ڈھکوسلہ ہے۔ یہ تو اصلی بیوہ آشرم ہے جہاں ہمارے ملک کی ہزاروں لاکھوں بیوائیں پرورش پاتی ہیں اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتی ہیں۔"

"اس کی باتیں سُن سُن کر مجھے سانپ سونگھ گیا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں بہت روئی پیٹی، کئی دن بھوکی پیاسی بھی رہی لیکن اس کا کسی کے دل پر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ بوڑھی متواتر طرح طرح کے لالچ دے کر اور بڑے بڑے سبز باغ دکھا کر مجھے قابو میں کرنے کی کوشش میں لگی رہی۔ اس پر بھی جب میں نرم نہ ہوئی تو اُس نے ایک جوان لڑکی کو یہ کام سونپا، جو دن رات مجھے خوش کرنے کی کوشش میں لگی رہتی تھی۔ آخر وہ مجھے اس راستے پر لے ہی آئی۔ پھر بھی پتہ نہیں میں اپنی ضد چھوڑتی یا نہیں، لیکن ایک دن اُس نے مجھے اپنی زندگی کی رام کہانی سُنائی اور بتایا کہ وہ بھی ایک دن برہمن کی اولاد اور بڑے گھر کی بہو بنی تھی لیکن اس سماج نے جو بے انصافیاں اور زیادتیاں اس کے ساتھ کیں اس کے نتیجے کے طور پر آج وہ اس نیچ پیشے میں آکر بیٹھی ہے۔ اُس کا حال سُن کر میرا دل نرم ہو گیا اور میں اپنی عصمت کو ہمیشہ کے لیے بیچ کر یہ ذلیل پیشہ اختیار کرنے کے لیے تیار ہو گئی۔

"اس کے بعد میں نے بھی اُسے اپنا حال سُنایا۔ میرا حال سُن کر جیسے وہ تڑپ اٹھی۔ اس سے اُسے اور بھی مدد ملی مجھے اس گرے ہوئے راستے پر لانے کی۔ وہ کہنے لگی "کیا تم اُن لوگوں کے لیے تڑپ رہی ہو جنھوں نے تمھیں بغیر کسی قصور کے آسمان سے گرا کر زمین پر پٹک دیا؟ ارے ایسے لوگوں اور ایسے سماج کے لیے تو ہمارا یہی فرض ہونا چاہیئے کہ ہم سرِ بازار اس سماج کی ناک کاٹ کر تھالی میں سجائیں اور بیچ میں چار مُنہ والا دیا جلا کر شہر شہر اور گلی گلی گھومیں...."

"بس اُسی دن سے میں نے اپنے دھرم ایمان، اپنی مان مریادا کو، جو پہلے ہی ایک طرح سے ختم ہو چکی تھی، پاؤں کے نیچے روند کر ایک طرف پھینک دیا اور گوردیئی سے انور جان بن کر ناچنا گانا سیکھنے میں لگ گئی۔ شکل و صورت تو پرماتمانے مجھے پہلے ہی اچھی دی تھی، دنوں میں ہی اپنے کام میں اس قدر ماہر ہو گئی کہ میرے نام کی دھوم مچ گئی۔

"بچی! آج تو دیکھ رہی ہے اس سماج کی حالت؟ جب میں ہندو دھرم کی ایک پاک اور بے عیب لڑکی تھی تو مجھے اس سماج نے جوتی کی ٹھوکر مار کر اس طرح دور پھینک دیا جیسے ایک مری ہوئی چوہیا کو پھینک دیا جاتا ہے لیکن آج؟ میں مُسلمان ہوں اور ساتھ ہی رنڈی بھی، لیکن آج وہی سماج اور اُس کے بڑے کرتا دھرتا —— جو اپنے آپ کو تہذیب و تمدن اور مذہب کے ٹھیکیدار کہلاتے ہیں، آج میری بیٹھک پر آکر میری جوتیوں کے تلے چاٹتے ہیں اور اس میں اپنی عزت سمجھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں جب میں سماج کا ایک صحت مند اور سڈول انگ تھی اس وقت اُس نے مجھے توڑ کر گندگی میں پھینک دیا تھا اور آج اس سماج کا وہ انگ جو گندا اور سڑا ہوا ہے اور اس میں ایسے

کیڑے کلبلا رہے ہیں جن کی بدبو اچھے بھلے آدمی کو بھی کوڑھی بنا دے تو سماج کے ٹھیکیدار اسے چومنے اور چاٹنے کے لیے اور سر ماتھے پر بٹھانے کے لیے رال ٹپکاتے ہوئے تیار ہیں۔

"جانتی ہو بیٹی۔ یہ کس کے بیاہ کی دھوم دھام ہو رہی ہے؟ یہ میرے سوتیلے بیٹے کا بیاہ ہے۔ اگر تم آدھ گھنٹہ پہلے آتیں تو میں تمھیں ایک اور تماشا دکھاتی۔ وہی کرم چند دولھے کا بھائی۔ میرا بڑا سوتیلا بیٹا، جس نے ایک ٹکڑا روٹی کا دینے کی بجائے مجھے ادھ مری کر کے گھر سے نکال دیا تھا اور صرف ایک رات ایک نیک مسلمان کے گھر رہ جانے کا بہانہ بنا کر اس سے میرا ہمیشہ کے لیے وہاں رہ جانا برداشت نہیں ہو پایا تھا اور جس نے مجھے گھر سے نکال دینا تجویز کیا تھا وہ ابھی ابھی یہاں آیا تھا اور اس کے ساتھ وہ شیطان پنڈت بھی تھا۔ سننا چاہتی ہو وہ دونوں کس کام کے لیے آئے تھے؟ کرم چند آیا تھا اپنی ماں سے محبت کا کھیل کھیلنے، ایک رنڈی کے قدموں میں اپنا سر رکھ کر اس سے محبت کی بھیک مانگنے اور وہ بوڑھا خرانٹ پنڈت۔ جس نے پہلے مجھے بیٹی بیٹی کہہ کر جھوٹا سہارا دیا تھا اور بعد میں اسی جہنمی نے تیرے باپ (تاراچند) کے پاس بیچ دیا تھا، وہ آیا تھا اپنی ججمان بیٹی سے محبت کی بھیک مانگنے۔ اور سندری! اُن دونوں کی محبت کا درد 'ہائے میں مر گیا' ہائے تیرے نینوں کے تیروں نے مار ڈالا' ہائے تیری ادا نے لوٹ لیا'، اگر تو کبھی سن لیتی اور پھر یہ سنتی کہ ایک بیٹا ماں سے اور ایک باپ بیٹی سے محبت کی بھیک مانگ رہا ہے تو میرا خیال ہے تو کھڑی کھڑی زمین میں دھنس جاتی — اور وہ آج ساری رات میرے دروازے سے نہ ہلتے اگر میں ان کو کل کے اقرار پر نہ ٹالتی۔

"اور یہ بھی سننا چاہتی ہو کہ میں کیوں اور کیا کرنے آئی ہوں! مجرا کرنے اور پھر ان لوگوں کے درمیان۔ یہ تو میں کبھی بھی نہیں کرنے والی تھی اگر میرے اندر ایک ایسی خواہش نہ ہوتی جس نے میرا کھانا پینا حرام کر رکھا ہے۔ سندری میری بچی سن۔ میں ان دونوں کا لہو پینے کے لیے آئی ہوں اور اسی لیے میں کتنے دنوں سے اس شادی کے انتظار میں تھی۔ اس کام کے لیے میں نے اپنے دو دلال بھی مقرر کیے ہوئے تھے۔ اس قصائی کو جس نے مجھے رنڈی کے پاس بیچا تھا اس کو تو میں کب کا ٹھکانے لگا چکی ہوں۔ آج تک اس کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔ یہ بہت لمبی کہانی ہے اور اس کے قتل کا حال سنا کر میں تیرے نازک دل کو تکلیف نہیں پہنچانا چاہتی۔ ہاں ایک ارمان ہے جسے میں سینے میں لے کر مروں گی اور وہ ہے ظالم (تاراچند) کے لہو میں ہاتھ رنگنا لیکن افسوس۔ ہزار افسوس۔ ہزار کوشش کرنے پر بھی میں اسے ڈھونڈھ نہیں سکی۔ اگر کبھی ایک بار مل جاتا۔۔!"

سندری میں اب اور سننے کی ہمت نہیں تھی۔ اس کا سارا جسم انگاروں کی طرح جل رہا تھا۔ بچن سنگھ کے اپدیشوں نے جو تھوڑا بہت اس کے خیالوں کو بدل دیا تھا وہ اس طرح نیست و نابود ہو گئے جیسے کوئی چھوٹے سے پودے کو باڑ بنا کر بچا تا رہا ہو لیکن طوفان کا ایک جھونکا آتے ہی اُسے جڑ سے اکھاڑ کر لے جائے۔ اُسے پاؤں کے نیچے سے زمین نکلتی ہوئی سی معلوم ہوئی اور اس وقت مکان کی ہر چیز اس کے سامنے گھومتی ہوئی سی معلوم ہو رہی تھی۔

انور کی باتیں سُنتے سُنتے اُس کی آخری بات کو بیچ میں پکڑ کر سُندری جوش میں آ کر بولی "اس کا لہو میں پیوں گی۔ اگر میں تمھاری اولاد ہوں تو اس کا لہو پی کر تمھارے اور اپنے دلوں میں لگی آگ کو بجھاؤں گی۔ میں ابھی سے اُسے ڈھونڈنے کی کوشش شروع کر دوں گی!" یہ کہتی ہوئی سُندری وہاں سے اٹھی اور جلدی سے سیڑھیاں اُتر گئی۔ سُندری کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس پر پاگل پن سوار ہے۔

سُندری چلی گئی اور انور بُت کی طرح بیٹھی رہی۔ اس کے دماغ میں اپنے کہے ہوئے جملے گونج رہے تھے "میں سچے دل سے اقرار کرتی ہوں . . . ." آج کا واقعہ اُسے سپنا سا لگ رہا تھا۔

سُندری نے نیچے اُتر کر دیکھا۔ بچن سنگھ اس کے انتظار میں اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ رات کے دو پہر گزرنے کے بعد تیسرا شروع ہو گیا تھا جب بچن سنگھ سُندری کو لے کر اپنے گھر گیا۔

(۴۷)

گھر جا کر ان دونوں نے تیسرا پہر باتوں میں ہی بتایا۔ کمرے میں پہنچ کر جب لیمپ کی روشنی میں بچن سنگھ نے سُندری کا چہرہ دیکھا تو وہ ڈر سا گیا۔ سُندری کی آنکھوں میں شعلے بھڑک رہے تھے اور چہرے پر ڈراؤنی اور بھیانک مُسکراہٹ تھی۔

وہ جلدی سے سُندری کا کندھا جھنجھوڑتے ہوئے بولا "سُندری جی! کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں جی! خیر ہی ہے" کہہ کر اور پھر یہ سوچ کر کہ بچن سنگھ اس کے دل کے خیالات کو اس کے چہرے سے پڑھنے کی کوشش کر رہا ہے، اس نے ساری طاقت سے اپنے اندر کے طوفان کو روکنے کی کوشش کی اور پھر وہ بات کا رُخ بدلتی ہوئی بولی:

"پھر بارات والوں کی طرف گئے تھے؟"

"نہیں گھر پر ہی رہا تھا" کہہ کر بچن سنگھ نے پوچھا "سُندری جی! آپ کی آنکھیں آج بہت لال ہیں۔ کیا بات ہے؟"

وہ انگلیوں سے آنکھوں کو اس طرح ملتی ہوئی جیسے نیند کے آنے کا ڈھونگ کر رہی ہو بولی "یہ سب آپ کی ہی کرپا کا پھل ہے۔"

"کیوں؟"

"آپ نے کام جو ایسا سونپ دیا تھا۔"

پُر امید سا ہو کر سُندری کے اوپر کے جملے سے ہی بچن سنگھ سمجھ گیا کہ وہ اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب

ہو گئی ہے۔ یقین کرنے کے لیے اس نے پھر پوچھا "ہاں تو پھر سنائیے کیا بنا؟"

"بنا وہی جو کرنے گئی تھی۔"

"کامیابی؟"

"پوری پوری۔"

"ناممکن"

"ممکن سے بھی بڑھ کر"

"یعنی"

اس کے جواب میں سُندری نے اتنا ہی بتایا کہ اُس نے الوزرسے وعدہ لے لیا ہے کہ وہ مُجرا نہیں کرے گی۔

بچن سنگھ یقین نہ کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر بولا "سُندری جی، اس نے آپ کو ٹالنے کے لیے معلوم ہوتا ہے دھوکا دیا ہے۔"

سُندری کے چہرے پر اعتماد تھا۔ وہ پھر بولی "کچھ بھی ہو لیکن وہ مُجرا نہیں کرے گی۔ آپ کو پتہ چل جائے گا۔"

"سُندری جی۔ اگر وہ نہ ناچی تو میں یہ سمجھوں گا کہ آپ نے ریت میں سے تیل نکال لیا۔ مان لیجیے وہ صبح مجرا نہیں کرے گی لیکن بارات کو تو کہیں پرسوں واپس جانا ہے۔ آپ کو اُس سے یہ وعدہ لینا چاہیئے تھا کہ جب تک وہ دیوان پور میں ہے، مُجرا نہیں کرے گی۔"

سُندری نے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا "بلکہ اس سے بھی زیادہ۔"

"کیا؟"

"وہ جب تک زندہ ہے یہ کام نہیں کرے گی۔ میرا مطلب ہے کہ یہ پیشہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے گی۔ سمجھ لیجیے کہ کل والا مُجرا اُس کا آخری مُجرا تھا۔"

"یہ کس طرح ہو سکتا ہے سُندری جی؟" بچن سنگھ نے اس شک کو دور کرنے کے لیے کہ سُندری مذاق تو نہیں کر رہی، اُس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "گدھ سے ہمیشہ کے لیے مُردے کھانے کی عادت چھڑوا کر مکمل ویشنو ہو جانے کا وعدہ لینا، یہ ناممکن سی بات ہے۔"

سُندری نے اسے کسی طرح یقین دلا دیا لیکن جو کچھ اس پر گزری تھی اس کے متعلق کچھ نہ بتایا۔ اُسے اس بات کا خطرہ تھا کہ جس بات کا وہ اپنی ماں کے ساتھ وعدہ کر آئی ہے اگر اس کو پتہ چل گیا تو اتنا ہی نہیں کہ اس کی ہنسی اُڑائے گا بلکہ اپنا اثر ڈال کر یہ اُسے اپنے اقرار سے لڑکھڑا دے گا۔

بچن سنگھ مارے خوشی کے پھولا نہیں سماتا تھا۔ سب سے پہلے ہی اتنی بڑی کامیابی۔ اور پھر سُندری کے ہاتھوں ـــــ

وہ خوشی سے جھومتا ہوا بولا "سُندری جی۔ تب تو ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔"

اپنے پریتم کے لہجے کو بھانپ کر سُندری بولی "نہیں بلکہ ایسا کہیے کہ ہم کامیاب ہو چکے ہیں۔"

"سُندری ہم دو سے ایک ہوں گے۔"

"یہ بھی ہو چکے ہیں۔"

"نہیں سُندری جی۔ ابھی ہم دو ہی ہیں۔ اس طرح کامیابی بھی ابھی کافی دور ہے جس کی طرف ہم نے ابھی پہلا ہی قدم اٹھایا ہے۔!"

"کیا کہا ہے آپ نے کہ ہم دو ہیں۔ نہیں نہیں۔ ہم ہمیشہ کے لیے ایک ہیں۔ یہ ملن ہمیشہ قائم اور امر رہے گا۔"

"رومانی نقطۂ نگاہ سے یہ ٹھیک ہے۔ لیکن سندری جی! سماج کی آنکھوں کو ابھی ہم ایک نہیں دکھائی دیتے۔"

سُندری پیار سے بچن سنگھ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر بولی "سماج؟ کس سماج کی بات کرتے ہیں؟ اُس سماج کے متعلق کہہ رہے ہیں جس کی آنکھوں میں دشمنی، نفرت شیطانی، بے نندری کی بیماریوں کی وجہ سے موتیا بند ہو چکا ہے اس سماج کو اگر ہم ایک نہیں دکھائی دیتے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم درحقیقت ایک نہیں ہیں۔ اس کی اپنی ہی آنکھوں کو ایک کے دو دکھائی دیتے ہیں۔ یہ قصور اُس کی آنکھوں کا ہے جن کو کروڑ جنموں میں بھی ٹھیک نہیں کیا جا سکتا۔ سماج .... آپ اس سماج کو آدمیوں کی جماعت سمجھتے ہیں.... لیکن میں ... "

بات کرتے کرتے سُندری کا چہرہ تانبے کی طرح لال ہو گیا۔ اس کی سانس تیز چلنے لگی۔

اچانک ہی اس کا یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر بچن سنگھ ڈر گیا۔ جب اس نے سُندری کے چہرے اور آنکھوں کی طرف غور سے دیکھا تو اسے اس کے پاگل ہونے کا شک ہونے لگا۔

کہتے ہیں جس بیماری کو اسادھ روگ کے نام سے پکارا جاتا ہے اول تو وہ روگ ٹھیک ہی نہیں ہوتا لیکن اگر کسی کامل حکیم کی محنت سے تھوڑا بہت فرق بھی پڑ جائے تو بھی ذرا سی بد پرہیزی ہو جانے سے اس کی بیماری کا نئے سرے سے بڑھ جانا ضروری بات ہوتی ہے۔

یہی حالت اس وقت سُندری کی تھی۔ بچن سنگھ بڑی کوششوں سے اُسے غلط راستے سے موڑ کر سیدھے راستے پر لانے کے لیے محض تیار ہی کر پایا تھا، ابھی لایا نہیں تھا، لیکن الوزجان والے نئے واقعے نے اس کے خیالات کو واپس پہلی جگہ پر لا کھڑا کر دیا۔

"سُندری جی آج آپ کو کیا ہو گیا ہے؟" بچن سنگھ نے اس کا بازو جھنجھوڑ کر کہا "آج آپ پھر ہنسا کا اوتار

نظر آرہی ہیں کیا بات ہے ؟"

پھر اُسے خیال آگیا کہ اس وقت اس سلسلے میں بات کرنے سے سُندری کی طبیعت اور تیز ہو جائے گی۔ یہ سوچ کر اُس نے اس معاملے کو کسی اور وقت کے لیے اُٹھا رکھا اور اس کی توجہ دوسری طرف کرنے کے لیے کہا "خیر ان باتوں کو ابھی چھوڑیے۔ ہاں سچ سُندری جی! ہمیں اب آگے کے لیے پروگرام بنانا چاہیئے۔ اس سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟"

اتنی دیر میں سُندری نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ اپنے دل کی کمزوری پر وہ پچھتا رہی تھی کہ جو بات وہ بچن سنگھ پر ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی اُس کی جھلک میں نے اپنے وطیرے سے کیوں ظاہر ہونے دی۔ لیکن یہ سوچ کر کہ اس سلسلے میں مزید بات کرنے پر پتہ نہیں اور کیا کیا منہ سے نکل جائے سندری نے موقعہ ٹالنا ہی مناسب سمجھا اور بچن سنگھ کی بات کے جواب میں کہنے لگی " لیکن آپ نے آخری خط میں لکھا تھا کہ ابھی آپ کہیں زیادہ دور نہیں آجا سکتے۔ پھر اس حالت ...."

"ٹھیک ہے لیکن جب تک یہاں رہنا ہے اس دوران میں بھی تو کوئی نہ کوئی کام جاری رہنا چاہیئے۔ اس پہلے کام میں کامیابی دیکھ کر سُندری جی! میرا حوصلہ بہت بڑھ گیا ہے۔ لیکن اب صرف آپ پر زیادہ بھروسہ ہے۔ جس کام کو میں ہفتوں پریشان رہنے پر بھی نہیں کر سکا اُس کو آپ نے ایک بار میں ہی کر دیا۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ ہم جلد سے جلد ...."

سندری بولی " میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ جو تھوڑا بہت کیا بھی ہے یہ سب آپ کی تعلیم اور تربیت کا نتیجہ ہے۔ نہیں تو ایک بندریا سے کیا امید کی جا سکتی ہے۔ اچھا تو پھر آپ اس سلسلے میں کیا کرنا چاہتے ہیں ؟"

"میں جو کچھ چاہتا ہوں وہ وہی کچھ ہے جسے سن کر ابھی آپ کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔"

"یعنی ؟"

"یعنی بیاہ کی رسم۔ تاکہ ہم اپنے مقصد کے حصول کے لیے کھلے عام میدان میں نکل سکیں۔"

سندری ہچکچاہٹ بھری ہنسی کے ساتھ بولی " لیکن کیا ہم اس کے بغیر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے ؟"

"نہیں سندری جی! یہ ناممکن ہے۔"

"لیکن میں تو اسے ناممکن نہیں سمجھتی۔"

"تب آپ اپنی رائے ظاہر کیجیے۔"

"یہی کہ ہم کچھ دیر کے لیے ایک دوسرے سے الگ رہ کر کام کریں اور جب اپنا اپنا کام پورا کر لیں تو پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہتی دنیا تک ایک ہو جائیں۔"

"سُندری جی آپ کی باتیں سُن کر مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"پریم کے راستے میں ڈر کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ تو آج میں نے آپ کے مُنہ سے غلط سی بات سُنی ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ . . . ."

بات کرتے کرتے سُندری چُپ ہوگئی۔ بچن سنگھ کی گھبراہٹ اور بڑھ گئی اور وہ بولا "ہاں کیا مطلب ؟"

"کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ . . . کچھ عرصے کے لیے مجھے بھول جائیے۔"

"آپ کو بھول جاؤں ؟" تڑپتے ہوئے بچن سنگھ نے کہا "سندری جی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ انور کے مکان پر جانے سے پہلے تو آپ کی یہ حالت نہیں تھی۔"

"ہاں بھول جائیے۔ اگر بھول نہیں سکتے تو میری یاد کو ہی سُندری سمجھ کر ہمیشہ کے لیے اپنے دل میں رکھیے۔"

بچن سنگھ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ بے چینی سے سُندری کا ہاتھ پکڑ کر بولا "سُندری جی پرماتما کے لیے ایسی باتیں نہ کیجیے۔ میرے حال پر رحم کھا کر میری حالت کا اندازہ کیجیے۔"

سندری نے بچن سنگھ کا ہاتھ مضبوطی سے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا اور دل کی بے چینی کو چھپاتی ہوئی بولی "آپ اس طرح پریشان کیوں ہو رہے ہیں ؟ میں آپ کی اور صرف آپ کی ہوں۔ ہمیشہ کے لیے آپ کی۔ آنسو بہا کر میرے صبر کا پیمانہ لبریز نہ کیجیے۔ میرے وجود کا قلعہ نہ توڑیے۔"

بچن سنگھ کے دل کی آگ بجھانے کے لیے اس وقت سُندری کے پاس جو پانی تھا وہ بھی جیسے آگ میں بدل گیا تھا اور سُندری آگ میں مزید آگ ڈال کر اُسے بجھانے کی کوشش کر رہی تھی جب کہ اپنے دل کی آگ بجھانے کے لیے سُندری کو خود پانی کی ضرورت تھی۔ لیکن دوسری طرف بھی آگ ہی تھی۔ یہ ایسی ہی بات تھی کہ جیسے ایک مکان میں آگ لگ گئی ہو لیکن آگ کو بجھانے والا انجن بھی جل رہا ہو!

بچن سنگھ پھر بولا۔ "سندری جی پہیلیاں نہ بجھائیے۔ اپنے دل کی بات صاف صاف بتائیے۔"

سُندری نے زبردستی ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "صاف صاف کیا بتاؤں گی۔ صرف میری وجہ سے ہی آپ کو جو مُصیبتیں اٹھانی پڑی ہیں وہ مجھ سے چھپی نہیں۔ اگر بہیں پر بس ہو جاتی تو بھی میں سہہ لیتی۔ لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ میری موجودگی کے سبب ابھی آپ کو اور بہت کچھ دیکھنا ہوگا اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ ابھی آپ کچھ مدّت کے لیے مجھے اپنے آپ سے الگ کر دیجیے۔ جب تک آپ

کی ماتا جی کا دم ہے ان کی خدمت کیجیے۔ ان کی سب سے بڑی خواہش پوری کیجیے۔ گھر میں بہو دیکھ کر انھیں اپنے سارے دُکھ بھول جائیں گے۔"

بچن سنگھ کی چھاتی پر تیر چل رہے تھے۔ وہ ایک ہاتھ سے اپنی آنکھیں ڈھک کر دوسرے ہاتھ سے سُندری کو چُپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا "بس بس سُندری جی! پرماتما کے لیے اس بات کو ختم کیجیے۔ اگر آپ کے علاوہ مجھے کسی اور سے شادی کرنی پڑی تو وہ صرف موت سے ہوگی۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا اور نا ہی سن سکتا ہوں۔"

سُندری کا ان باتوں کی طرف دھیان نہیں تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھی۔ بچن سنگھ نے بھی اس وقت کچھ اور کہنا مناسب نہ سمجھ کر اٹھنے کی تیاری کی۔ اس کا خیال تھا کہ پھر کسی اور وقت جب سُندری اچھے موڈ میں ہوگی تو اُس کے دل سے یہ غلط خیال نکالنے کی کوشش کی جائے گی۔

اُدھر سندری بھی یہی سوچ رہی تھی کہ ایسی عمدہ دلیلیں سوچی جائیں کہ جن کے ذریعے وہ بچن سنگھ کو اپنا ہم خیال بنا سکے۔ اور وہ اس کے ساتھ محض روحانی رشتہ قائم رکھتے ہوئے، جلد ہی کسی اچھے گھرانے میں شادی کرا کے اپنی کانٹوں بھری زندگی کو پھولوں کی خوشبو سے مہکا لے۔

صبح کی سفیدی آہستہ آہستہ اندھیرے کی جگہ لے رہی تھی۔ رات کا باقی حصّہ چھلانگیں مارتا نکل گیا۔ بچن سنگھ اٹھ کر اپنے کمرے میں جانے کے لیے تیار ہوا تو سُندری نے اس کی طرف پیار بھری مسکراہٹ سے دیکھ کر کہا "جا رہے ہیں؟"

"پھر کسی وقت آپ کے ان وہم بھرے خیالات کو آپ کے دل سے نکالنے کی کوشش کروں گا۔"

"کاش پرماتما کی ایسی مرضی ہوتی کہ یہ خیال وہم ہی ہوتے۔" اس کے بعد بچن سنگھ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ سُندری کی کھلی آنکھوں میں انوار گھوم رہی تھی۔ اور پھر اسی حالت میں اس کی آنکھ لگ گئی!

(۲۸)

تین پہر جاگتے رہنے کے بعد چوتھے پہر کی ٹھنڈی ہوا نے سُندری کی آنکھوں میں نیند بھر دی۔ لیکن بڑے ڈراؤنے اور خوفناک سپنوں والی نیند۔ جیسے نیند نے اسے اٹھا کر کسی خونی دنیا میں لے جا کر پھینک دیا ہو، جہاں کی زمین، آسمان، چاند، سورج، سب کچھ خون کا بنا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں اور کانوں کے راستے جیسے چھریاں، تلواریں، نیزے، بھالے اس کے دماغ میں اترے جا رہے تھے۔ زمین کا چپہ چپہ خون خون پکار رہا تھا۔ درختوں پر بیٹھے ہوئے پنچھی بھی خون ہی خون گا رہے تھے اور ندیوں، کنوؤں، نالابوں کا سارا پانی خون

میں تبدیل ہوگیا تھا۔ وہ جس طرف جاتی اسے خون کے نغمے ہی سنائی پڑتے تھے۔ اس کے کپڑوں، بالوں، اس کی آنکھوں اور اس کی زبان سے خون ہی ٹپک رہا تھا۔ خون کی ندی میں بہتی ہوئی وہ عمیق گہرائی میں اترتی جارہی تھی جہاں چھوٹی چھوٹی مچھلیوں سے لے کر بڑے بڑے مگرمچھوں کے پیٹ خون سے بھرے ہوئے تھے۔ پانی کے ان انسانوں کی زبانیں انسانوں جیسی نہیں اور وہ خون خون کا شور مچاتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ شکار اور شکاری، سب کی زبان پر ایک ہی لفظ تھا خون ۔ خون ۔ خون !

سندری خود کو اس وقت خونی ندی کی تہہ تک پہنچی ہوئی محسوس کر رہی تھی۔ اُس کی سانس گھُٹ رہی تھی۔ اُس نے گھبرا کر بڑبڑاتے ہوئے نیند میں چیخ ماری لیکن شاید یہ چیخ اس کے ہونٹوں سے باہر نہیں نکلی اور اندر ہی اندر گم ہو کر رہ گئی۔ اس نے ڈر کر کروٹ بدلی تو اس نے محسوس کیا کہ اس کے دونوں ہاتھ چھاتی پر رکھے تھے۔ کمرے میں سورج کی کرنیں چمک رہی تھیں جو سندری کو پیلے رنگ کی بجائے لال لال خون کے رنگ میں رنگی ہوئی سی لگیں۔ خون کا شور ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔

اس کی آنکھیں کھلیں لیکن ڈر کے مارے اس نے آنکھیں پھر بند کر لیں۔

خون خون کا شور ابھی تک اس کے کانوں کے پردے پھاڑ رہا تھا۔ اس نے پھر آنکھیں کھولیں اور فوراً چارپائی سے اٹھ بیٹھی۔ سورج کافی چڑھ آیا تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے سارا مکان آدمیوں سے گھرا ہوا ہے اور ہر طرف سے خون خون کی آوازیں آرہی ہیں۔

وہ فوراً کمرے سے باہر نکلی۔ سارا گاؤں بچن سنگھ کے گرد گھیرا ڈالے کھڑا تھا جسے پولیس نے ہتھکڑی لگا رکھی تھی۔ اس کی ماں اپنے آپ کو پیٹ پیٹ کر نیلی ہوئی جارہی تھی۔ ایک طرف سے آواز آئی "بچن سنگھ نے تین خون کر دیے ہیں، ایک رنڈی کا، ایک بوڑھے پنڈت کا اور تیسرے دولھے کے بھائی کرم چند کا۔"

"ہیں! تین خون! اور بچن سنگھ نے؟" سندری کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس وقت پولیس بچن سنگھ کو تھانے لیے جارہی تھی۔

مکان سے نکل کر بھیڑ کو چیرتی ہوئی سندری بھونچکی سی ہو کر بچن سنگھ سے جا لپٹی اور ایک چیخ مار کر اُس کے قدموں میں بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ بھیڑ آگے نکل گئی اور وہ اسی طرح پڑی رہی۔

... ...

بچن سنگھ کو یہ سب کچھ سپنا سا معلوم ہو رہا تھا لیکن سندری کا حال دیکھ کر اس کا دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ اس نے کئی بار پیچھے گھوم کر دیکھا۔ ایک دو بار کھڑے ہونے کی بھی کوشش کی۔ لیکن سپاہیوں کے دھکوں نے اُس کی کوئی پیش نہ جانے دی۔ پل دو پل میں راہ سُنسان ہو گئی۔

سارے گاؤں میں خبر پھیل گئی "بچن سنگھ نے ایک رات میں تین خون کر ڈالے!"

... * ...

کچھ دیر بعد جب سُندری کو ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو مٹی میں لت پت رواں والے کمرے میں پایا۔ رواں کے کچھ آدمیوں نے اُسے بے ہوشی کے عالم میں اٹھا کر یہاں پہنچا دیا تھا۔ نزدیک ہی کئی اور آدمی بھی تھے۔ وہ اٹھی اور اس وقت پھر کہیں سے اس کے کانوں میں آواز پڑی "بچن سنگھ نے تین خون کر دیے!"

سندری کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے سر میں کسی بم نے پھٹ کر اس کے وجود کو ریزہ ریزہ کر کے اڑا دیا ہو۔ پانچ منٹ تک وہ اسی حالت میں پڑی رہی۔ اس کے دماغ میں سوچنے کی طاقت نہیں تھی۔ اس کے بعد اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور وہ دوبارہ بے ہوش ہو گئی۔

پتہ نہیں وہ کتنی دیر تک اسی طرح پڑی رہی۔ جب اُسے دوسری بار ہوش آیا تو اسے یہ معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے بچن سنگھ کی گرفتاری کی خبر سپنے میں سُنی ہے۔

وہ پاگلوں کی طرح گرتی پڑتی اٹھ کر دیوان پور کی طرف جانے والی سڑک پر چل دی۔ کئی لوگوں نے اسے روکا مگر وہ نہ رکی۔ سڑک پر ایک تانگا جا رہا تھا۔ وہ اس میں بیٹھ گئی۔

بچن سنگھ کے گھر پہنچ کر اس نے دیکھا۔ بچن سنگھ کی ماں چارپائی پر بے ہوش پڑی تھی اور کئی پڑوسنیں اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

سندری پاگلوں کی طرح ہر ایک کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن اس نے کچھ بھی نہ پوچھا اور نہ ہی اُسے کسی نے بلایا بٹھایا۔ اتنے میں بچن سنگھ کی ماں کی آنکھیں کُھلیں۔ سُندری بھاگ کر اس کے قریب گئی۔

سدا کور نے جب سُندری کو سامنے دیکھا تو غصّے سے اس کا چہرہ لال ہو گیا۔ بازو سے جھٹکا دے کر اُسے دور دھکیلتی ہوئی وہ بولی "چلی جا یہاں سے کم ذات کتیا، دفع ہو جا کالے منہ والی! سارے جھگڑے تیری ہی وجہ سے ہوئے ہیں۔ جس دن سے تیرا جلا ہوا منہ دیکھا تھا اسی دن سے میرا لڑ کا مٹی میں مل گیا ہے۔ کرموں جلی۔ نہ تو آتی اور نہ میری دنیا لٹتی۔ جا، دفع ہو جا۔ پرماتما دونوں جہانوں میں تیرا منہ کالا کرے۔!"

اس طرح کہتی ہوئی سدا کور اتنے جوش میں آگئی کہ چارپائی سے اٹھ کر اسے مارنے دوڑی۔

سُندری کسی اور وقت ایسی باتیں سنتی تو پتہ نہیں کیا کر گزرتی۔ لیکن اس وقت اس نے ان باتوں کو اس طرح برداشت کیا جیسے ایک جنگل میں رہنے والا شیر جو کبھی کسی چڑیا کو بھی نزدیک نہیں پھٹکنے دیتا تھا، اب چڑیا گھر کے پنجرے میں بند ہو کر بندروں اور ریچھوں کو اپنی نقل اتارتے دیکھ کر ٹھنڈے دل سے سہ لیتا

ہے۔ وہ لٹے پاؤں لوٹ کر تھانے کی طرف بھاگی۔

جس طرح جسم پر پتھر کی چوٹ لگنے سے بعض وقت فوراً ہی درد معلوم نہیں ہوتا بلکہ کچھ دیر بعد جب زخم ٹھنڈا پڑتا ہے تو آدمی درد سے بے چین ہو جاتا ہے اسی طرح سُندری کو راستہ چلتے ہوئے اب اپنی حالت کا اندازہ ہوا۔ "ہیں! خون کے مقدمے میں؟" یہ بات جیسے ابھی ابھی اس کے ذہن میں آئی۔ اس کی حالت اس وقت اس ہرنی کی طرح تھی جس کے سامنے کے رُخ ایک نہیں، کئی شکاری شست باندھے کھڑے ہوں اور پیچھے جنگل میں آگ لگی ہو، دائیں طرف دریا بہہ رہا ہو اور بائیں طرف کوئی بستی ہو!

اس نے جب ایک بار نئے سرے سے اپنی حالت پر غور کیا تو وہ ڈر سے کانپ اٹھی۔ اس کا پریتم جس کا وجود اس کے لئے سارے سنسار کے راج کے برابر تھا، خون کے جھوٹے مقدمے میں پھنس چکا تھا۔ اس کی ماں بیچاری کہیں کی نہیں رہی تھی۔ اس کے سگے سمبندھی جو اس وقت اس کے گرداگرد گھیرا ڈالے ہمدردی کے طور پر مگرمچھ کے آنسو بہا رہے تھے وہ سب کچے دھاگے کے سے سہارے تھے جو موتی چور کے لڈو کی طرح ہاتھ لگاتے ہی ٹوٹ جاتے۔ اس سے بڑھ کر یہ بھی کوئی تعجب کی بات نہ ہوتی کہ سارا گاؤں جو پہلے ہی بچن سنگھ کا دشمن ہو رہا تھا، اب واقعی میں بچن سنگھ کو خونی تسلیم کر لیتا۔

وہ اپنے آپ کو ایسی ناؤ میں سوار تصور کر رہی تھی جس کا ملاح کسی مگرمچھ کے قابو میں آچکا ہو اور ناؤ لہروں کے چکر میں پھنسی لٹو کی طرح گھومے جارہی ہو۔ روڈو کا دم تھا، اسے ظالموں نے کھالیا۔ ماں اُس کو ملی لیکن گھٹا ٹوپ تاریک آسمان میں ایک بار بجلی کی طرح چمک کر غائب ہوگئی۔ اس کے علاوہ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ رِوانی میں بھی اب اُسے رہنے نہیں دیا جائے گا کیوں کہ بالا سنگھ اور اس کی پارٹی سے گاؤں والے ڈرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بچن سنگھ کے ہم خیال ہوتے ہوئے بھی روانی کے لوگوں نے اس وقت اس کی کوئی مدد نہ کی۔ یہاں تک کہ جو لوگ بڑھ چڑھ کر بچن سنگھ کی حمایت کا دم بھرنے والے تھے انھوں نے بھی کانوں میں روئی دے کر راستہ بدل لیا۔

اس ساری حالت کا اندازہ لگا کر سندری سوچنے لگی "اب میرا یہاں رہنا بیکار ہی نہیں خطرناک بھی ہے۔ لیکن جاؤں گی کہاں اور پھر بھی اس وقت جب میرا سب کچھ موت کے منہ میں پڑا ہے۔ دیوان پور کے لوگ پہلے ہی یا تو مجھے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، یا پھر نیچ اور اچھوت سمجھتے ہیں۔"

اُسے آج پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ عورت ذات کس قدر کمزور اور بے سہارا ہے۔

ان ہی خیالات میں ڈوبی وہ کئی منصوبے بناتی مٹاتی رہی لیکن کسی بھی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔ سب سے بڑا دُکھ اسے اس بات کا تھا کہ وہ اپنے پریتم کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ اسے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔

اور اُس کا یہی دل چاہا کہ کسی اور دُکھ کو دیکھنے سے پہلے ہی اپنی زندگی کا خاتمہ کرلے۔ اس طرح کرنے سے سارے دکھوں مُصیبتوں سے اُس کی جان چھوٹ جائے گی۔ لیکن اندر کی کسی پوشیدہ طاقت نے اسے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ وہ بار بار سوچتی 'میری ماں نے کتنی جلد بازی کی۔ اگر اُس نے اپنے دشمنوں کو مار کر خودکشی ہی کرنی تھی تو کوئی چِٹھی ہی لکھ کر رکھ جاتی، جس سے دوسروں پر مُصیبت نہ پڑتی۔!'

انہی خیالات میں کھوئی ہوئی سُندری تھانے پہنچی۔ اُس نے بچن سنگھ سے ملاقات کرنے کے لیے بڑی کوشش کی لیکن پولیس کے دھکّوں اور گالیوں کے سوا اُسے کچھ بھی حاصل نہ ہوسکا۔

سارا دن وہ اسی طرح پریشان ہوتی رہی۔ گاؤں کے کئی رسوخ والے آدمیوں کے پاس جاکر ماتھا رگڑا، منّتیں کیں کہ کسی طرح پولیس والوں سے کہہ کر ایک بار بچن سنگھ سے ملاقات کرادی جائے لیکن اُس کی کسی نے نہ سُنی۔ جہاں جاتی جھڑکیاں یا پھر طعنے ملتے۔ بس یہی دو چیزیں اُس کے پلّے پڑیں۔

آخر روتی ہوئی پریشان حال وہ اپنی کوٹھری میں جاگری۔

ایک پورا دن اُس نے اس طرح گزارا جیسے ایک پرندہ جو ابھی ابھی آسمان میں اڑ رہا تھا، کسی نے اچانک اس کے پنکھ توڑ کر آگ میں پھینک دیا ہو۔ رات کو بھی وہ بھوکی پیاسی پڑی رہی۔ آج اُسے کسی نے بھی آکر نہ بلایا اور اس کی اُسے ضرورت بھی نہیں تھی۔

صبح تڑکے ہی اُسے باہر سے کسی نے آواز دی۔ یہ ایک پولیس کا سپاہی تھا جس کے ہاتھ بچن سنگھ نے ایک چِٹھی بھیجی تھی۔ چِٹھی دے کر سپاہی فوراً چلا گیا اور سُندری اندر آکر پڑھنے لگی۔ لکھا تھا:-

سُندری جی

آہ! جس بات کا سپنے میں بھی خیال نہیں تھا، وہ ہوگئی۔ دل کی ساری امنگوں اور خواہشوں پر جیسے ایک بار ہی اولے پڑ گئے۔ میرے پکڑے جانے کی وجہ سے آپ کے دل کی جو حالت ہوگی یہ مجھ سے چھُپی نہیں ہے۔ اُف کس قدر جلن ہے۔ جیسے دل میں بھٹّی سُلگ رہی ہو۔ جب میں دیکھتی ہوں کہ اپنی ہیرے جیسی محبوبہ جس کو میں نے بڑی مشکلوں سے اس لیے حاصل کیا تھا کہ اُسے اپنی مالا میں پرو کر گلے میں پہنوں گا، وہ ہیرا خاک میں رل کر خاک ہو رہا ہے اور دنیا... آہ احمق دُنیا کی نظر میں اس کی قیمت پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔

سُندری جی کاش! کاش آپ کو ایک بار سُکھی بنا سکتا۔ لیکن میں بہت بدنصیب ہوں۔ میرے ایسے بدقسمت کے نصیب میں اتنی بڑی خوشی کہاں۔ سُندری جی آپ کے خط کے وہ الفاظ جن کو پڑھ کر میں نے ہنس کر ٹال دیا تھا آج لفظ بہ لفظ سچ نکلے۔ آپ کی پھول اور ہوا والی مثال ایک گہرا فلسفہ تھی جس کو میں آج ہی سمجھ سکا ہوں۔

میری دیوی! دل کہہ رہا ہے کہ اب ہم ہمیشہ کے لیے بچھڑنے لگے ہیں۔ اندر سے کوئی چیز گواہی دے رہی ہے کہ ملن کا سُکھ ہماری قسمت میں بس اس قدر ہی تھا، جتنا ہمیں مل چکا ہے۔ یہ مقدمہ مجھ پر اکٹھے تین خون کا بنایا گیا ہے۔ سُندری جی یہ کوئی معمولی مقدمہ نہیں جس سے بچ نکلنے کی امید کر سکوں۔ گاؤں والے جس ڈھنگ سے یہ مقدمہ کھڑا کر رہے ہیں اور جو کچھ اس کے متعلق میرے سُننے میں آیا ہے اگر وہ سچ ہے تو سمجھیے کہ میرا آپ کا ملن بس اتنا ہی تھا۔

لیکن سُندری جی! کیا آپ کو بھی میری سچائی میں شک ہے؟ کیا میرے خونی ہونے کے لیے آپ کا دل بھی گواہی دیتا ہے؟ مجھے بے شک ساری دنیا قاتل ٹھہرائے، عدالت بھی مجھے خونی مان کر چاہے پھانسی پر لٹکا دے مجھے کوئی دُکھ نہیں ہوگا۔ لیکن سُندری جی اگر آپ بھی مجھے خونی ہی سمجھیں گی تو میرے لیے قیامت ہو جائے گی۔

زیادہ لکھنے کا وقت نہیں۔ یہ سطریں آپ تک پہنچانے کے لیے بھی بڑی مشکل سے انتظام کیا ہے۔ یہ آدمی پھر آپ کے پاس آئے گا۔ چٹھی کا جواب اسے چھپا کر دینا کیوں کہ بے چارے کو اپنی عزت اور نوکری کا بھی خطرہ ہے۔

اس کے ساتھ ہی آج ایک خط گیانی جی کو لکھ رہا ہوں۔ وہ آج کل ہردوار میں قیام پذیر ہیں۔ وہ فوراً آ کر آپ کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ دیوان پور کے قریب رہنا بھی آپ کے لیے خطرے سے خالی نہیں۔

ایک بات اور بتاؤں۔ اگر اپنی خیر چاہتی ہیں تو میرے ساتھ ملاقات کرنے کی کوشش نہ کیجیے گا۔ چٹھی وغیرہ میں کسی نہ کسی طرح لکھتا ہی رہوں گا۔ بس چٹھیوں کو ہی ملاقات سمجھیے گا۔

جانتی ہیں آپ کو دیکھ کر میرا کیا حال ہوگا؟ میرے صبر کا بند ٹوٹ جائے گا۔ یہاں تک کہ موت آنے سے پہلے ہی میں مر جاؤں گا۔ اس کے علاوہ آپ کا حال بھی مجھ سے کچھ کم نہیں ہوگا۔

میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ اس امتحان میں اپنے دل کو کس قدر ثابت قدم رکھتی ہیں۔ اصل میں سُندری جی! یہ بات میں لکھ تو رہا ہوں، لیکن میری اپنی حالت بھی بہت خراب ہے۔ تھانے کی گھڑی ایک ایک گھنٹے بعد ٹن ٹن کرتی ہے تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کی ہر گونج میرے لیے کوئی نئی سے نئی مصیبت کھڑی کر رہی ہے۔ دل میں درد سا اٹھتا ہے اور کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔

کیا بتاؤں سُندری جی! میں آپ کو اپنے دل کا حال! میں آپ کو تو دھیرج دے رہا ہوں لیکن یہاں مجھے دھیرج دینے والا کوئی نہیں۔ اچھا! قسمت میں جو لکھا ہے وہ ہو کر ہی رہے گا

اس وقت مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے سچ مچ آپ سے باتیں کر رہا ہوں اور ان سے کتنا سُکھ مل رہا ہے لمحے دو لمحے کے لیے دنیا کے سارے دُکھ، مستقبل کے دکھوں کی فکر، یہ سب چیزیں مجھ سے دور سی ہو گئی ہیں۔

آپ کا

بچن سنگھ

چٹھی پڑھتے پڑھتے سُندری کے چہرے پر کئی رنگ آئے، کئی رنگ گئے۔ آخر تک پہنچنے پر اس کا ماتھا چمک رہا تھا۔ آنکھوں سے تشدّد جھلک رہا تھا اور ایک طرح کا اعتماد اُس کی رگ رگ میں دوڑ رہا تھا۔

وہ فوراً اٹھی اور قلم دوات لے کر جواب لکھنے بیٹھ گئی۔

میری زندگی کے مالک!

چٹھی پڑھی۔ آپ اتنی جلدی گھبرا گئے؟ ایک مرد اور پھر بے قصور ہوتے ہوئے بھی گھبرائے کس بات سے؟ کسی دُکھ کے تصور سے یا میرا خیال کر کے؟

ارے میرے بھولے پریتم، اس بات کا دوبارہ ذکر نہ کرنا۔ میرا دل، جو آپ کے ساتھ پہلی ملاقات کے وقت پھول کی طرح نازک تھا، وہ بابے کی موت اور آپ پر ظلم ہوتے دیکھ کر لکڑی سا سخت ہو گیا تھا، مگر آپ کی چٹھی پڑھنے کے بعد تو، یہ فولاد کا بن گیا ہے۔!

پریتم اگر دُنیا کی نگاہ میں میری قیمت پھوٹی کوڑی بھی نہیں تو میں خود اس خود غرض اور مکار دُنیا کو کوڑی کے چار چار کے برابر بھی نہیں سمجھتی۔ کیا کہا کہ آپ مجھے سُکھی نہیں بنا سکے؟ یہ آپ کی بھول ہے پریتم۔ جو سُکھ آپ نے مجھے دیا ہے وہ صرف میرے ہی حصے میں آیا ہے۔ جب میں نے اپنی چٹھی میں پھول اور ہوا کی مثال دی تھی تب میں محبت کی راہ میں انجان تھی لیکن اب میں اس کی اہمیت سے، اس کی بڑائی سے صرف واقف ہی نہیں ہو گئی ہوں بلکہ اسے اپنی زندگی کا سہارا بنا چکی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ تب کی باتیں اب مجھے بے معنی اور تجربے سے خالی معلوم ہوتی ہیں۔

میرے مالک! پہلے میری محبت آپ کے جسم سے تھی جس کی وجہ سے مجھے خطرے تھے۔ لیکن اب میرا پریم آپ کی روح سے ہے، اس لیے اب مجھے کوئی خطرہ نہیں اور میں جانتی ہوں کہ قیامت تک آپ کو مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔

میرے سرتاج! آپ کس خیال سے گھبرا رہے ہیں؟ موت سے؟ تو کیا اس موت سے جسے دنیا کی زبان میں مرنا کہتے ہیں لیکن اصل میں اس کا نام زندگی کی منزل کا پڑاؤ ہے؟ معلوم ہوتا ہے زندگی کی منزل کے اس پڑاؤ کی آپ کو قدر نہیں، اور یا پھر خبر ہی نہیں ہے۔ میرے سرتاج، جہاں جا کر ہم ایک روح ہو جائیں گے، جہاں پہنچ کر دنیا کی نفرت سے بھرپور آنکھیں ہمارے لافانی پریم میں رکاوٹ نہیں ڈال سکیں گی اور جہاں پہنچ کر ہمیں محبت کا وہ تخت نصیب ہوگا جس پر بیٹھنے کے بعد ہمارے ایک دوسرے کے گلے میں پڑے ہوئے بازوؤں کو اِندر اور برہما بھی

جدا نہیں کر سکیں گے، کیا آپ اسے موت کا نام دیتے ہیں ؟ یہ ناانصافی ہے میرے پریتم، قطعی ناانصافی !

کیا آپ کا دل مانتا ہے کہ ہم ہمیشہ کے لیے بچھڑ رہے ہیں ؟ نہیں پریتم نہیں ۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ ہم ہمیشہ کے لیے دو سے ایک ہو رہے ہیں ۔

آپ کی سچائی اور اس پر مجھے شک ؟ یہ ایک انہونی بات ہے ۔ میں نہ صرف آپ کو بے گناہ سمجھتی ہوں بلکہ یہ بھی جانتی ہوں کہ اصل قاتل کون ہے ۔ لیکن یہ کس کو بتاؤں، کیا میری بات کا کوئی اعتبار کرے گا ؟

میرا یقین ہے کہ انور نے ہی ان دونوں کو قتل کر کے خودکشی کی ہے ۔ جب میں اس کے ساتھ باتیں کرنے کے بعد چلی آئی تھی تو انور نے دوبارہ اُن کو بلا بھیجا ہو گا اور اس کے بعد یہ واردات کر دی ۔ لیکن میں بار بار یہی سوچ رہی ہوں کہ اس سچائی کو عدالت میں کس طرح ظاہر کروں ؟

گیانی جی کو آپ نے بلا بھیجا ہے ۔ یہ اچھا کیا لیکن آپ کو موت کے منہ میں چھوڑ کر اُن کے ساتھ ہردوار چلی جاؤں یہ میرے لیے ناممکن ہے ۔ کیا میں آپ کو بچانے کے لیے کچھ بھی نہ کر سکوں گی ؟ بے شک میں جانتی ہوں کہ میرے جیسی لاچار اور کمزور لڑکی ایسے کاموں میں کسی بھی لایق نہیں ہو سکتی ۔ لیکن کیا میں آپ کے شروع کیے ہوئے سدھار کے کام کو ادھورا ہی چھوڑ دوں گی ؟ اگر زیادہ نہیں کر سکتی تو اپنے قلم کے زور سے ہی اپنے ملک میں سدھار کی ایسی طغیانی لے آؤں گی جس کی زد میں آکر سماج کا کوڑا کرکٹ بہہ جائے گا ۔

لیکن میرے سوامی ۔ آپ کا دل اس قدر کمزور ہے اس بات کا مجھے کبھی خیال نہیں تھا ۔ دل کو مضبوط کیجیے اور ڈر اور خوف کو پاس نہ پھٹکنے دیجیے ۔ میں آپ سے ملاقات کرنے کے لیے کل سے کوشش کر رہی تھی ۔ آپ نے ملنے سے روکا ہے لیکن ایک بار ملنے کی خواہش پوری کرنے کے لیے معافی چاہتی ہوں ۔

پریتم امتحان میں مضبوط رہنے کے لیے مجھے تاکید کر رہے ہیں لیکن میری طرف سے بے فکر ہو کر یہی اپدیش اپنے دل کو دیجیے ۔ میرے سرتاج اگر مجھے سُکھی رکھنا چاہتے ہیں تو میرے سکھ کا راز بس اسی بات میں ہے کہ اس کے جواب میں آپ کو پوری ہمت اور حوصلے سے ڈٹے ہوئے دیکھوں ۔

ہمیشہ کے لیے آپ کے وجود میں جذب ہو چکی ۔

آپ کی سُندری

(۲۹)

جس دن سے بچن سنگھ گرفتار ہوا تھا، سُندری نے پڑھانے کا کام نہیں کیا، نہ ہی اُسے اپنے تن بدن کی ہوش رہی ۔ وہ صبح سے لے کر شام تک کبھی کسی کے دروازے، کبھی کسی کے گھر بھاگی دوڑی پھرتی تھی کبھی وکیلوں

کے پاس، کبھی منشیوں کے گھر، کبھی گواہوں کی منتیں کرتی تھی۔ اسے کھانے پینے یا کپڑے بدلنے کی بھی سُدھ نہیں تھی۔ لیکن اتنا کچھ کرنے پر بھی اُسے کہیں سے کامیابی کی امید دکھائی نہیں دی۔ بچن سنگھ کی ماں کی طرف سے پیروی ہو رہی تھی لیکن اُس کے رشتے داروں کی اندر ہی اندر یہی کوشش تھی کہ بچن سنگھ کا کانٹا نکال کر اُس کی جائیداد اور زمین پر قبضہ کرلیں۔

دوسری طرف پالا سنگھ بھی اسی تلاش میں ہے کہ کونسا وقت آئے جب سُندری کو حاصل کر کے وہ اپنے گھر کا دروازہ کھولے۔ اس کے راستے کی رُکاوٹ کافی حد تک دور ہو چکی تھی۔

پالا سنگھ کی سازش سے سارا کھیل اس طرح بنایا گیا تھا کہ بچن سنگھ کے بچنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی تھی۔

پولیس کی کارروائی مکمل ہو چکی تھی اور زیر دفعہ ۳۰۲ بچن سنگھ کا چالان ہو چکا تھا۔ سیٹھ رلا رام اور اس کے بیٹے نے پولیس کے پاس بیان دیا کہ بچن سنگھ انور کا مجرا روکنے کے لیے ہمیں کئی طرح کی دھمکیاں دیتا رہا تھا۔ لیکن جب ہم نے اس کا کہنا نہ مانا تو جاتا ہوا کہہ گیا تھا "اچھا میں اسے دوسری طرح روکوں گا۔"

پالا سنگھ نے لکھوایا: "واقعے سے ایک دن پہلے بچن سنگھ مجھے ملا تھا اور کہتا تھا 'مجھے کوئی ایسا آدمی بتاؤ جو ڈیڑھ سو روپیہ لے کر تین خون کر سکے' لیکن جب میں نے اسے اس سے منع کیا تو کہنے لگا 'میں خود ہی سب کچھ کرلوں گا۔'"

اس کے علاوہ پالا سنگھ کے ساتھیوں میں سے کسی نے کہا "میں نے اُس رات کو اُسے ایک چھُرا لیے انور کے دروازے کے چکر لگاتے دیکھا تھا۔" کسی نے کہا "میں نے صبح کے وقت اُسے کنوئیں پر لہو سے بھیگے ہوئے کپڑے دھوتے دیکھا تھا۔" اور کسی نے کہا "حادثے والی رات کو میں نے اُسے خود انور کے چوبارے پر جاتے دیکھا تھا جب کہ کرم چند اور پنڈت جی بھی انور کی بیٹھک میں مجرے کے سلسلے میں کچھ صلاح مشورہ کرنے کے لیے موجود تھے۔"

اس کے علاوہ ایک لوہار نے وہ چھُرا جو لہو سے بھرا ہوا انور کے چوبارے سے ملا تھا، دیکھ کر کہہ دیا "میری دوکان کا بنا ہوا ہے اور بچن سنگھ مجھ سے لے گیا تھا۔"

سارا مقدمہ ہی بچن سنگھ کے خلاف تھا۔ سُندری نے سب سے پہلے وکیل سے جو بچن سنگھ کی ماں نے کھڑا کیا تھا، اپنی اور انور والی ملاقات کا سارا حال بتانے کا ارادہ کیا لیکن اس سے پہلے اس نے یہ سارا واقعہ بچن سنگھ کو بتانا ضروری سمجھا۔

دو تین دن کی بھاگ دوڑ کے بعد سُندری کو ملاقات کی اجازت مل ہی گئی۔

(۳۰)

جیل کی سنگین کوٹھری میں بچن سنگھ بند تھا۔ جس سپاہی کی مدد سے اس نے سُندری کو خط بھیج کر جواب منگوایا تھا اُسی کی مدد سے آج بچن سنگھ سے سُندری کی مُلاقات کا وقت مقرر ہوا تھا۔

شام کے پانچ بجے کا وقت تھا۔ ملاقات والے قیدیوں کو ان کی کوٹھریوں سے نکال کر ڈیوڑھی کے قریب سلاخوں والے برآمدے میں لایا گیا۔ ان میں بچن سنگھ بھی موجود تھا۔

سلاخوں میں سے جھانکتا ہوا بچن سنگھ کسی کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس نے سُندری کو دُور سے آتے دیکھا۔ وہ کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ سُندری کی حالت اس وقت ناگفتہ بہ تھی۔ اُس کے جسم میں جیسے خون کا نشان تک نہیں تھا چہرے کا رنگ بالکل مُردے جیسا تھا۔ وہ اس طرح ڈگمگاتی ہوئی چلی آ رہی تھی جیسے اب گری، اب گری۔

"سندری جی، آپ کا وہ حوصلہ کہاں گیا؟ آپ تو مجھے عقل دے رہی تھیں!" بچن سنگھ نے سلاخوں سے ہاتھ نکال کر سُندری کا بازو ہلاتے ہوئے کہا۔ لیکن سندری کو ہوش ہی نہیں تھا کہ اس سے کیا کچھ کہا جا رہا ہے۔ اتنے دنوں تک وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ اس کا دل بہت مضبوط ہے۔ اس نے ایک آنسو بھی نہیں بہایا تھا لیکن بچن سنگھ سے سامنا ہونے کی دیر تھی کہ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ندیاں بہہ نکلیں۔ شاید یہ اتنے دنوں سے رُکے پڑے تھے۔

"سُندری جی، وقت بہت تھوڑا ہے!" بچن سنگھ نے اُسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ سُندری کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اُس کے آنسو ایک دم بند ہو گئے اور آنکھیں پونچھتی ہوئی بچن سنگھ کی طرف دیکھ کر بولی "میں نے بہت وقت ضایع کر دیا ہے۔"

بچن سنگھ نے کھنکھار کر اپنی آواز کو ٹھیک کرتے ہوئے کہا "نہیں، صرف پانچ منٹ ہوئے ہیں۔ بیس پچیس منٹ ابھی باقی ہیں۔ سُندری جی اسی وجہ سے میں نے آپ کو لکھ بھیجا تھا کہ مجھ سے ملاقات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"لیکن میں کیا کرتی" سُندری نے ہچکی لے کر کہا "ایک کام کے لیے ملنا ضروری تھا۔"

"کونسا کام ہے ایسا؟"

"میں نے آپ کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ اصل بات آپ کو نہیں بتائی۔"

"کیا مطلب؟"

اس کے جواب میں سُندری نے انور سے ملاقات کی باتیں جو اس نے بچن سنگھ سے چھپا رکھی تھیں، کہہ سنائیں۔

سُن کر بچن سنگھ ہکا بکا رہ گیا۔ اس کا اب تک یہی خیال تھا کہ اس کو پھنسانے کے لئے پالا سنگھ نے ہی

یہ کام کیا ہے اور یہ تین خون پالا سنگھ اور اس کے گروہ نے ہی کیے ہیں۔ تب بھی اُسے اس بات کی حیرانی تھی کہ اگر اُس کو پھنسانے اور انور کا زیور وغیرہ لوٹنا ہی پالا سنگھ کا مقصد تھا تو اس نے کرم چند اور پنڈت رادھے کشن کا خون کیوں کیا لیکن یہ سوچ کر اس کا شک مٹ گیا تھا کہ شاید اس وقت یہ دونوں شریف آدمی وہاں آپہنچے ہوں گے اور پالا سنگھ نے ان دونوں کا بھی کام تمام کر دیا ہوگا۔

لیکن آج سُندری کے مُنہ سے اس معاملے کی اصلیت سُن کر کہ انور نے ہی پہلے ان دونوں کا خون کر کے پھر اپنی چھاتی میں چھرا مار لیا ہوگا بچن سنگھ کانپنے لگا۔ اس کے علاوہ سُندری کی ماں (انور) کے بھیانک انجام نے اس کے ہوش ہی گم کر دیا ہے کتنی ہی دیر اُس کے مُنہ سے بات نہ نکل سکی۔

"آج بچن سنگھ مجھے رنڈی کی بیٹی سمجھ رہا ہے" اس خیال سے سُندری کی آنکھیں نیچی ہو گئیں۔

ادھر بچن سنگھ بھی سُندری کے محسوسات کو سمجھ رہا تھا۔ اسی وجہ سے وہ اس سلسلے میں اور بات چیت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ بولا: "اچھا جو ہوا سو ہوا۔ لیکن سُندری جی معاملہ کتنا عجیب ہے۔ ہاں سچ گیانی جی ابھی نہیں آئے۔"

"نہیں شاید آج شام تک آجائیں۔"

"تو آپ صبح کی گاڑی سے اُن کے ساتھ چلی جائیں گی نا"

"نہیں میں ابھی نہیں جا سکتی۔"

"کیوں؟"

"مجھے عدالت میں بیان دینا ہے۔"

"کیا بیان؟"

"یہی جو آپ کو سُنایا ہے اس کی مدد سے میں آپ کو بے قصور ثابت کروں گی۔"

بچن سنگھ کو ہنسی آگئی۔ وہ بولا "سندری جی! آپ کی ان باتوں کا کون اعتبار کرے گا۔ ہاں اگر کبھی انور اپنی اس حرکت کے بارے میں کوئی لکھا ہوا ثبوت چھوڑ جاتی یا مرتے ہوئے پولیس کے پاس اس قسم کا بیان لکھوا جاتی تو شاید کچھ ہو سکتا۔ لیکن اب تو سوائے اس کے کہ لوگ ہنسی اڑائیں گے اور کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

سُندری جوش میں بولی۔ "یہ ہی کہہ کر میری ہنسی اڑائیں گے نا کہ سُندری ایک رنڈی کی بیٹی ہے۔ ایک نہیں ہزار بار کہہ لینے دو۔ مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔"

"نہیں سُندری جی، میں نہیں برداشت کر سکتا کہ آپ کا یہ بھید کھلے۔ اگر آپ کا مجھ سے سچا پیار ہے تو اس بھید کو چھپائے رکھیے۔ دوسری بات یہ کہ عدالت آپ کے اس بیان کو قابل قبول نہیں مانے گی۔ اس کی تائید کے لیے آپ

کے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد بچن سنگھ بولا "لیکن مجھے تو حیرانی ہے کہ وہ کوئی تحریر کیوں نہ چھوڑ گئی؟"

"جہاں تک میرا خیال ہے تحریر میں وہ کچھ نہیں چھوڑ سکتی تھی کیونکہ ایسا کرنے سے میرا ذکر بھی آتا تھا لیکن شاید وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ لوگوں کو یہ پتہ چلے کہ سُندری اُس کی بیٹی ہے۔ دوسرے اُسے اس بات کا کیا پتہ تھا کہ اُس کی اِس حرکت کا نتیجہ آپ کو ہی..." کہتے کہتے سُندری کا گلا بھر آیا اور وہ کچھ بول نہ سکی۔

دونوں میں مشکل سے اتنی ہی باتیں ہوئی تھیں دکھی دلوں کے لیے کئی افسانے ابھی سنانے باقی تھے کہ ملاقات کا وقت ختم ہونے کی گھنٹی بجتے ہی سارے قیدی اپنی مرضی سے یا سپاہیوں کے دھکوں سے ملاقات کی جگہ چھوڑ کر چل دیے۔ بچن سنگھ کے سامنے کھولنے کے لیے سُندری کے دل میں دکھوں کے جو انبار پڑے تھے یوں ہی رہ گئے۔

بچن سنگھ سے علیحدہ ہوتے وقت اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آگیا تھا اور اُسے پتہ ہی نہ چلا کہ کس وقت بچن سنگھ اس کی آنکھوں سے دور ہٹ گیا یا جاتے ہوئے اس نے جو آخری جملے کہے وہ کیا تھے؟

(۳۱)

نا امیدی۔ ہر طرف نا امیدی ہی نا امیدی! دور تک، جہاں تک سُندری کی نظر اور تصور کی پہنچ تھی، سُندری کو مایوسی ہی مایوسی دکھائی دے رہی تھی۔ گیانی جی بھی دوسرے دن آ گئے۔ مقدمہ چونکہ امرتسر کی عدالت میں چل رہا تھا اس لیے گیانی جی اور سُندری دونوں امرتسر میں رہ کر مقدمے کی پیروی کرنے لگے۔ روانی یا دیوان پور رہنا سُندری کے لیے بے مقصد اور خطرناک تھا۔!

بچن سنگھ کا مقدمہ نچلی عدالت میں چل رہا تھا اور اس کا آخری فیصلہ کیا ہوگا؟ یہ سب کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ کیوں کہ مقدمے کی شکل ہی ایسی بن چکی تھی کہ ملزم کے بچنے کا کوئی راستہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ مُجرے کی مخالفت کے سلسلے میں بچن سنگھ کی کئی دنوں کی دوڑ دھوپ اس کے خونی ہونے کی سب سے بڑی وجہ سمجھی گئی۔ اس کے علاوہ قتل والی رات بچن سنگھ کا انور کے دروازے کے چکر کاٹنا بھی ثابت ہو چکا تھا اور یہ اکیلا ثبوت ہی سو ثبوتوں کے برابر تھا۔ اوپر سے پالا سنگھ اور اس کی پارٹی کی وجہ سے جھوٹی گواہیوں نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔

واردات کیسے ہوئی! اس رات جس وقت سُندری انور کے ہاں سے واپس چلی گئی تھی اس وقت انور نے اپنا ایک سازندہ بھیج کر کرم چند اور پنڈت رادھے کشن کو بُلا بھیجا تھا۔ انور کا بلاوہ دونوں کے لیے ایک رحمت کی طرح تھا۔ دونوں اس کی قیام گاہ پر سر کے بل گئے۔ انور نے دونوں کو موت کے گھاٹ اتارنے سے پہلے پریم کا خوب ناٹک

رچایا۔ کچھ تو وہ دونوں پہلے ہی شراب کے نشے میں مدہوش ہو رہے تھے اس پر اس نے اور پلانی شروع کر دی۔ آخر جب وہ نشے میں چُور ہو گئے تو انور نے اپنے چھُرے کے ایک ایک وار سے دونوں کی زندگی کا دیا گل کر دیا اور تیرے وار سے اپنا۔

روز کی طرح جب انا د انور کی بوڑھی نوکرانی) اندر آئی کمرے کا نظارہ دیکھ کر اس نے زور کی چیخ ماری جس کو سن کر کئی لوگ اُوپر آ گئے۔ آہستہ آہستہ وہاں کافی بھیڑ اکٹھی ہو گئی۔ سارا کمرہ خون سے لت پت تھا اور تینوں لاشیں اس میں تیر رہی تھیں۔

پالا سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو جب پتہ لگا تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ وہ پہلے ہی پولیس لے آئے اور اس خونی ناٹک کے لیے بچن سنگھ کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔

خون کیوں ہوا اور کس نے کیا؟ اس بات کا راز سوائے سُندری کے اور کسی کو معلوم نہیں تھا لیکن پچانوے فی صدی لوگوں کا شک بچن سنگھ پر ہی تھا۔ یقین کی جگہ شک کیوں تھا؟ صرف اس خیال سے کہ انور کو تو اُس نے سماج سُدھار کے جوش میں قتل کر دیا ہو گا لیکن دوسرے دونوں کو جس سے اس کی نہ کوئی جان پہچان تھی نہ عداوت اس کے کیوں قتل کیا؟ لیکن لوگوں کا یہ شک اس طرح دور ہو گیا اور وہ بچن سنگھ کو ہی ملزم سمجھنے لگے کہ جب کچھ گواہوں نے بیان دیا کہ پنڈت رادھے کشن اور کرم چند انور کے مکان پر اُس دن ہونے والے مُجرے کے سلسلے میں صلاح مشورہ کرنے گئے تھے کہ بچن سنگھ انور کا خون کر کے چھُرا ہاتھ میں لیے لوٹا تو بھید کھل جانے کے ڈر سے اس نے دونوں کو بھی پار لگا دیا۔ بچاری سدا کور کو غش پر غش آ رہے تھے۔ اِدھر سُندری کا ایک قدم کچہری میں تھا اور دوسرا وکیل کے دفتر میں۔

بچن سنگھ کے وکیل نے سُندری کی شہادت کو صفائی کے گواہوں میں درج کر لیا۔ جب بچن سنگھ پر جرم کی فرد لگی تو سُندری کی گواہی ہوئی۔ اس نے شروع سے آخر تک جو کچھ ہوا تھا سب بیان کر دیا۔ لیکن مقدمے کے سلسلہ میں اس کی لمبی رام کہانی کا کچھ بھی مطلب نہ سمجھا گیا۔ انور کون تھی، پنڈت رادھے کشن اور کرم چند کے چال چلن کیسے تھے، انور کو کن وجوہات کی بنا پر رنڈی کی زندگی اختیار کرنی پڑی؟ سُندری نے اپنی عقل کے مطابق ان باتوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی۔ لیکن سُندری کے پاس ان باتوں کی سچائی کا کیا ثبوت تھا؟ جن سے سُندری کے بیان کی تائید ہونے کی امید کی جا سکتی تھی۔ وہ تینوں قتل ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ وہ چوتھا چودھری بھی سندری کے بیان کے مطابق انور کے ہاتھوں مارا جا چکا تھا۔ اب اگر کوئی زندہ گواہ باقی بچا تھا تو وہ تھا تارا چند جس کے بارے میں کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ زندہ ہے یا مر چکا ہے، یا کہاں ہے؟

صفائی کے وکیل نے بڑی مایوسی میں سُندری سے کہا "لڑکی اگر تیرا باپ (تارا چند) موجود ہوتا تو

ہو سکتا ہے اس معاملے میں کچھ مدد مل سکتی ۔ اب بھی اگر تم اس کو کہیں ڈھونڈ لو تو بہت اچھا ہو۔"

باقی رہی یہ بات کہ خون کس نے کیا؟ اس سلسلے میں تو سُندری کی گواہی کی کوئی قیمت نہیں سمجھی جا سکتی تھی، بے شک سُندری نے اپنی گواہی میں صاف بتا دیا تھا کہ اس کی ماں (انور) نے ان دونوں کو مارنے کے لیے اُس کے سامنے قسم دہرائی تھی لیکن عدالت کو کیا پتہ کہ دہرائی تھی یا نہیں۔ سُندری خود تو واردات کے وقت جائے وقوع پر موجود نہیں تھی۔ عدالت نے سُندری کے سارے بیان کو بناوٹی کہانی یا پاگل پن ہی خیال کیا۔

مطلب یہ کہ سُندری کے بارے میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس کی گواہی کا ملزم کو کچھ فائدہ نہ پہنچ سکا اور آخر مقدمہ سیشن کے سپرد ہو گیا۔

سُندری کو ساری بھاگ دوڑ میں اگر کوئی چیز ملی تو وہ یہ کہ پہلے لوگ اسے اچھوتوں کی لڑکی کہتے تھے اب رنڈی کی لڑکی کہنے لگے۔

عدالتی قانون دولت مندوں کا نوکر اور غریبوں کا مالک ہے۔ وہ امیروں کے حکم پر چلتا ہے اور غریبوں کو اپنے حکم میں رکھتا ہے۔

مقدمے کے دوران کئی بار بچن سنگھ کی سُندری، سدا کور اور گیانی جی سے ملاقات ہوئی جن کا درد بھرا حال لکھ کر ہم قارئین کو دکھی نہیں کرنا چاہتے۔

سیشن عدالت نے کچھ پیشیوں کے بعد بچن سنگھ کے لیے پھانسی کا حکم سُنا دیا۔ بدنصیب سدا کور کے لیے یہ ناقابلِ برداشت حملہ تھا اور یہ خبر سنتے ہی اُس کے ہوش و حواس کچھ دیر کے لیے جواب دے گئے۔

بچن سنگھ کے وارثوں کی طرف سے ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر دی گئی۔

سُندری کے لیے یہ معمولی چوٹ نہیں تھی لیکن اس کے اندر جو بدلے کی آگ بھڑک رہی تھی اس کی گرمی نے اُسے لڑکھڑانے نہ دیا اور اس کا دل اور بھی کڑا اور مضبوط ہو گیا۔

(۳۲)

امرتسر کی ایک چھوٹی سی گلی میں مکان کرائے پر لے کر گیانی جی اور سُندری نے رہنا شروع کر دیا تھا۔ بچن سنگھ کو بچانے کی سب کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ پھانسی کے حکم کے خلاف ہائی کورٹ میں چاہے اپیل کی جا چکی تھی لیکن سُندری جانتی تھی کہ یہ بھی محض ایک رسم کی طرح ہے۔ اس کا بھی کچھ فائدہ نہیں ہو گا۔

تارا چند کو ڈھونڈنے کی خواہش اُس کے دل میں دن بدن بڑھتی جا رہی تھی لیکن یہ بھی ہوا میں لاٹھی چلانے والی بات تھی۔ اُسے رہ رہ کر اپنی بے وقوفی پر غصہ آ رہا تھا کہ اس نے انور سے تارا چند کا حلیہ تو پوچھ لیا ہوتا شکل

کی پہچان کے بغیر وہ کس طرح اسے ڈھونڈنے میں کامیاب ہو سکتی تھی۔ انور سے اُسے اتنا ہی پتہ لگ پایا تھا کہ تارا چند تب سیالکوٹ کے کسی سرکاری دفتر میں نوکری کرتا تھا۔ اسی بنا پر اس نے سیالکوٹ جاکر، دفتروں میں گھوم گھوم کر کئی دن ضائع کیے لیکن آج سے اٹھارہ انیس برس پہلے کی باتوں کا اتہ پتہ اُسے کہاں سے ملتا تھا۔ ادھر سے بھی سندری کو مایوس ہی لوٹنا پڑا۔

لیکن سُندری نے دل نہیں چھوڑا۔ اس نے دوڑ دھوپ برابر جاری رکھی۔ ساتھ ہی کچھ پیسے کمانے کے خیال سے اُس نے کافی دنوں سے چھوڑا ہوا لکھنے کا کام دوبارہ شروع کر دیا۔ وہ دن رات کسی نہ کسی کام میں لگی رہتی تھی کھانے پینے، پہننے اوڑھنے کا اُسے ہوش ہی نہیں تھا۔ ہائی کورٹ کے فیصلے کا وہ بڑی بے تابی سے انتظار کر رہی تھی اور اس انتظار میں اس نے کئی مہینے گزار دیے۔ انہی دنوں میں اس کی کئی کہانیاں پنجابی رسائل میں شایع ہوئیں جنھوں نے ایک گمنام ادیب کے نام کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔

گیانی جی سُندری کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ ہر وقت اُسے روحانی اُپدیش دے کر اُس کے دل کو ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کرتے تھے لیکن سُندری کے اندر جو ہنسا کی آگ جل رہی تھی اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا تھا۔ سُندری کا جسم دن بدن کمزور ہوتا جا رہا تھا لیکن اس کا دل اور سخت اور بے لچک ہوتا جا رہا تھا۔ اسے جیسے ساری دنیا سے نفرت ہو گئی تھی۔ زندگی اُسے ناقابلِ برداشت اور بے معنی سا بوجھ محسوس ہوتی تھی۔

اچانک ایک بار ہی اُس کے صبر کا پیالہ چھلک پڑا جب ایک دن اُسے بچن سنگھ کی چِٹھی ملی۔ بچن سنگھ کے ہاتھ کا لکھا ہوا پتہ دیکھ کر اُس نے دھڑکتے دل سے لفافہ کھولا اور چِٹھی کی پہلی سطر "سُندری جی آخری پیار" پڑھتے ہی اس کا سر چکرانے لگا لیکن اس نے فوراً خود کو سنبھالا اور چِٹھی پڑھنی شروع کی۔

"اپیل نامنظور ہو گئی ہے اور پھانسی کا دن بھی مقرر ہو گیا ہے۔ آنے والا منگل وار —"

سُندری کے ہاتھوں سے چِٹھی گر پڑی۔ اُس کے ہاتھ پاؤں میں تشنج آ گیا۔ لیکن اس نے ہمت کر کے ایک بار پھر دل کو کڑا کیا۔ گیانی جی کے روحانی اپدیشوں نے اس وقت اس کی مدد کی اور اس نے آگے پڑھنا شروع کیا۔

"آہ سُندری جی۔ جانتی ہیں اس وقت میرے دل کی کیا حالت ہے؟ کوئی بھی نہیں جان سکتا سوائے اس بدنصیب کے جو میری جیسی حالت سے گزرا ہو۔ اُف یہ دُنیا کتنی ڈراؤنی معلوم ہو رہی ہے۔ سلاخوں والی کوٹھری میں اور وہ بھی معمولی قیدیوں والی نہیں، پھانسی کی کوٹھری میں ہونے پر بھی مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں یہاں کی گندگی سے آزاد ہوں اور اپنے آپ کو اس دنیا کے اوپر اڑتا پھرتا دیکھ رہا ہوں۔ ایک کے بعد دوسرا دوسرے کے بعد تیسرا نظارہ آنکھوں کے سامنے پھیلتا جاتا ہے۔ کون سے نظارے؟ وہی جو ہوش سنبھالنے

کے بعد سے آج تک دیکھ چکا ہوں۔

"جب سپرنٹنڈنٹ نے میری کوٹھری میں آکر مجھے پہلی بار پھانسی کا حکم سنایا تھا اُس وقت میری کیا حالت ہوئی؟ اس کے مُنہ سے یہ چار حرفی لفظ نکلنے کی ہی دیر تھی کہ میرے لیے دنیا کا ڈھانچا ہی بدل گیا۔ اُس وقت کوٹھری کی دیواریں، چھت، سلاخوں والے دروازے اور فرش وغیرہ سب پھانسی پھانسی کا شور مچا کر میرے کان پھاڑ رہے تھے۔ باہر سنتری بندوق کندھے پر رکھے مُنہ ہی مُنہ میں گنگناتا ہوا اُدھر سے اِدھر، اِدھر سے اُدھر آجا رہا تھا۔ وہ بھی جیسے پھانسی کا راگ الاپ رہا تھا۔ سامنے والے شہتوت کے پیڑ پر کوّے بول رہے تھے۔ جیسے ان کو بھی پھانسی کے لفظ کے سوا اور کچھ یاد نہیں تھا۔

"میں سر سے لے کر پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ لیکن نہیں، میں کانپ نہیں رہا تھا اور نا ہی میرا کوئی انگ کانپتا ہوا معلوم ہوتا تھا، لیکن میں اندر سے کچھ اس طرح محسوس کر رہا تھا جیسے میں کانپ رہا ہوں۔ میرا دل و دماغ، میرا تصور، میرا خیال، ہر ایک چیز کانپ رہی تھی۔ فرش، چھت، سامنے کا آنگن اور باہر کے درخت، سب کانپ رہے تھے۔

"کئی گھنٹے تک میری یہی حالت رہی۔ پھر آہستہ آہستہ دوسری تصویر میری آنکھوں کے سامنے آئی۔ وہ تھی ایک بھولی بھالی دیوی کی تصویر۔ جس کا رنگ سرسوں کے پھول کی طرح پیلا تھا۔ جس کا جسم کسی ڈاکٹر کی ڈسپنسری میں رکھا ہوا ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا لیکن اس کے اندر سے، پیلے چہرے کے اندر سے کوئی چمک پیدا ہو رہی تھی اور بس وہی چمک میرے دل کو بے قابو کیے دے رہی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی مجھ پر نشہ سا طاری ہو گیا۔ مجھے یاد ہی نہ رہا کہ مجھے موت کی سزا ہو چکی ہے ـــــ اور یہ تھی میری سُندری۔!

"دوسرے ہی لمحے وہ تصویر غائب ہو گئی اور میری آنکھیں پھانسی کا پھندا دیکھ رہی تھیں اور اس کے قریب ہی ایک کالے اور ڈراؤنے مُنہ والے جلّاد کو جو بڑی محنت سے پھانسی کے رسّے پر تیل لگا لگا کر اس پر کسی چیز کی تہہ چڑھا رہا تھا۔ اس نظارے کو دیکھ کر مجھ پر وہی پہلے کی طرح کپکپی طاری ہو گئی۔ میرا دل اور کئی طرح کے خیالوں کے بہاؤ میں بہہ گیا۔ میرا دل گھبرائی ہوئی آواز میں جیسے جلّاد سے کہہ رہا تھا "میرے دوست! ذرا ٹھہر جا۔ اتنی جلدی نہ کر۔ ابھی میرے کئی کام ادھورے ہیں۔ انھیں ختم کر لینے دے۔ بہت زیادہ دیر نہیں لگاؤں گا۔ بس فوراً ہی۔" لیکن جلّاد نے اور جلدی کرتے ہوئے کہا "واہ مجھے اپنا کام ختم کرنے کی جلدی ہے اور تجھے اپنا کام ختم کرنے کی۔" اور پھر جلد جلد رسّے کو تیل لگاتے ہوئے پرت سی چڑھانے لگا۔

"میرا دل اس کا جواب سُن کر مایوس ہو گیا۔ میرا حال اُس مسافر جیسا تھا جس کو ابھی تک منوں سامان ریل پر چڑھانا ہو اور گاڑی نے وِسل دے دی ہو اور گارڈ بابو نے ہری جھنڈی ـــــ

"آہ سُندری جی! آپ نے کبھی کسی خط میں اس موت کی جو تعریف کی تھی۔ اس کے اثر سے میں بھی کچھ ویسا

ہی محسوس کرنے لگا تھا۔ لیکن آہ، پھانسی کا حکم سنتے ہی آپ کے سارے اپدیش بھول گئے۔ یہ موت پہلے سے بھی ہزار گنا ڈراؤنی بن کر میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"میں نے آپ سے کہا تھا کہ مجھ سے ملاقات نہ کریں اس سے میری تکلیف اور بڑھ جائے گی لیکن اب حالت وہ نہیں رہی۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے سارے دُکھوں کا علاج ہی آپ ہیں۔ بس میں مرنے سے پہلے ایک بار اور صرف ایک بار آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ کا ملن میرے لیے اتنا فائدے مند ثابت ہوگا کہ میں آرام اور خوشی سے مر سکوں گا۔

"سُندری جی! یہ باتیں کون لکھ رہا ہے۔ یہ ولولے کہاں سے اٹھ رہے ہیں اور کون سی چیز دماغ میں بیٹھی ہوئی ترتیب سے انھیں قلم کے حوالے کر رہی ہے؛ اتنے چھوٹے سے دل اور دماغ میں اتنا کچھ کس طرح سما رہا ہے؛ اور کیا یہ چار گز کی رسّی اپنے ایک جھٹکے سے اس سب کچھ کا خاتمہ کر دے گی۔ کیا اس ذرا سے پھندے سے آنکھوں کی نہریں، جو اس وقت طغیانی آئے ہوئے دریا کی طرح بہہ رہی ہیں ایک دم سوکھ کر بنجر ہو جائیں گی؛ کیا یہ ہاتھ جو بجلی کی سی تیزی سے قلم چلا رہے ہیں، ٹھیک آج سے چھٹے دن لکڑی کے چھلکے سے رہ جائیں گے؟ سینے کے مندر میں جو آسمانی مورتی بیٹھی ہے اور جس کی میں روز ہی پیار کے پھولوں کی بھینٹ چڑھا کر پوجا کرتا ہوں، وہ مورتی اب ظلم کے ایک ہتھوڑے کی چوٹ سے چکنا چور ہو جائے گی۔

"اوہ! میں کتنا مورکھ ہوں۔ گھر میں لگی آگ کو چلّو بھر پانی سے بجھانے کی کوشش کی طرح میں نے یہ کون سی رام کہانی شروع کر دی ہے۔

"سُندری جی! بس کرتا ہوں۔ یہ دکھوں بھرے افسانے ختم ہونے والے نہیں۔ جس کو سچ مچ پیاس لگی ہو، سینے میں سنوں پانی پینے سے بھی اس کی پیاس نہیں بجھتی۔ میرا آپ کا ساتھ بس اتنے ہی عرصے کے لیے تھا۔ لیکن نہیں، یہ تو قیامت تک قائم رہے گا۔

"دیکھیے سُندری جی۔ آپ کی اُس چٹھی کا مطلب میں تب نہیں سمجھا تھا، اب سمجھ میں آیا ہے۔ کیا آپ میرے مرنے کے بعد جینا نہیں چاہتیں۔ میں آپ سے یہ آخری گزارش کرتا ہوں کہ ہرگز ایسا نہ کریں۔ لیکن آپ اگر کسی اور طرح نہیں مانیں گی تو میں آپ کو ایک بات کی یاد دلا دوں کہ آپ کی ذات پر ایک دُکھی ہستی کا بوجھ ہے۔ میری بے آسرا ماں کا، جو اس وقت زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہی ہے۔ بس جب تک آپ اس کی طرف سے بے فکر نہیں ہو جائیں تب تک آپ کو کوئی حق نہیں ایسا کرنے کا۔ جب کہ ہم نے لاکھوں برس تک اکٹھا رہنا ہے تو پھر یہ مختصر سی دوری برداشت کرنی بڑی بات نہیں۔ میں آپ کا انتظار کروں گا لیکن آپ اپنا فرض، جو میں آپکے ذمّہ کر چلا ہوں، پورا کیے بغیر میرے پاس نہیں آسکتیں۔

"سوموار کو میری گھر والوں سے ملاقات ہوگی اور منگوار کو آپ سے۔ اس لیے منگل وار کی صبح گیانی جی کو ساتھ لے کر یہاں پہنچ جائیں۔ اور سندری جی! ہماری ملاقات کافی دیر کے لیے ہوگی۔ سپرنٹنڈینٹ نے خاص مہربانی سے اس کا وعدہ کیا ہے۔

"آہ سُندری جی! کیا میں چٹھی ختم کردوں؟ یہ کام مجھے اس قدر مشکل معلوم ہوتا ہے جیسے چٹھی ختم ہونے کے ساتھ ہی میرے لیے ساری دنیا ہی ختم ہو جائے گی اور میرے مرنے کے لیے اس دنیا میں کچھ بھی نہیں رہ جائے گا۔

"کاغذ ختم ہو چکا ہے۔ حاشیے پر بھی جگہ باقی نہیں رہی۔ لفظوں سے لفظ ملا کر اتنا کچھ ہی لکھ سکا ہوں۔ سر پر کھڑا جمعدار تنگ کر رہا ہے کہ جلدی چٹھی بند کر۔ سپرنٹنڈینٹ کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔

"آپ کی موہنی صورت کو دل میں بسائے — میری سُندری جی — میں چٹھی ختم کرتا ہوں۔ آخری پیار۔

آپ کا

بچن سنگھ"

پھانسی کا حکم ہونے سے آج تک بچن سنگھ دن رات خیالی محل بناتا اور ڈھاتا رہا۔ کئی قسم کے خیالات اس کے دل میں دریا کی طغیانی کی طرح آتے اور چلے جاتے۔ آخر آنکھوں کے سامنے وہی پھانسی وہی موت بس دو ہی چیزیں رہ جاتی تھیں۔ لیکن آج جب کہ پھانسی سے پہلے کا آخری دن ہے اُس کے دل میں کوئی ولولہ نہیں مچل رہا۔ ساری طاقتیں اُبل اُبل کر جیسے ٹھنڈی ہو گئی ہیں اور صرف ایک موت کی تصویر اس کے سامنے ہے۔ اسے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے پھانسی لگنے سے پہلے ہی وہ مر چکا ہے اور مرنے کے بعد کسی اور دنیا میں جا بسا ہے۔ ساتھ والی بیرک میں دو تین کولہو چل رہے تھے۔ اُن کی جھیں جھیں کی آواز اُسے اس طرح لگتی جیسے کوئی بیوہ اپنے شوہر کی موت پہ گریہ وزاری کر رہی ہو۔ کوٹھری کے ایک کونے میں ایک ٹڈی ٹیں ٹیں کر رہی تھی لیکن اُسے یوں سنائی پڑتا تھا جیسے کوئی ماں اپنے مرے ہوئے بیٹے کا سر زانوں پر رکھے بین کر رہی ہو۔ سامنے والے میدان میں کبھی کبھی دو چار چڑیاں چیں چیں کرتی اُڑتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں اور اُسے لگتا تھا جیسے موت ان کے پیچھے پڑی ہو اور وہ ڈر کے مارے اس سے جان بچاتی پھر رہی ہوں۔

لاہور سینٹرل جیل کی اس تنگ و تاریک کوٹھری میں ہی اسے اپنی بد نصیب ماں کا خیال آیا جو کل ہی اس سے ملنے آئی تھی پھر سُندری کا خیال آیا جسے آج ملنے آنا تھا۔ وہ اپنی آہنی سلاخوں والی تنگ کوٹھری میں بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا۔ اب سُندری گاڑی سے اُتری ہوگی۔ بابو کو ٹکٹ دیتے ہوئے اس کے پتلے پتلے ہاتھ کانپ رہے ہوں گے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہونے کی وجہ سے راستہ صاف نہیں دکھائی دے رہا ہوگا۔ اب گیانی جی نے اُسے دھیرج دلاسہ دے کر تانگے میں بٹھایا ہوگا۔ اب تانگہ جیل کی طرف دوڑ رہا ہوگا۔ سڑک کے کنارے کھڑے درخت اس کے سامنے

سے ہو کر جب پیچھے کی طرف بھاگتے دکھائی دیتے ہوں گے تو ان کو وہ ماضی کے سکھوں کا روپ سمجھ کر کہہ رہی ہوگی "جاؤ میرے ساتھیو جاؤ۔ ہمیشہ کے لیے جاؤ۔" تانگہ اب جیل کے دروازے کے سامنے ہوگا۔ سندری کی نظر سب سے پہلے کالے پھاٹک پر پڑے گی جو سوگ مناتا، ماتم کرتا ہوا معلوم ہو رہا ہوگا۔ دروازے کے سامنے ٹہلتے ہوئے لال پگڑی والے سپاہی کو وہ موت کے فرشتے یم راج کا دوت سمجھے گی۔ شاید سندری یہ نظارہ نہیں دیکھ سکے گی اور بے ہوش ....."

اسی وقت اسے بھاری بوٹوں کی چاپ سنائی دی اور وہ اٹھ کھڑا ہو گیا۔ باہر ایک انگریز سپرنٹنڈنٹ ایک ڈاکٹر دو انسپکٹر اور بہت سے سپاہی کھڑے تھے۔

کوٹھری کا دروازہ کھلا اور کسی کے کچھ کہے بغیر ہی بچن سنگھ سمجھ گیا کہ پھانسی کا وقت ہو گیا ہے۔

اس نے ہتھکڑیاں دیکھ کر خود بخود بازو آگے پھیلا دیے اور ایک سپاہی نے اس کے دونوں بازو پیچھے کی طرف لے جا کر ہتھکڑی لگا دی۔ سب کے سب اُسے آگے لے کر چل پڑے۔

بچن سنگھ زمین پر چل تو رہا تھا لیکن اُسے لگتا تھا جیسے زمین اس کے پاؤں کے نیچے نہیں ہے۔ اُسے محسوس ہوتا تھا جیسے ہوا میں چل رہا ہے۔ اس وقت اُسے اپنا سر دماغ سے خالی محسوس ہو رہا تھا اور سینہ دل کے بغیر۔ پھر بھی ابھی کوئی ایسی خواہش اس کے اندر زندہ تھی جو اس کے لاش سے جسم کو چٹکی بھر جاتی تھی۔ اُس کی آنکھیں پتھر ہو چکی تھیں لیکن اب بھی کچھ اور دیکھنا چاہتی تھیں۔ ہتھکڑی میں جکڑے اُس کے ہاتھ انگلیوں سے زنجیر چھو کر یہ محسوس کرنا چاہتے تھے "یہ لوہا ہے یا گوشت۔"

اب بچن سنگھ اپنے آپ کو ایک ایسی جگہ کھڑا دیکھ رہا تھا جسے بے شک آج تک اس نے دیکھا نہیں تھا لیکن بغیر دیکھے تصور ہی میں یہ جگہ اس کی نظروں کے سامنے رہی تھی۔ یہ تھی پھانسی والی جگہ۔!

ایک بار تو بچن سنگھ اس جگہ کو دیکھ کر ایڑی سے چوٹی تک کانپ گیا۔ لیکن اس کی یہ حالت فوراً ہی بدل گئی۔ اب اس کی آنکھوں کے سامنے کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف اندھیرا تھا — گہرا اندھیرا۔!

اُسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر وہاں کھڑا رہا۔ اسی وقت اس کے کانوں میں آواز آئی "ویل مسٹر بچن سنگھ کوئی بات کہنا مانگتا؟"

اس کا جواب دیا کس نے؟ اُس نے یا کسی اور نے؟ اس کا اُسے کچھ پتہ نہیں تھا۔ اور وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اُسی نے جواب دیا ہے اس کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ اس کے بعد پھر پہلی آواز آئی "اچھا ان کو بلاؤ۔"

یہ بات بچن سنگھ کے کانوں میں پڑی۔ جیسے دوبارہ اس کے ہوش و حواس کچھ دیر کے لیے لوٹ آئے۔

تھوڑی دیر بعد اُسے اپنے پیچھے کسی کی چیخ کی آواز سنائی دی۔ آواز کو پہچان کر اس نے فوراً مڑ کر

دیکھا۔ یہ سُندری تھی، جسے گیانی جی کندھے کا سہارا دیے اس کی طرف لیے آ رہے تھے۔ گیانی جی کی گزارش پر افسر نے ملزم کی ہتھکڑی کھول دی۔

سُندری اب بچن سنگھ کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ سارا زور لگا کر اپنے آپ کو ہوش میں رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ گیانی جی نے ایک ہاتھ میں بچن سنگھ کا ہاتھ تھاما ہوا تھا اور دوسرے میں سُندری کا۔ وہ دونوں پتھرائی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں ایک دوسرے کی آنکھوں میں گڑی ہوئی تھیں اور ایک دوسرے کی آنکھوں کی پتلیوں میں انھیں اپنے وجود کی ہی مدھم سی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ بس اور کچھ نہیں سوائے اس کے کہ بچن سنگھ سُندری کی آنکھوں میں چھپا بیٹھا تھا اور سُندری بچن سنگھ کی آنکھوں میں۔

اسی وقت سُندری کو اپنی گردن پر کسی ٹھنڈی ٹھنڈی چیز کے لگنے کا احساس ہوا۔

اس نے دیکھا گیانی جی نے ایک رومال کی گانٹھ کھول کر ایک ایک پھولوں کا کنٹھا دونوں کی گردن میں ڈال دیا۔ وہ یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ اس کا ہاتھ بچن سنگھ کے ہاتھ میں ہے۔ ان دونوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر گیانی جی کہہ رہے تھے:

"اے دو جہاں کے مالک! اس جوڑی کی محبت قیامت تک قائم رہے اور یہ سوُرگ میں اکٹھے ہو کر ہمیشہ شادی شدہ زندگی گزاریں۔"

اس وقت انگریز افسر نے اپنے سر سے ٹوپی اتار لی۔ باقی کے سپاہیوں نے (جو سب مسلمان تھے) سر نیچے کر کے ایک آواز میں کہا "آمین۔ آمین۔"

اس کے بعد دونوں کے جسموں میں کچھ زندگی کی لہر سی دوڑ گئی اور وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ ایک منٹ۔ دو منٹ، پانچ منٹ — آخر دس منٹ ہو گئے لیکن ان کے بازو ڈھیلے نہ ہوئے۔

سپرنٹنڈینٹ کا اشارہ پا کر گیانی جی نے کہا

"کاکا بچن سنگھ، بیٹی سُندری — میرے بچو۔"

لیکن انھوں نے ایک دوسرے کو نہ چھوڑا۔ شاید دونوں کے ہوش و حواس جواب دے چکے۔ آخر گیانی جی نے سُندری کا بازو پکڑتے ہوئے کہا "میری بچی!" اور سپرنٹنڈینٹ نے بچن سنگھ کا بازو پکڑ کر کہا "مسٹر بچن سنگھ!"

ان کے بازو ڈھیلے پڑ گئے۔ بچن سنگھ مدہوشی کی حالت میں کھڑا تھا۔ تب ایک آدمی نے اس کو سر پر سے ایک لمبا کالا کوٹ پہنا دیا۔ سُندری گرنے ہی لگی تھی کہ گیانی جی نے اُسے تھام لیا۔ پھر سپرنٹنڈینٹ کے حکم سے سُندری کے لیے ایک چارپائی لائی گئی۔

... ...

اس کے بعد جب سُندری کو ہوش آیا تو رات کا اندھیرا ہر طرف پھیل چکا تھا۔ انجن کی پھک پھک مسافروں کے شور، خوانچے والوں کی پُوپڑے لے لو، مٹھائی لے لو کی آوازوں اور بیڑی سگریٹ کے دھوئیں کی بدبو سے اس نے اندازہ لگایا کہ وہ ریلوے سٹیشن پر ہے اور یہ کمرہ مسافرخانہ ہے۔

سُندری بیٹھ گئی اور بیٹھتے ہی اس نے پانی مانگا۔ گیانی جی لوٹا لے کر پانی لینے چلے گئے۔ سندری کو کچھ ہی دیر میں آج والا واقعہ پھر یاد آگیا۔ اس وقت اُسے اپنا سر اس طرح معلوم ہوتا تھا جیسے منوں بھاری ہو گیا ہو۔ اس میں کوئی سوچ، کوئی تصوّر یا کوئی خیال باقی نہیں تھا۔ اپنے کندھوں پر اٹھایا ہوا یہ بوجھل پتھر اُسے تکلیف دہ معلوم ہوتا تھا! میں کیا سے کیا ہو گئی؟ آج میں سب کچھ گنوا کر دنیا میں اکیلی اور بے سہارا ہوں، اس بات کا بھی اُسے خیال نہیں تھا بلکہ اُس کی حالت اس وقت اس چھت جیسی تھی جس کو سہارا دینے والا ستون گر گیا ہو۔

وہ اسی طرح نیم پاگل سی، پتھرائی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ اتنے میں گیانی جی پانی لے آئے۔ پانی پینے سے اس کے جسم میں کچھ طاقت آئی اور آہستہ آہستہ اُس کے دماغ کی رُکی ہوئی مشین پھر حرکت میں آنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اسے دنیا کا نقشہ بدلتا ہوا معلوم ہوا۔ وہ اس طرح محسوس کر رہی تھی کہ وہ کسی بوجھ کے نیچے دبی جا رہی ہے۔

بچن سنگھ سے آخری ملن کی جھلک اس کے سامنے آئی لیکن بہت پھیکی سی، سُرمے کی دھار کی طرح۔

"اُن کو پھانسی لٹکا دیا گیا" یہ خیال آنے ہی کی دیر تھی کہ وہ چیخ مار کر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر بینچ پر مُنہ کے بل لیٹ گئی۔ گیانی جی سے یہ سُن کر کہ اس کا شوہر بے گناہ ہی آج پھانسی پر لٹکا دیا گیا ہے، بہت سے مُسافر اُس کے گرد اکٹھے ہو کر اسے حوصلہ دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

سندری اس وقت رونا چاہتی تھی لیکن رو نہیں سکتی تھی۔ اُسے رونا آتا ہی نہیں تھا۔ اُس کے جسم سے جو آگ کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں۔ انھوں نے شاید اس کے آنسوؤں کو بھی خشک کر دیا تھا۔

وہ پھر اٹھی اور مسافرخانے سے باہر چلی گئی۔ اپنے اِرد گرد کے مُسافروں کو جہاں تک اس کی نظر جا سکتی تھی اُس نے دھیان سے دیکھا۔ ہر ایک آدمی سے وشواس گھات اور دشمنی کے جذبے کی بدبو آ رہی تھی۔ وہ خیال کر رہی تھی کہ پرماتما نے یہ جو کچھ بھی بنایا ہے سب اُسے تباہ کرنے کے لیے بنایا ہے۔ اوپر آسمان کی طرف دیکھنے سے اُسے لگتا تھا کہ یہ جو کالے کالے بادل اِدھر اُدھر گھوم رہے ہیں، صرف وہی اس کے ساتھ سچی ہمدردی کے اظہار کے لیے کالے رنگ کا ماتمی لباس پہن کر آئے ہیں۔ کہیں کہیں تارے ٹمٹما رہے تھے، جو شاید اس کی بُری حالت برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے بادلوں کے نیچے چھپے جا رہے تھے۔ اونچے قد کے دھندلے درخت بھی سر ہلا ہلا کر اس کے دکھ

میں شریک ہو رہے تھے۔ یہ کائنات اس کے لیے ماتم کی سرائے بنی ہوئی تھی!

اُس کے جسم میں ایک دم کوئی بجلی سی دوڑ گئی۔ اپنے اِردگرد کھڑے لوگوں کی طرف قہر بھری نظر سے دیکھتی ہوئی بولی۔ "کیا دیکھتے ہو؟ ابھی پیٹ نہیں بھرا میرا لہو پی کر۔ اچھا اور جتنا زور لگتا ہے لگا لو۔ اب اس سے زیادہ میرا اور کیا بگاڑو گے۔ اب تو تم نے میرا کچھ باقی ہی نہیں چھوڑا۔ میرا سب کچھ کھا کر ہضم کر گئے ہو۔ ابھی۔"

گیانی جی نے اس کا بازو پکڑ کر ایک طرف بٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "بیٹی ہوش میں آ، اپنے آپ کو سنبھال۔"

مسافر اُس کے گرد سے ہٹ گئے اور گیانی جی اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ "بیٹی اس طرح کی حرکتیں کرنے سے تو تو اپنی جان بھی خطرے میں ڈال لے گی۔ جو کچھ ہونا تھا..."

سندری ان کی بات پر ہنستی ہوئی بولی "کیا کہا پتا جی؟ میری جان خطرے میں؟ نہیں، میں ابھی نہیں مروں گی۔ ابھی میرے کرنے کے لیے بہت کام ہیں۔ ان کو ختم کرنے سے پہلے میں نہیں مروں گی۔ ہاں سچ پتا جی۔ ان کا داہ سنسکار؟"

"وہ ہو چکا ہے۔ تجھے ہوش میں لانے کی بہت کوشش کی گئی تھی۔ لیکن..."

"خیر کوئی حرج نہیں"

اس کے بعد دونوں امرتسر جانے والی گاڑی میں جا بیٹھے۔

امرتسر پہنچ کر جب دونوں مسافر خانے سے باہر نکلے تو سُندری نے گیانی جی سے کہا "پتا جی میں آپ کو اور باندھنا نہیں چاہتی۔ کچھ دنوں کے لیے مجھے اکیلی چھوڑ دیجیے۔"

"اکیلی چھوڑ دوں؟" گیانی جی نے حیرانی سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "کیوں بیٹی؟"

"میں دیوان پور جا رہی ہوں۔"

"لیکن وہاں تمھارا کیا کام ہے؟"

"آپ کو پتہ نہیں۔ وہ اپنی ماتا جی کا بوجھ مجھے سونپ گئے ہیں۔ میں کچھ عرصہ ان کی ماتا جی کے پاس رہوں گی۔"

"تو چل میں تجھے چھوڑ آتا ہوں۔"

"نہیں پتا جی۔ میں اکیلی جاؤں گی۔"

کافی کھینچا تانی کے بعد گیانی جی کو اس کا ساتھ چھوڑنے کے لیے مجبور ہونا پڑا۔ آخر یہی فیصلہ ہوا کہ سُندری دیوان پور چلی جائے اور گیانی جی ایک دن امرتسر رہ کر ہردوار واپس چلے جائیں۔

(۳۴)

اسٹیشن سے باہر نکل کر سُندری اپنے مستقبل کے بارے میں کئی طرح کی باتیں سوچتی ہوئی دیوان پور کی سڑک پر چل دی۔ اب اس کا دل ٹھہرا ہوا تھا۔ اسے ہر لمحہ بچن سنگھ کی یاد آتی تھی لیکن یہ یاد اس کو رُلاتی تڑپاتی نہیں تھی۔ جس طرح لوہے کو جوں جوں آنچ لگتی ہے وہ اور چیزوں کی طرح پگھلنے یا جلنے کے بجائے مزید سخت ہو کر اور مضبوط بن جاتا ہے۔ اسی طرح سُندری کا دل بچن سنگھ کی موت کے بعد دگنا مضبوط اور خطرناک ہو گیا تھا۔

مستقبل کے کسی خطرے یا دُکھ کی توقع جتنی تکلیف دہ ہوتی ہے اتنا ڈراؤنا اس کا حال نہیں ہوتا۔ ٹھنڈے پانی کے تالاب میں نہانے سے پہلے آدمی اس میں داخل ہونے سے ڈرتا ہے لیکن ایک آدھ ڈبکی لگا لینے کے بعد پھر چاہے کتنی دیر پانی میں کھڑا رہے اُسے تکلیف معلوم نہیں ہوتی۔ سُندری کو اب اتنا دُکھ نہیں تھا جتنا آنے والے وقت کا خیال تھا۔ دوسری بات یہ کہ چوٹیں اور ظلم برداشت کرنا اب اس کی عادت بن چکی تھی۔

سدا کور نے اس دن سندری کی حد سے زیادہ بے عزتی کی تھی لیکن بچن سنگھ کے حکم کے سامنے اُسے سب کچھ بھولنا پڑا۔ وہ دیوان پور پہنچ کر سب سے پہلے سدا کور کے گھر کی طرف گئی۔ رات کے آٹھ بج چکے تھے جب اس نے سدا کور کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے آواز آئی "کون ہے؟"

سُندری نے دھڑکتے دل سے جواب دیا "بے بے جی! میں ہوں سُندری۔"

اُسے اس بات کا پتہ تھا کہ سدا کور پہلے سے بھی زیادہ اس کی بے عزتی کرے گی۔ جب بچن سنگھ کے جیتے جی اس نے یہ حال کیا تھا تو اب تو پھر پرماتما ہی مالک ہے۔ لیکن سب کچھ برداشت کرنے کے لیے اس نے اپنا دل پکا کر لیا تھا۔

دروازہ کھلا اور ہاتھوں میں دیا اٹھائے سدا کور اسے سامنے دکھائی دی۔ اس کی نظر اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ دن کے وقت بھی مشکل سے ہی آدمی کو پہچان سکتی تھی۔ سُندری اس کے منہ سے نکلنے والی آگ کی بوچھار برداشت کرنے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔ وہ انتظار کر رہی تھی کہ سب سے پہلی گالی سدا کور کے منہ سے کونسی نکلتی ہے لیکن وہ حیران رہ گئی جب اس نے سدا کور کو دونوں بازو اس کی طرف پھیلا کر یہ کہتے سُنا:

"آ میری دکھی بچی۔ میں صدقے!"

سُندری اُس کے پیروں میں گر پڑی۔ سدا کور نے اسے پیار سے اٹھا کر گلے سے لگا لیا اور روتی ہوئی بولی "بچی۔ آج تیرا سہاگ لٹ گیا۔"

وہ اور کچھ نہ بول سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ انور جان سے ملنے کے بعد آج دوسری بار سندری

کے دل میں ماں کے لیے محبت امڈ ی تھی۔

بچن سنگھ نے کل آخری ملاقات میں سُندری کے متعلق اپنی ماں کا دل صاف کردیا تھا اور پھر ہمیشہ کے لیے سندری کو ہی بچن سنگھ کی امانت سمجھ کر سینے سے لگا کر رکھنے کی تاکید کی تھی۔ یہ سب باتیں سدا کور نے اُسے ایک ایک کرکے سنائیں۔ سُندری نے بھی اپنے دکھوں کی کہانیاں سنانی شروع کیں۔ ایک دوسرے پر اپنے دُکھ ظاہر کرکے اُن کو یہی معلوم ہوا جیسے بچن سنگھ زندہ ہے۔

آدھی رات دونوں نے دُکھ بھری باتیں کرتے ہوئے گزاری۔ دونوں اپنے اپنے دل میں یہی سوچ رہی تھیں کہ اگر پرماتما اس سے ملن نہ کراتا تو میرا کیا حال ہوتا۔ میں کیسے زندہ رہتی؟

اس کے بعد باتوں باتوں میں ہی سُندری کو یہ بھی پتہ چلا کہ سدا کور کا پیسہ دھیلا پہلے ہی ختم ہو چکا تھا لیکن اس مقدمے میں اس کا زیور تک بک چکا ہے اور کچھ زمین بھی گروی رکھ دی گئی ہے اور جو کچھ بچی کھچی ہے وہ رشتے دار دبانے کی فکر میں ہیں کیونکہ قانونی طور پر وہ اس کے وارث ہیں۔ سدا کور اس وقت کوڑی کوڑی کی محتاج ہوئی بیٹھی تھی۔ روکھی سوکھی روٹی ملے گی یا نہیں، اس میں بھی شک تھا۔

اس کے علاوہ سدا کور کی زبانی سندری کو یہ بھی پتہ چلا کہ پالا سنگھ اس کے دیوروں اور جیٹھوں کو بھڑکا رہا ہے کہ وہ لگے ہاتھوں فوراً جیوا سنگھ کی زمین پر قبضہ کرلیں اور اس تجویز پر عمل کرنے کی تیاریاں بھی شروع ہو گئی ہیں۔

سندری کے زخمی سینے پر ایک اور چوٹ لگی۔ اس کی نس نس اس وقت پالا سنگھ سے بدلہ لینے کے لیے تڑپ رہی تھی، بے چین ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے لیے وہاں ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔ بچن سنگھ سے کیے قول و اقرار اور سر پر لی ہوئی سدا کور کی ذمہ داری، سب کچھ اُسے بھول گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب سدا کور سو گئی تو سندری دبے پاؤں اٹھی اور کھڑکی میں رکھی دیا سلائی کی ڈبیا لے کر گھر سے باہر نکل گئی۔

اس وقت رات کے بارہ بجے کا وقت تھا۔ اندھیری رات نے ہر طرف کالا پردہ پھیلا دیا تھا۔

جس کنوئیں پر بنے کمرے میں پالا سنگھ اپنی چنڈال چوکڑی کے ساتھ رہا کرتا تھا وہ جگہ سُندری کی دیکھی بھالی ہوئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ وہاں پہنچ گئی۔ کمرے کے پیچھے جہاں سے دیوار میں ایک بڑے سوراخ کے راستے اندر کا سب حال دیکھا جا سکتا تھا وہاں وہ چھپ کر بیٹھ گئی۔ اندر کڑوے تیل کا دیا جل رہا تھا جس کی روشنی میں سُندری نے دیکھا۔ پالا سنگھ اور اس کے دونوں ساتھی شراب پیتے ہوئے گپیں ہانک رہے تھے ویر سنگھ کہہ رہا تھا " سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی بچ گئی۔" پالا سنگھ بولا " لیکن تم نے سچ مچ اُسے جیوا سنگھ کے گھر جاتے دیکھا تھا کہ ایسے ہی نشے میں بڑبڑا رہے ہو۔"

"قسم گورو کی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"تو اب بچ کر نہیں جاسکتی۔ کل ہی قابو کرلو۔ یہ بھی روز روز کا جھنجھٹ ختم ہو۔"

"لیکن بھائی رکھے گا کہاں اسے؟"

"پاگل نہ بنو تو رکھنے کی جگہیں کم ہیں کیا؟ کل اسے اڑا کر لاؤ تو۔"

"لیکن بھاؤ کچہری میں اس نے بیان دیا تھا کہ میں رنڈی کی بیٹی ہوں۔"

"او چھوڑ پرے بیکار کی گلاں۔ سکھوں کو کیا لگے اس طرح کے وہموں سے آپ تو گورو کا نام لے کر کل رات کو اُسے لانے کی کوشش کرو۔"

"میری رائے ہے جیوا سنگھ کے گھر کے پیچھے جہاں دیوار کچی ہے اس کو توڑ..."

"بس بس ٹھیک ہے۔"

سندری کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ باتیں اور تیاریاں کس سلسلے میں ہو رہی ہیں۔

تھوڑی دیر تک وہ اسی طرح کے صلاح مشورے کرتے رہے اور آخر پیتے پیتے وہیں پڑ کر سو گئے۔

اتنی دیر میں سندری نے اِدھر اُدھر سے سوکھی گھاس اکٹھی کر کے دو تین گٹھر بنا لیے تھے۔

آخر اس نے اپنا کام شروع کر دیا۔

... ٭ ...

تھوڑی ہی دیر بعد یہ کچا کوٹھا تیزی سے جل رہا تھا جس کے شعلوں سے دور دور تک روشنی پھیل رہی تھی اور سارا گاؤں تیزی سے بھاگتا ہوا آرہا تھا۔

پاس ہی کھڑی سندری پاگلوں کی طرح ہنس رہی تھی۔ آج اُس کے چہرے پر اس طرح کی بھیانک ہنسی تھی جس سے شاید موت بھی ڈر کر کانپ اُٹھے۔

سارے گاؤں میں شور مچ گیا۔ لوگ فوراً آ پہنچے لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے ہی چھت کی ساری لکڑی دیواروں کو چھوڑ کر نیچے آرہی۔

"ابھی یہیں تھی۔ ابھی یہیں تھی" کہتے ہوئے کچھ لوگوں نے آگ بجھانی شروع کی اور باقی ملزمہ کو پکڑنے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگ نکلے۔

کسی نے بتایا کہ ایک مٹیار کو دریا کی طرف بھاگتے ہوئے اس نے دیکھا تھا۔ سب لوگ اُدھر کی طرف دوڑے۔ جنگل کی جھاڑیوں میں جھانکتے ہوئے وہ دور تک نکل گئے۔

اتنے میں آواز آئی۔ "وہ دیکھو۔ وہ جا رہی ہے۔ دریا کے پُل کی طرف!"

لوگ پُل کی طرف بھاگے۔ لیکن اندھیرے میں کچھ پتہ نہ چل سکا۔ تھوڑی دیر بعد پُل پر سے آواز آئی۔

"میں ہوں خونی، آؤ مجھے پکڑ لو۔ جس کی ہمت ہے۔ دو جانوں کے بدلے میں میں تین جانیں لے کر جارہی ہوں۔ میں نے کسی بے گناہ کی بد دعائیں نہیں لیں۔ ان کو مارا ہے جنھوں نے میرے سر کا تاج اتار کر پاؤں سے روند ڈالا تھا اور میرے بوڑھے باپ کا لہو پیا تھا۔ یاد رکھو ظالمو۔ ایک ستی کے جیتے جی اُسے بیوہ بنانے والے اس کے غصّے سے نہیں بچ سکتے۔ سارے گاؤں سے تو وا ہگورو ہی بدلہ لے گا جنھوں نے جھوٹی گواہیاں دے کر میرے مالک کی جان لی اور میرے بوڑھے باپ کے قاتلوں کو بچایا۔ ابھی تو اصل قاتلوں کو ہی ان کے کیے کی سزا ملی ہے۔ آؤ مجھے پکڑ لو۔"

لوگوں نے دیکھا کہ سامنے ہی دریا کے پُل پر کھڑی سُندری ہاتھ ہلا ہلا کر اور گلا پھاڑ کر یہ سب کچھ کہہ رہی تھی۔

اس وقت پولیس بھی موقعے پر پہنچ گئی۔ آگے آگے پولیس کے سپاہی اور پیچھے پیچھے گاؤں کے لوگ پُل کی طرف بڑھے۔ انھیں بڑی حیرانی ہوئی جب انھوں نے دیکھا کہ سندری اسی طرح کھڑی ہے۔ وہاں سے ذرا بھی نہیں ہلی۔

ساری بھیڑ پُل پر جا پہنچی۔ لیکن سندری اب بھی اپنی جگہ پر کھڑی لوگوں کو پھٹکار رہی تھی۔ جیسے ہی پولیس کے سپاہی اسے پکڑنے کے لیے اُس کی طرف بڑھے اس نے دھڑام سے دریا میں چھلانگ لگادی۔ سب لوگ ہاتھ ملتے رہ گئے۔

پُل کے اوپر سے ہی لوگوں نے دیکھا کہ خاموش بہہ رہے دریا میں اس کے گرنے سے پانی نے ایک زوردار اُچھال ماری اور جس جگہ سُندری گری تھی وہاں پانی کی سفید لہریں اوپر کو ابھریں اور پھر وہیں خاموش ہوگئیں۔ لالٹینیں نیچے لٹکا لٹکا کر اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر لوگوں نے کافی دیکھنے کی کوشش کی لیکن سُندری کا کوئی نشان تک نہ ملا۔ وہ ہمیشہ کے لیے ان کی آنکھوں کے سامنے سے غائب ہوگئی تھی!

سُندری کو چاہے سب نے چھلانگ مارتے دیکھا تھا لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ مرگئی یا کسی کنارے لگ کر بچ گئی۔

کچھ دنوں بعد سُندری کا حلیہ دے کر پولیس والوں نے اشتہار شائع کیا اور اسے پکڑنے یا اس کا پتہ دینے کے لیے انعام مقرر کیا گیا۔ پولیس اور اردگرد کے گاؤں کے لوگ سرگرمی سے اس کی تلاش کرنے لگے۔

ادھورے باب کا باقی حصّہ

کتاب کے شروع میں قارئین پڑھ آئے ہیں کہ رات کے وقت گپتیشور نام کا ایک مسافر بابو شام داس کے کمرے میں بیٹھا اُسے ایک ناول کا مسودہ پڑھ کر سُنا رہا تھا۔ ناول کافی بڑا تھا لیکن بابو شام داس ایک ہی بار میں سارا ناول سُننا چاہتا تھا۔

مسافر سناتا گیا اور شام داس سنتا گیا۔ اس سننے سنانے میں رات گزر گئی۔

اس وقت جب مسافر نے لگ بھگ سارا ناول ختم کر لیا۔ شاید ایک آدھ باب ہی باقی تھا تو صبح کے سورج کی کرنیں کمرے میں داخل ہو چکی تھیں۔

مسافر باب کے آخری اوراق کو ترتیب دینے لگا اور ان کو ٹھیک کرنے میں اسے کئی منٹ لگ گئے، کیونکہ یہ باب بے تکے سے کاغذوں پر لکھا ہوا تھا۔ کچھ اسکول کی کاپیوں کے ایک طرف کے خالی حصوں اور باقی اخباری صفحات کے حاشیوں وغیرہ پر۔

صفحے ترتیب سے رکھ لینے کے بعد مسافر انھیں پڑھنے لگا تو اس کی نظر شام داس کے چہرے پر پڑی شام داس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ساون برس رہا تھا۔ اُس کا رنگ مُردے سا پیلا پڑ گیا تھا اور اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

"ہیں!" مسافر نے ہاتھ والے کاغذ تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ رو رہے ہیں شرماں جی۔ یہ کوئی ایسی زبردست ٹریجڈی تو نہیں تھی؟"

شام داس کے کانوں میں جیسے یہ آواز پڑی ہی نہیں۔ اس کے آنسوؤں کا سیلاب ذرا بھی نہ رکا۔

"اچھا۔ یہ آخر کا باب رہنے دیتا ہوں۔ اور پھر یہ ہے بھی ابھی ادھورا۔" کہتے ہوئے مسافر تپائی پر رکھے پلندے کو سمیٹنے لگا۔

"نہیں نہیں۔" آنکھیں پونچھ کر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے شام داس بولا "سنائیے اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔" اور اس نے مسافر کا ہاتھ — جو کاغذ سمیٹ رہا تھا پکڑ کر کہا۔ "اُف کتنی دردناک کہانی ہے یہ!"

مسافر نے آخری باب کے میلے سے کاغذ اٹھائے اور پڑھنا شروع کیا۔

(۳۵)

(اوپر کے واقعے کے دو سال بعد)

گپتیشور کے صرف نام سے ہی لوگ واقف تھے۔ اُسے شکل سے کوئی نہیں پہچانتا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں، صرف دو سالوں میں ہی، وہ بہت مشہور ہو گیا تھا۔

ناشر اور ایڈیٹر خاص طور سے اُسے دیکھنا چاہتے تھے لیکن کوشش کرنے کے باوجود وہ اُسے ڈھونڈ نہیں سکے تھے۔ گپتیشور کا ہر چھپنے والا مضمون انھیں ڈاک کے ذریعے ہی ملتا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہوتا تھا کہ اس کا معاوضہ جو بھی مناسب ہو فلاں پتے پر بھیج دیا جائے۔

اس لیے جتنا کسی کا دل چاہتا تھا، اس کا معاوضہ مسماۃ سداکور بیوہ سردار جیوا سنگھ، موضع دیوان پور، ضلع امرتسر کے پتے پر بھیج دیتا تھا۔ کئی بار لوگوں نے اس پتے پر چٹھیاں لکھ لکھ کر گپتیشو کی تلاش کی لیکن وہاں سارے گاؤں میں گپتیشور نام کے کسی آدمی کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ جس عورت کے پاس روپے جاتے تھے اس سے بھی کوئی تسلی بخش جواب انھیں نہیں ملتا تھا، جس سے گپتیشور کا پتہ چل سکے۔

گپتیشور امرتسر میں بھگتاں والے دروازے کے اندر ایک آٹھ آنے مہینہ کرائے کی کوٹھری میں رہتا تھا کسی سے بات چیت کرتے کسی نے اُسے نہیں دیکھا تھا۔ دن کو ہر وقت کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے وہ لکھتا رہتا اور رات کو ساری ساری رات شہر سے باہر باغوں اور ویرانوں میں گھومتا رہتا تھا۔ کئی بار باغوں کے مالیوں نے اُسے کچھ گاتے یا روتے بھی سُنا تھا۔ کئی اُسے 'مست' کے نام سے پکارتے تھے۔

کبھی کبھی وہ ایسی جگہوں پر پھرتا رہتا تھا جہاں آدمیوں کی زیادہ بھیڑ بھاڑ ہو۔ کئی بار وہ راستہ چلتے لوگوں کو بُلا کر کئی طرح کے بے سر پیر کے سوال کرنے لگ جاتا تھا۔ زیادہ تر لوگ اس کی بک بک کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے راستے پر چل دیتے تھے اور کئی اس کے پاس کھڑے بھی ہو جاتے تھے۔

اس کی کوٹھری میں آدمی کی طرح زندگی گزارنے کے لیے کچھ بھی سامان نہیں تھا۔ ایک کمرے میں سونے کے لیے گھاس پھوس کے اوپر ایک ٹاٹ کا ٹکڑا بچھا ہوا تھا اور دوسرے کونے میں تین اینٹیں جوڑ کر ایک چولھا بنایا ہوا تھا، جس کے پاس ہی ایک چھوٹا سا توا، ایک مٹی کی آٹا گوندھنے والی پرات، اور کچھ جنگلی لکڑیوں کا ایندھن پڑا ہوا تھا۔ جہاں اس کے سونے کی جگہ تھی وہاں ایک اینٹ کھڑی کر کے اس پر ایک مٹی کا دیا رکھا ہوا تھا۔ اسی جگہ بیٹھ کر گھٹنوں پر ایک لکڑی کی تختی رکھ کر وہ لکھا کرتا تھا۔

اس کی کوٹھری کے آس پاس تانگے مرمت کرنے والے کئی مسلمان لوہار، ایک دو بیل گاڑی بنانے والے

ترکھان اور دو حلوائیوں کی دکانیں تھیں۔

آج صبح سے ہی وہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر لکھتا رہا تھا۔ اس نے گھٹنوں پر ایک پھٹا پرانا کمبل لپیٹا ہوا تھا معلوم ہوتا تھا وہ رات کو رضائی کا کام بھی اسی سے لیتا تھا۔ اس کے دائیں طرف بہت سے ردی کاغذ پڑے تھے جن کے ایک طرف سکول کے بچوں کی لکھائی معلوم ہوتی تھی اور جس کا دوسرا رُخ بھی تیز پھیلی ہوئی سیاہی سے نیلا ہو رہا تھا۔

شام ہو چکی تھی۔ سارا دن لکھتے رہنے کے بعد وہ قلم ہاتھ سے رکھ کر لکھے ہوئے اوراق اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے میں آ کر اس نے ایک دو انگڑائیاں لیں۔ کمر سیدھی کی اور ہاتھ کی انگلیوں کو گھما کر چٹکی بجانے لگا۔ ورق گننے کے بعد اُس نے آج کا لکھا ہوا سارا مضمون ایک سرسری نظر سے پڑھا اور ایک بار ہی اس کے منہ سے نکلا:۔

"یہ باب۔ بس یہی آخری باب ہو گا اور اس کا بھی بہت تھوڑا سا حصہ باقی ہے۔ میں اسے آج ہی ختم کر لوں گا اور اس کے بعد میں ہمیشہ کے لیے اس دکھوں بھری خفیہ زندگی سے نجات حاصل کر لوں گا۔ لیکن آہ! میرا دوسرا کام ہزار کوشش کے باوجود ختم نہیں ہو سکا۔ خیر نہیں ہوا تو میرا کیا قصور؟ اور وہ ہونا بھی ناممکن ہے جب کہ میں نے ایسے اندھیرے میں ہی تلواریں چلائی ہیں۔ اچھا! قسمت میں اس کام سے سرخرو ہونا نہیں لکھا تھا۔ بس اس ناممکن کام کے لیے میں اور وقت ضایع نہیں کر سکتا۔ کافی پریشان ہوا ہوں۔"

اس کے فوراً بعد ہی کچھ سوچ کر وہ گہری فکر میں غرق ہو گیا جیسے گاڑی چلنے کے بعد مسافر کو یاد آئے کہ روپوں والا بٹوا اس کے پاس نہیں ہے۔ کاغذوں کے نہ ہونے سے اس کا یہی حال ہوا۔

اس نے ہاتھ والے کاغذوں کی پوٹلی بنا کر اسی کونے میں جہاں پہلے سے لکھے ہوئے بہت سے کاغذ جمع تھے، رکھ دیئے اور خود سر کے نیچے بازو رکھ کر کمبل اوڑھ کے لیٹ گیا۔

شہر میں پیسہ ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ پیسے کے بغیر یہاں سانس لینی بھی مشکل ہوتی ہے اور اس کے پاس پیسہ نہیں تھا۔ وہ صبح اٹھتے ہی گھر سے نکل پڑا۔ جیسے نُچے ہوئے پروں والا پرندہ چُگنے کی تلاش میں۔

اس کے علاوہ دوسری مصیبت یہ کہ سردی کا موسم اور صبح کا وقت۔ غریب کو اس زبردست سردی میں بچانے والا ایک پھٹا ہوا لمبا بے ناپ کا کوٹ تھا جس کے بٹن ٹوٹے ہوئے اور کاج پھٹے ہوئے تھے۔ ٹھنڈ سے بچنے کے لیے اس نے دونوں سروں میں چھید بنا کر دھاگے ڈال کر گانٹھیں دے لی تھیں۔ اس کے تن پر ایک گھٹنوں تک لمبا کُچھا تھا۔ گھٹنوں سے نیچے اس کی ٹانگیں ننگی تھیں، جو مٹی گرد اور تیل سے اس قدر گندی ہو رہی تھیں جیسے ریلوے شیڈ میں کوئلے کا کام کرنے والے مزدوروں کی ہوتی ہیں۔ یہی حال اس کے منہ اور ہاتھوں

کا تھا لیکن اس کے گورے رنگ پر یہ میل زیادہ بری نہیں لگتی تھی۔ پاؤں سے وہ ننگا تھا جن کی گھائیاں پھٹ رہی تھیں۔

وہ سردی سے کانپتا ہوا کاغذوں کی تلاش میں کئی جگہ پھرا لیکن سب بے کار۔ اُسے اپنے اور اپنی قسمت پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ جب وہ مایوس ہو کر گھر کی طرف لوٹا تو اپنے اندر کی آگ سے اندر ہی اندر جل رہا تھا۔ کوٹھری کے پاس آ کر ایک بار اس کا دل چاہا کہ اس ادھوری کتاب کو چولھے کے حوالے کر کے ساتھ ہی اپنی دکھ بھری زندگی کا خاتمہ کرے۔ وہ اس کام کے لیے تیار بھی ہو گیا۔ یہاں تک کہ سارے کاغذ اکٹھے کر کے اس نے چولھے میں رکھ دیے لیکن جب اس نے ٹاٹ کے نیچے سے دیا سلائی کی ڈبیا اٹھائی تو وہ خالی تھی۔ اس سے اُسے اور بھی غصہ آیا۔ اب وہ آگ یا دیا سلائی کی تلاش میں پھر گھر سے نکلا۔

اس کے ساتھ ہی اس کے خیالوں نے بدلنا شروع کیا۔ وہ کتنی ہی دیر دیوار سے کمر لگائے دروازے کے سامنے کھڑا سوچتا رہا۔ پھر اندر داخل ہوا اور ویسے ہی سارے کاغذ چولھے میں سے نکال کر واپس اسی کونے میں رکھ دیے جہاں سے اس نے اٹھائے تھے اور خود ایک مرتبہ پھر قسمت آزمائی کے لیے گھر سے نکلا۔

راستے میں اسے ایک استاد جواری کی یاد آئی۔ اس نے اس کے پاس جا کر ایک روپیہ ادھار مانگا۔ اسے روپیہ مل گیا لیکن دو روپے لوٹانے کا اقرار کرنے کے بعد۔۔۔

وہ سیدھا گھر آیا۔ سارے کاغذ سمیٹ کر ان کا پلندہ بازو کے نیچے دبایا اور ریلوے اسٹیشن پر جا پہنچا۔ اس کے کچھ گھنٹے بعد وہ لاہور کے بازاروں میں پھر رہا تھا۔ ناامیدی کا جال اس کے چاروں طرف بُنا ہوا تھا۔ اس کا مسودہ کسی نے بھی نہ خریدا۔ ایک تو ردی کاغذوں کا ڈھیر دیکھ دیکھ کر اور دوسرے اس کا اپنا ڈراؤنا حلیہ دیکھ کر۔ ایک دو ناشروں نے اس کے ناول کی جو قیمت دینی چاہی وہ لے اور دل شکستہ کرنے والی تھی۔ دس پندرہ روپے۔ کاش کہ وہ لوگوں کو بتا دیتا کہ وہ گیتیشور ہے تو لوگ اس کے پاؤں کی خاک کو ماتھے سے لگاتے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ مفرور قاتل کی طرح وہ ہر ممکن طور پر خود کو چھپائے رکھنا چاہتا تھا۔

واپس لوٹتے وقت اس کے پاس ایک چونی باقی تھی اور وہ بھی کھوٹی۔ اس لیے وہ بغیر ٹکٹ لیے ہی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ وہاں گاڑی کے تختے پر اخبار کے کچھ کاغذ پڑے تھے۔ پاس بیٹھے ایک بابو سے پنسل مانگ کر وہ اخبار کے حاشیوں پر ہی اپنے ادھورے باب کا آخری حصہ لکھنے لگا۔ لیکن وہ اب بھی ادھورا ہی تھا۔۔

شام داس کی آنکھوں سے اب تک آنسو جاری تھے۔ اس نے غور سے دیکھا۔ گیتیشور اس وقت جن کاغذوں کو پڑھ رہا تھا وہ پچ مچ کسی اخبار کے ردی کاغذ تھے اور ان کے حاشیے پنسل کی تحریر سے پُر تھے۔ کہیں بھی کوئی جگہ خالی نہیں تھی۔ اس وقت مسافر کے ہاتھ میں سب سے آخری ورق تھا۔ وہی اخباری کاغذ۔ اس کے

حاشیے سے اوپر کی سطریں پڑھنے کے بعد مسافر رک گیا اور اُسے تپائی پر رکھ دیا۔ یہ باب ابھی ادھورا تھا۔

کتاب ختم کرنے کے بعد مُسافر نے ایک بار پھر بابو شام داس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کا پیلا پن بڑھتا جا رہا تھا۔ گپتیشور ہمدردی بھرے لہجے میں بولا "میرا خیال ہے جاگتے رہنے کی وجہ سے آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے۔ اب آپ آرام کریجئے ذرا۔"

"نہیں نہیں۔ آپ پڑھتے جائیے۔" بابو شام داس نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا

"بس۔" گپتیشور نے جواب دیا۔ "یہ ختم ہو چکا ہے۔ اس کا آخری باب ابھی ادھورا ہے جیسے ۔ ۔ ۔"

"ختم ہو گیا؟" شام داس نے دل کے کسی پوشیدہ درد کو چھپاتے ہوئے کہا "اور کتنا باقی ہے ابھی؟"

"بہت تھوڑا۔" کہہ کر گپتیشور نے پھر اس کے پریشان چہرے کی طرف دیکھا۔

بابو نے پوچھا "لیکن گپتیشور صاحب! معاف کرنا۔ ایک بات میں اور پوچھتا ہوں۔ اس ناول کا پلاٹ آپ کے دماغ کی اُپج ہے یا کچھ۔۔۔"

بیچ میں ہی گپتیشور بول پڑا۔ "جی نہیں۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو سچّا اور حقیقی ہے۔ اور میں نے اسے کسی سے سُنا تھا۔ میں نے تو صرف اتنا کیا ہے کہ اسے ناول کی شکل میں پیش کر دیا ہے۔ ناول کے لیے اکثر اس طرح کے سچے پلاٹ بڑے کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ یہ ناول میں زندگی بھر دیتے ہیں۔"

بابو نے ماتھے کا پسینہ رومال سے پونچھتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ حال آپ نے کس سے سُنا تھا؟"

"جی خود سُندری کی زبانی۔"

"اچھا۔ یہ سب کچھ سُندری نے خود آپ کو سنایا تھا؟ وہ آپ کو کہاں ملی تھی، اور کب ملی تھی؟" کہتے ہوئے شام داس کے پسینے چھوٹ گئے۔

"جی ایک گاؤں میں۔"

"اور آپ نے اس کی کہانی کو ناول کے روپ میں ڈھال دیا۔"

"ہاں، مجھے یہ موضوع بہت اچھا لگا تھا۔"

بابو کے چہرے پر غصّہ جھلکنے لگا۔ اپنے احساسات کو چھپاتے ہوئے وہ بولا۔ "معاف کیجیے۔ آپ ایسے بڑے پائے کے ادیبوں کو بھلا اس کی کیا ضرورت تھی، جب کہ آپ تصوّر سے ہی اچھے سے اچھا پلاٹ بنا سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ لیکن اس حقیقی پلاٹ سے مجھے زیادہ کامیابی کی امید تھی۔"

بو معاف کرنا۔ میری عادت بہت بری ہے کہ منہ پر سچ کہہ دیا کرتا ہوں ۔ جہاں آپ کی ادبی قابلیت نے مجھے خرید لیا ہے وہاں آپ کی یہ بات ذرا ہلکی سی لگتی ہے۔ آپ نے تو وہ بات کی ہے کہ جس کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ ایک بار ایک ماہر پیراک پانی میں تیرتا ہوا اپنے کرتب دکھا رہا تھا۔ اپنی پیراکی کے کمال دکھانے کے لیے وہ حد سے زیادہ زور لگا کر جب اُلٹا سیدھا ہو کر تیرنے لگا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سانس ٹوٹ جانے کی وجہ سے وہ ڈوب ہی گیا اور اس کی موت ہو گئی۔ پیٹ میں پانی بھر جانے کی وجہ سے جب کافی دیر تک وہ پانی کی تہہ کے نیچے ہی ڈوبا رہا تو تماش بین اُسے اس کا کمال سمجھ کر خوشی سے تالیاں بجاتے ہوئے کہہ رہے تھے "بھئی کمال کا تیراک ہے اتنی لمبی ڈبکی؟" جب اس کی لاش پھول کر پانی کی سطح پر تیرنے لگی تو لوگ اور خوش ہوئے اور فخر سے ایک دوسرے سے کہنے لگے "دیکھو بھئی۔ ہو بہو مُردے کی طرح تیر رہا ہے۔ جیسے سچ مچ ہی مر گیا ہو!" اسی طرح وہ بیچاری بدنصیب لڑکی جس کی زندگی کا ہر لمحہ تڑپا دینے والا تھا، اس کی زندگی سے آپ کو یہ ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہیئے تھا۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ بکرا روئے جان کو اور قصائی روئے اپنے گوشت کو!"

"اس لیے اے میرے مہربان گپتیشور صاحب! مجھے معاف کرنا۔ یہ بات آپ کے فن کو دھبہ لگانے والی ہے اور اس سے آپ کی سنگ دلی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ آپ کو چاہیئے تھا کہ اس بدنصیب لڑکی کی کچھ مدد کرتے نہ کہ اُلٹا اس کے گرم آنسوؤں اور سرد آہوں کو بیچ کر اپنا ہی اُلو سیدھا کرنے کی فکر میں ہیں۔"

آنکھیں نیچی کیے گپتیشور بولا۔ "واقعی یہ میری غلطی تھی۔ لیکن میرے دل نے مجھے مجبور کیا اس لیے مجھے ایسا کرنا پڑا۔"

بابو بولا "پھر کوئی ایسی بُری بات نہیں۔ یہ تو صرف پرماتما ہی ہے جس سے کوئی غلطی نہیں ہوتی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے سُندری نے مرنے سے تھوڑی ہی دیر پہلے آپ کو یہ حال سُنایا ہوگا۔"

"جی ہاں۔ ڈوبنے سے صرف ایک دو دن پہلے اس نے اپنی ساری رام کہانی مجھے سنائی تھی۔"

"اور پھر آپ کو اس کے دریا میں ڈوب مرنے کا حال کیسے پتہ چلا؟"

"اُن دنوں میں اسی گاؤں میں ٹھہرا ہوا تھا۔"

شام داس کے جسم سے جیسے کوئی اس کے گوشت کو سنسی سے اکھاڑ رہا تھا۔ اس کی نس نس، انگ انگ میں درد ہو رہا تھا۔ وہ ذرا ٹھہر کر بولا "آفرین! زندہ باد! گپتیشور صاحب! آپ نے کمال کر دکھایا۔ ہاں تو یہ جو باقی صفحے لکھنا باقی ہیں؟ میرا خیال ہے ان صفحات میں آپ ادیب کی حیثیت سے اپنی جان پہچان کروانا چاہتے ہیں۔ کیوں؟ لیکن یہ صفحے آج ضرور لکھ لینا۔ ایک عرض اور بھی ہے جو امید ہے نامنظور کر کے میرا دل نہیں توڑیں گے اور وہ یہ کہ اپنا قیام آج سے اس خادم کے پاس ہی رکھیے تاکہ آپ کی نیک صحبت میں اس

گناہ گار کی باقی زندگی بھی سنور جائے۔ اور پھر اس بدنصیب کے متعلق اور بھی جو کچھ آپ جانتے ہوں مجھے بتائیے۔"

گپتیشور نے خوشی سے جواب دیا۔" یہ میرے لیے خوش قسمتی کی بات ہوتی اگر میں اسے پورا کر سکتا۔"

"کیوں۔ اس کا مطلب ؟"

" مطلب یہ کہ اس ناول کے ادھورے باب کی طرح میری زندگی کے ناول کا بھی آخری باب ہی باقی ہے۔"

" میں آپ کے کہنے کا مطلب نہیں سمجھا — آپ — آپ ؟ "

" جی ہاں۔ میرے جینے کے لیے اب نہ کوئی جگہ ہے اور نہ وقت۔ میں۔ میں۔ ایک..." کہتا ہوا گپتیشور پھر رُک گیا اور اس کے بعد شام داس کے دوبارہ پوچھنے پر بھی اور کچھ نہ بتا سکا۔

بڑی دیر خاموش رہ کر گپتیشور بولا :

" میں آپ کو ایک تکلیف اور دینا چاہتا ہوں۔"

" اسے میں اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔ فرمائیے۔ میرے لیے کیا حکم ہے ؟"

کچھ دیر چُپ رہ کر گپتیشور بولا " آپ مجھے انسانی شکل میں مجسم فرشتہ نظر آتے ہیں۔ میرے دل میں آپ کے لیے کتنی عزت ہے، بیان نہیں کر سکتا۔ میں آپ کو ایک بہت بڑی زحمت دینا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے ایسے نیک کاموں کے لیے ہی قدرت نے آپ جیسے انسانوں کو دنیا میں بھیجا ہے۔ کیا آپ میرا ایک کام کریں گے ؟ "

اس کے جملے سُن کر بابو شام داس کی نظریں زمین میں گڑ گئیں۔ وہ بولا " ساری عمر کے لیے مجھے اپنا غلام سمجھیے۔ جس خدمت کے بھی قابل مجھے سمجھتے ہیں اس کے لیے بغیر مجھ سے پوچھے ہی اپنے حکم کی تعمیل کرا سکتے ہیں۔ لیکن پرماتما کے لیے میرے لیے یہ تعریفی جملے نہ استعمال کیجیے۔ میں ایک حقیر اور گرے ہوئے ضمیر والا آدمی ہوں۔ اپنی زندگی میں ایسے ایسے گناہ میں نے کیے ہیں.... سب سے بڑا گناہ جو مجھے کبھی نہیں بھولے گا، اگر کبھی آپ سُن لیں تو آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ اسی لیے کہتا ہوں کہ میں اس تعریف کے قابل نہیں ہوں۔ آپ ہی اس ستائش کے حقدار ہیں۔"

ممنون ہو کر گپتیشور کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔ وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے سر جھکا کر بولا۔" آپ مجھے بہت اونچا بنا رہے ہیں۔ میں تو اس کا ہزارواں حصہ خوبی بھی اپنے آپ میں نہیں پاتا۔ آپ کی اس شائستگی، شرافت اور خلوص نے میرے دل پر بے حد اثر ڈالا ہے۔"

" میرے لیے آپ پرماتما کا روپ ہیں۔"

گپتیشور نے آنکھیں نیچی کر لیں۔

ALLAHABAD
.. JUL 1975

بابو بولا " ہاں جلدی حکم کیجیے ۔"

گپتیشور بولا " ایک تو یہ کہ کسی طرح میرا وہ رومال منگوا دیجیے ، جو لاہور میں میں جھیورکے تندور پر دے آیا تھا۔ لاہور ریلوے سٹیشن کے عین سامنے اس کی دوکان ہے ۔ دوسرے اگر اس ناول کے چھپوانے کا کوئی انتظام ہو سکے تو آپ ہی کیجیے اور اس کی جو آمدن ہو وہ اسی پتے پر بھیج دیجیے گا جس کا میں نے ناول کے آخری باب میں ذکر کیا ہے ۔

بابو شام داس کا جسم اس وقت گوشت کا نہیں جیسے لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں اس وقت گپتیشور کی آنکھوں میں گڑی ہوئی تھیں۔

جیسے کوئی راستہ بھولنے کے بعد پھر ٹھیک راستے کی طرف لوٹتا ہے ۔ گپتیشور کی باتوں کے رُخ کو شام داس بدلتے ہوئے بولا " معاف کیجیے گا ، میرا دھیان دوسری طرف چلا گیا تھا۔ ہاں کیا فرما رہے تھے آپ ؟"

مسافر نے اپنی دونوں مانگوں کو دہرایا۔

شام داس اپنے اندر مچل رہے بھونچال کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ " سر آنکھوں پر۔ مجھے آپ کے ان دونوں حکموں کی تعمیل سے بڑی خوشی ہوگی۔ وہ کیا نام پڑھا تھا آپ نے ۔ مائی سدا کور ؟ وہ آپ کی کوئی رشتہ دار ہے ؟

" جی ہاں "

" اور آپ کا دولت خانہ ؟"

" دولت خانہ تو میرا اس وقت آپ کے پیروں میں ہے ۔ اس لیے میں اسے غریب خانہ نہیں کہہ سکتا۔"

" یہ تو آپ کی ذرّہ نوازی ہے ۔ لیکن دراصل آپ کہاں کے رہنے والے ہیں ؟"

گپتیشور نے کاغذ اکٹھے کرتے ہوئے بات ٹال دی " میرا خیال ہے آپ کافی تھک گئے ہیں۔ اس لیے تھوڑا سا آرام کر لیجیے ۔ آپ کو کام پر بھی جانا ہوگا ۔"

" نہیں ، آج تو اتوار ہے ، خیر یہ باتیں پھر سہی ۔" ذرا سا ٹھہر کر بابو نے پھر پوچھا " ہاں وہ رومال میں خود ہی جا کر لے آتا ہوں۔ تندور والے کا پتہ ٹھکانا تو آپ نے بتا ہی دیا ہے ۔"

گپتیشور نے اس ڈھابے کا پتہ دہراتے ہوئے کہا " بابو جی آپ یہاں کتنے عرصے سے رہتے ہیں ؟"

" سترہ اٹھارہ سال ہو گئے ہیں ۔"

" تب تو اس شہر میں آپ کا اچھا رسوخ ہوگا ۔"

" جی ہاں ۔ آپ کی مہربانی سے مجھے کافی لوگ جانتے ہیں ۔"

گپتیشور نے امید بھرے لہجے میں کہا "تو کیا آپ ایک آدمی کو تلاش کرنے میں میری مدد کر سکتے ہیں ؟ میں اُسے دو ڈھائی سال سے ڈھونڈ رہا ہوں لیکن آج تک اس کا کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ اور آپ یہ سن کر میری عقل پر ہنسیں گے کہ میں نے اُس کی شکل بھی آج تک نہیں دیکھی۔ نہ ہی اس کے حلیے کا کچھ پتہ ہے۔ اگر شکل ہی پہچانتا ہوتا تو شاید اب تک تلاش کر ہی لیتا۔"

بابو نے کہا "آپ اس کے بارے میں جو کچھ جانتے ہوں مجھے بتا دیجیے۔ میرا خیال ہے کہیں نہ کہیں سے اس کی خبر مل ہی جائے گی۔ ریلوے کے کام میں تو نت نئے آدمی سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ دنیا کا کونسا آدمی ہے جو ریلوے ملازموں کی آنکھوں کے سامنے سے نہ گزرتا ہو۔ آپ اس کے بارے میں جو کچھ جانتے ہوں جلدی بتا دیجیے۔"

گپتیشور نے کہا "میں صرف اس کا نام ہی جانتا ہوں اور کچھ نہیں۔"

"اس کا نام کیا ہے ؟"

"نام اس کا تارا چند ہے۔۔۔۔ ہیں یہ کیا ؟ معلوم ہوتا ہے رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے۔ میرا خیال ہے ان باتوں کو ابھی یہیں رہنے دیجیے اور آپ لاہور بھی آج نہ جائیے۔ رومال کے سلسلے میں پھر کبھی دیکھا جائے گا۔ اب تھوڑا آرام کر لیجیے۔ آپ کا رنگ ایک دم پیلا پڑ گیا ہے۔"

رومال سے پسینہ پونچھ کر اور کھانس کر آواز ٹھیک کرتے ہوئے بابو پھر بولا "نہیں آپ فکر نہ کیجیے مجھے کئی بار اس قسم کی گھبراہٹ ہو جاتی ہے لیکن یہ ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔ ہاں، وہ تارا چند پہلے کہاں رہتا تھا ؟"

"پہلے وہ سیالکوٹ میں رہتا تھا" بابو کے چہرے کی طرف دیکھ کر "شریمان جی۔ آپ کی آواز تھرتھرا رہی ہے۔ اٹھ کر چارپائی پر لیٹ جائیے۔"

بابو شام داس کی گھبراہٹ زیادہ سے زیادہ تر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ رومال سے اپنے آپ کو ہوا دیتے ہوئے بولا "وہ۔۔۔۔ اُسے تو میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں" شام داس کا چہرہ اس وقت مُردے کی طرح ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ مُڑتے جا رہے تھے اور اس کی سانس اس طرح چل رہی تھی جیسے وہ دمے کا مریض ہو۔

"جانتے ہیں بہت اچھی طرح !"

گپتیشور نے یہ الفاظ اس طرح آپے سے باہر ہو کر کہے جیسے کسی کو کوئی گمشدہ خزانہ مل جائے۔

وہ اپنی خوشی کو روک نہ پاتے ہوئے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور جلدی سے بولا "مہربانی کر کے جلدی بتائیے۔ وہ کہاں رہتا ہے ؟ کیا آپ میری اُس سے ملاقات کرا سکتے ہیں ؟"

بابو نے کہا "ایک نہیں سو بار۔ اس سے میری اچھی جان پہچان ہے۔" پاگلوں کی طرح آنکھیں پھیلا کر گپتیشور کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بابو شام داس نے کہا۔

گپتیشور اپنی بڑھتی خوشی اور دل کی ہلچل کو روکتے ہوئے جلدی سے پوچھنے لگا "وہ کہاں رہتا ہے، کیا کام کرتا ہے ؟"

"لاہور میں رہتا ہے اور ایک سرکاری دفتر میں ملازم ہے۔"

"تو پھر مہربانی سے آج ہی میری اس سے مُلاقات کرا دیجیے۔ کس وقت کرائیں گے ؟"

"میرا خیال ہے میں شام کو اُسے ساتھ ہی لیتا آؤں گا۔"

"او میرے ہمدرد اور مہربان دوست ! ہزار بار شکریہ، لاکھ کروڑ بار شکریہ۔ آپ نے مجھے غلام بنا لیا ہے۔ آپ نے میری زندگی کی ایک بہت بڑی مشکل حل کر دی۔ بے شک مجھے آپ کی تکان اور طبیعت کی خرابی کی بھی کافی فکر ہے پھر بھی یہ عرض کرنے سے خود کو نہیں روک پاتا کہ آج ہی میری اس سے ملاقات کرا دیجیے۔ چاہے آپ کو کتنی ہی تکلیف کیوں نہ اٹھانی پڑے۔"

پھر کچھ دیر آرام کرنے کے لیے دونوں لیٹ گئے۔ لیکن ساری رات جاگتے رہنے کے باوجود دونوں کو نیند نہ آئی۔

کھانے کا وقت ہونے پر بابو کے نوکر نے روٹی پکائی جو نہانے دھونے سے فارغ ہو کر دونوں نے کھائی۔

... * ...

ناول کا ادھورا باب مکمل کرنے کی گپتیشور کو تاکید کر کے سوا بارہ بجے والی گاڑی سے شام داس لاہور چلا گیا۔

گپتیشور کے چہرے پر آج ایسی کامیابی کی خوشی جھلک رہی تھی جیسی اسے ساری زندگی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ آج کاغذ بھی کافی تھے۔ لکھنے کے لیے وقت بھی مناسب تھا اور جگہ بھی اچھی تھی۔ اس کے دل کو بھی اتنی خوشی کم و بیش ہی ملی ہوگی لیکن آج اس کے پاس لکھنے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں تھا۔ آج شکار کھیلنے کا سارا سامان موجود تھا لیکن اس کا شکار کھیلنے کا شوق ہی جیسے ختم ہو گیا تھا۔ روٹی کھا کر وہ چارپائی پر لیٹ گیا لیکن ہونے والی ملاقات کی فکر نے اس کی نیند اڑا رکھی تھی۔

وہ بڑی بے چینی سے اس وقت کا انتظار کرنے لگا جب اس کے مہربان ملاقاتی نے تارا چند کو ساتھ لانے

کا وعدہ کیا تھا۔ اس نے یہ چھ سات گھنٹے ۔ منٹ اور سیکنڈ گن گن کر گزارے اس کی نظر سامنے لٹکے کلاک پر مسلسل پڑتی رہی ۔

آخر پانچ بج گئے ۔ گپتیشور دروازے کے باہر جاکر ٹہلنے لگا ۔ جب بھی سامنے کے موڑ سے کوئی تانگہ اس طرف آتا تو اس کا دل دھڑکنے لگ جاتا ۔ کئی تانگے آئے اور گزر گئے ۔ اس کی بے صبری ہر لمحہ بڑھتی جارہی تھی ۔

آخر ایک تانگہ آیا ۔ لیکن بابو شام داس اکیلا ہی اترا ۔ لیکن اس نے گپتیشور کے دل کی بے قراری کو فوراً بھانپ لیا اور بولا ۔ " وہ آرہے ہیں ۔! "

گپتیشور کی جان میں جان آئی ۔ اس نے پوچھا " کہاں ؟"

بابو اس وقت ہانپ رہا تھا ۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا ۔ گپتیشور کو اس کی حالت دیکھ کر بڑی فکر ہوئی ۔ اس نے پوچھا " کیا بات ہے ۔ آپ کی یہ حالت کیوں ہے ۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی کیا ؟ "

بابو نے اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بناوٹی ہنسی ہنس کر کہا " نہیں کچھ نہیں ۔ گاڑی میں دیر تھی اس لیے میں بس سے ہی آگیا ۔ راستے میں ایک ایکسیڈینٹ ہوگیا ۔ لاری ایک درخت سے ٹکرا گئی اور کئی لوگوں کو چوٹیں آئیں ۔ مجھے کوئی چوٹ تو نہیں لگی لیکن حادثے کو دیکھ کر میرے دل کی گھبراہٹ کافی بڑھ گئی ہے ۔"

گپتیشور نے گھبرا کر کہا " تو چلیے ۔ اندر چل کر آرام کیجیے ۔ میں نوکر سے کہتا ہوں ، گرم گرم دودھ لائے اور ساتھ ۔۔"

اس کی بات کاٹ کر بابو بولا " نہیں شریمان جی ۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے ۔ میں ذرا اسٹیشن تک جا رہا ہوں ۔ ہمارے جنرل منیجر نے آج کسی ذاتی کام سے یہاں سے گزرنا ہے اس لیے میرا اور کئی دوسرے بابوؤں کا وہاں ہونا ضروری ہے ۔ یہ لیجیے رومال ۔"

رومال گپتیشور کو دے کر وہ اور کوئی بات کہے بغیر ہی تانگے پر جا بیٹھا اور بولا :

" تارا چند سوا چھ بجے آئے گا ۔ آپ یہیں اس کا انتظار کیجیے ۔ میرا خیال ہے وہ پونے پانچ کی گاڑی سے آئے گا ۔"

تانگہ سڑک پر مڑ کر آنکھوں سے اوجھل ہوگیا ۔

سوا چھ کے بجائے سات ہوگئے ۔ لیکن تارا چند ابھی تک نہ آیا ۔ گپتیشور دروازے میں کھڑا سڑک پر گزرنے والے ہر ایک آدمی کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا ۔

اندھیرا بڑھتا جارہا تھا ۔ اسی وقت گپتیشور نے دیکھا ایک لمبے قد کا آدمی دروازے میں آکر کھڑا ہوگیا اور پوچھنے لگا " بابو شام داس کا گھر یہی ہے ؟ "

گپتیشور سمجھ گیا کہ یہی تارا چند ہے۔ وہ بولا "آئیے، کیا آپ کا نام ہی تارا چند ہے ؟"

"جی ہاں" کہہ کر وہ جلدی سے اندر آگیا۔ گپتیشور نے بیٹھک میں پہنچ کر اُسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

تارا چند نے اوورکوٹ پہنا ہوا تھا اور شاید آنکھیں خراب ہونے یا کسی اور وجہ سے دھوپ والا چشمہ بھی لگا رکھا تھا۔ سر کی پگڑی اس نے بڑے بے ڈھب ڈھنگ سے باندھی ہوئی تھی۔ اوورکوٹ کا کالر اوپر اٹھا رکھا تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ سردی سے وہ بہت ڈرتا ہے۔

دونوں کتنی ہی دیر چپ چاپ آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھے رہے۔ آخر گپتیشور نے ہی اس چپ کو توڑتے ہوئے پوچھا "کیوں جی آپ ہی تارا چند ہیں ؟"

وہ بولا تو نہیں لیکن سر ہلا کر اس نے ہاں میں جواب دیا۔

گپتیشور نے پھر کہا۔ "تو کیا میں آج تک آپ کی ہی تلاش میں بھٹکتا رہا ہوں۔ دوسرے لفظوں میں کیا آپ کا ہی لہو پینے کے لیے میں آج تک زندہ ہوں"۔ یہ کہتے کہتے گپتیشور کی آواز میں تیزی آگئی اور اس کی آنکھیں لال ہوگئیں۔

تارا چند پر اس کا کچھ بھی اثر نہ ہوا اور وہ اسی طرح بیٹھا سنجیدگی سے بولا۔ "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

گپتیشور اب غصّے سے کانپ رہا تھا۔ اس کی رگ رگ سے تشدّد پھوٹ رہا تھا۔ وہ اپنے آپے سے باہر ہوکر بولا" کیا کہا، او شیطان ؛ تم میرا مطلب نہیں سمجھے ؛ ٹھیک ہے۔ میں تمھیں مطلب سمجھانے کے لیے ہی تو اتنی مدّت سے ڈھونڈھ رہا تھا۔"

تارا چند پھر بولا " لیکن کیا کوئی اور بات شروع ہونے سے پہلے میں آپ کا تعارف جان سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں ؟" گپتیشور نے کڑک کر کہا " کیا تم کسی گوردئی نام کی عورت کو جانتے ہو ؟"

"جانتا ہوں، لیکن آپ کا اس سے کیا رشتہ ہے ؟"

"رشتہ بتانے کے لیے ہی تو میں آپ کو ڈھونڈھ رہا تھا۔ ہاں تو وہ تیری کیا لگتی تھی؟"

"وہ میری گھروالی تھی۔"

"اور وہ اب کہاں ہے ؟"

تارا چند نے کوئی جواب نہ دیا۔

گپتیشور نے پھر پوچھا "کیا تم اس کے بارے میں جانتے ہو کہ وہ زندہ ہے یا مر چکی ہے ؟"

اسی طرح بے فکر بیٹھے ہوئے تارا چند نے کہا" میں نے سنا ہے کہ وہ مر چکی ہے۔"

"تم نے کس سے سنا ؟"

تارا چند چپ رہا۔

گپتیشور پھر کڑکا "نہیں تو جھوٹا ہے، تو شیطان ہے۔ تجھے اس کے مرنے جینے کی کوئی خبر نہیں اور تجھے اس کی فکر کرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی تجھے صرف اتنا ہی پتہ ہے کہ تو اُسے موت کے مُنہ میں پڑا چھوڑ کر گھر سے نکل گیا تھا۔ اس کے بعد اُس کی کیا دُردشا ہوئی؟ اس کا تجھے کچھ پتہ نہیں ہے۔"

تارا چند اب سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ اس کے منہ سے کوئی بات نہیں نکلی۔

گپتیشور کے لیے اب غصّے کی حالت میں بیٹھنا مشکل ہوگیا۔ وہ تلملا کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں مٹھیاں بھینچ کر بھوکے شیر کی طرح اس کی طرف لپکا۔ اس کی گردن پر مضبوط ہاتھ ڈال کر اور دوسرے ہاتھ سے اس کے کندھے سے کوٹ کو پکڑ کر زور سے جھنجھوڑتے ہوئے بولا "بدذات۔ مکار۔ بولتا کیوں نہیں۔ کیا تیرا خیال ہے کہ اس طرح ڈھونگ کرنے سے میں تجھے زندہ چھوڑ دوں گا؟ یاد رکھ دنیا کی کوئی طاقت اس وقت تجھے میرے ہاتھوں سے نہیں بچا سکتی۔ (دانت پیستے ہوئے) میں اس کو (پھرتی سے کوٹ کے نیچے سے ایک تیز اور چمکیلی کٹار نکال کر) تیری چھاتی میں مار کر تیرا لہو پیوں گا، تب کہیں جا کر میری آگ بجھے گی اور میرا دل ٹھنڈا ہو گا۔ بے شک میں یہ بھی جانتا ہوں کہ بابو شام داس جیسے عظیم انسان کے مکان پر تیرے جیسے چنڈال آدمی کو لا کر میں نے ان کے ساتھ زبردست ناانصافی کی ہے۔ اس پاک جگہ پر تیرا ناپاک لہو گرا کر میں اور بھی گنہ گار بنوں گا لیکن اس وقت مجھے ان باتوں کی ذرا بھی پرواہ نہیں۔ مجھے بھروسہ ہے جب میرے بزرگ بابو شام داس کو تیری شیطانی حرکتوں کا پتہ چلے گا تو نہ صرف یہ کہ وہ میری غلطی کو معاف کر دیں گے بلکہ مجھے شاباشی بھی دیں گے کہ میں نے ایک پاپی چنڈال کو مار کر دھرتی کا بوجھ ہلکا کیا ہے۔

"بتا۔ جلدی بتا.... خیر اگر تو کچھ نہیں بتانا چاہتا تو مجھے اس کے پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں۔ میرے لیے صرف اتنا ہی جان لینا کافی ہے کہ تو میری ماں کا قاتل ہے۔ اس کی عصمت کا لٹیرا ہے۔ شیطان! اگر مرنے سے پہلے کچھ کہنا چاہتا ہے تو جلدی بول۔ میں تجھے پانچ منٹ دیتا ہوں۔"

تارا چند اسی طرح کانپ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں زمین پر تھیں۔ اوپر کی باتیں کئی بار گپتیشور کے دہرانے پر بھی اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

گپتیشور نے پھر بجلی کی طرح کڑک کر کہا:

"او ظالم! سُن اور کان کھول کر سُن۔ ایک ایسا آدمی جو ایک بے سہارا عورت کے ساتھ دھوکا کر کے اس کو جال میں پھنسا کر اُس کی عزت کو مٹی میں ملاتے وقت کچھ بھی شرم نہیں کرتا اور پھر زچگی کی حالت میں اسے اور اس کی معصوم بچی کو در در کی ٹھوکریں کھانے کے لیے اور ساری دنیا کی مُصیبتیں جھیلنے کے لیے چھوڑ کر چلا جاتا

ہے اور آخر اس بیچاری کو شرم و حیا تج کر رنڈی بننا پڑتا ہے۔ اس جیسے بد چلن کو انسان کہلانے کا کوئی حق نہیں اور نا ہی اسے زندہ رہنے کا حق ہے۔"

تارا چند پتھر کا بُت بنا بیٹھا تھا۔ گپتیشور نے پھر پوچھا "کیا ایسے موذی کو زندہ رہ کر دھرتی کا بوجھ بڑھانے کا حق ہے؟ اس بات کا فیصلہ میں تجھ پر ہی چھوڑتا ہوں۔ بتا۔ جلدی بتا۔ کیا ایسے گناہ گار کو زندہ رہنا چاہیے؟"

اس نے سر ہلا کر 'نہیں' میں جواب دیا۔

"تو کیا مرنے کے لیے تو تیار ہے؟"

اس نے سر ہلا کر 'ہاں' میں جواب دیا۔

"تو لے پھر تیار ہو جا۔" کہہ کر گپتیشور نے کٹار اس پھرتی سے اس کی طرف بڑھائی کہ اگر تارا چند کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کو دیکھ کر ہی اس کا دل دہل جاتا۔

اس وقت کمرے میں کافی اندھیرا ہو چکا تھا۔ یہ سوچ کر کہ نشانہ غلط نہ بیٹھے، گپتیشور نے جھکا ہوا ہاتھ روک لیا اور فوراً بجلی کا بٹن دبا دیا۔ کمرہ جگمگا اٹھا۔ اُسے یہ فکر تھی کہ کہیں تارا چند بچ کر نکل نہ جائے۔ اس لیے اس نے کمرے کی کنڈی بھی اندر سے بند کر لی۔

اُس کی نظر جب روشنی میں اس پر پڑی تو اس نے دیکھا کہ تارا چند کانپتے ہاتھوں سے کوٹ اور قمیص کے بٹن کھول کر اپنی چھاتی ننگی کر رہا تھا۔

تارا چند کی یہ بات دیکھ کر کہ جیسے وہ پہلے ہی سے مرنے کے لیے تیار ہو کر آیا ہے، گپتیشور سکتے میں آ گیا۔ پھر اُسے خیال آیا کہ یہ شیطان اس طرح میرا دل نرم کر کے مجھ سے جان بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔

اس نے اور دیر کرنا مناسب نہ سمجھا اور کٹار والا ہاتھ دوبارہ اٹھا کر اس کی طرف اتنی تیزی سے لپکا کہ جیسے ایک ہی حملے سے اُسے زمین پر گرا دے گا۔ لیکن ابھی اس کا ہاتھ اس کی چھاتی تک نہیں پہنچا تھا کہ اس کی نظر تارا چند کے چہرے پر پڑی۔

گپتیشور کا ہاتھ آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹ گیا اور وہ خود آگے بڑھا۔ گردن جھنجھوڑنے سے تارا چند کی پگڑی اتر گئی تھی اور عینک کی کمانی بھی ایک کان سے الجھ کر اتر گئی تھی۔ گپتیشور نے جب اس کے جسم کو ہاتھ لگایا تو وہ پسینے میں نہایا ہوا برف کی طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

گپتیشور چیخ مار کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ دوسرے لمحے وہ آگے بڑھا اور تارا چند کی عینک اتار کر اس کے چہرے کو دیکھا۔ اس کے منہ سے چیخ کی آواز نکلی "ہیں بابو شام داس جی!"

گپتیشور کی آنکھوں کے آگے سارا کمرہ گھوم رہا تھا۔ اُسے یہ سب کچھ جادو کا کھیل معلوم ہوتا تھا۔ کتنی ہی

ALLAHABAD 1975

دیر وہ اسی طرح کھڑا اس کی طرف ٹکر ٹکر دیکھتا رہا۔ ایک بار پھر اُس کا کٹار والا ہاتھ اوپر اٹھا لیکن پھر نیچا ہوگیا اور کٹار اس کے ہاتھوں سے نیچے گر پڑی۔

اب تارا چند کی چھاتی سے گپتیشور لگا ہوا تھا۔ باپ اور بیٹی کا انوکھا اور حیرانی بھرا ملاپ — گپتیشور اور کوئی نہیں، زمانے کی ستائی ہوئی بدنصیب گوردئی کی بیٹی سُندری تھی!

بابو شام داس اُسے گلے سے لپٹائے آنسو بہاتا ہوا کہہ رہا تھا "شیطان باپ کی بدنصیب بیٹی سُندری! تم اب تک اپنے قصائی باپ کو زندہ دیکھ رہی ہو؟"

اس وقت شام داس کی نظر فرش پر پڑی۔ وہ آہستہ سے اُٹھا اور دوسرے لمحے وہی کٹار اس کے ہاتھ میں تھی۔

شام داس نے اپنی چھاتی کی طرف کٹار کی نوک کر کے ہاتھ پیچھے ہٹایا۔ قریب تھا کہ کٹار اس کی چھاتی کو چیرتی ہوئی کمر کی ہڈی سے جا ٹکراتی لیکن فوراً ہی گپتیشور نے دونوں ہاتھوں کے پورے زور سے اس کا بازو تھام لیا۔

اس سے پہلے ہی کٹار کی نوک اس کی چھاتی کو چھوتی ہوئی اس طرح تھر تھرا رہی تھی جیسے ہوا میں دیے کی لَو کانپتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اُس کے کانوں میں پیار بھری آواز اُبھری "پتا جی! بس یہ کام نہ کرنا۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔"

شام داس اس سے کہہ رہا تھا "میری بچی۔ مجھے معاف کر دے۔ سُندری۔ اس ظالم باپ کو بخش دے لیکن زندہ رکھ کر نہیں، مار کر۔ میری بیٹی اب میرا جینا اور پھر تمھارے سامنے زندہ رہنا ہزار بار مرنے سے بدتر ہے۔ اسی وجہ سے میں حلیہ بدل کر تیرے سامنے آیا تھا کہ تیرے کام میں رکاوٹ نہ پڑے۔ سُندری جلدی کر اور اس حالت میں مجھے زندہ رکھ کر میرے گناہوں کی گٹھڑی کو اور بھاری نہ کر۔ تو اپنا فرض پورا کر کے اپنی بدنصیب ماں کے حکم کی تعمیل کر نہیں تو اس کی روح ہمیشہ کے لیے تڑپتی رہے گی اور اس کا گناہ تیری گردن پر ہوگا۔"

سُندری نے اُسے بڑے پیار سے اٹھایا اور چارپائی پر بٹھا کر اس کے گلے میں بازو ڈال کر بولی "پتا جی۔ میرا فرض پورا ہوگیا۔ ماں نے جسے مارنے کا کام میرے سپرد کیا تھا وہ میرے مارنے سے پہلے ہی مر چکا ہے۔ اُس کی بُری عادتیں، اُس کے گناہ ایک ایک کر کے سب مر چکے ہیں اور اب اس کی زندگی ایک ایسے انسان کی زندگی ہے جسے کسی عظیم انسان کی زندگی کہا جا سکتا ہے۔"

بابو شام داس اس وقت دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے سسک رہا تھا۔ سُندری اس کے پاس بیٹھ گئی اور پیار سے اپنا ہاتھ اس کے ماتھے پر پھیرتے ہوئے بولی "پتا جی! آپ جئیں۔ ہزار برس جئیں۔ آپ

کی مجھے بہت ضرورت ہے۔"

بابو کے منہ سے کوئی بات نہیں نکل رہی تھی۔ سُندری پھر بولی "پتا جی اٹھیے ، اٹھیے مجھے پیار کیجیے۔ میں آپ کی سُندری ہوں۔ آہ میرے باپو۔ مجھ سے دل بھر کر پیار کرو۔"

بابو اپنا دھیرج کھو بیٹھا تھا۔ وہ رو رہا تھا۔ سندری نے اس کا ماتھا چوما لیکن اس کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔

اس کے بعد کافی دیر تک دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ جیسے ان کے سارے انگ آنکھوں کا ہی کام کر رہے ہوں۔ سُندری بولی "باؤجی! کیا آپ نے مجھے پہلے ہی پہچان لیا تھا ؟"

بابو خود کو سنبھال کر بولا "بٹیا! پوری طرح تو نہیں لیکن شک سا ضرور پڑ گیا تھا لیکن جب تم نے رومال کی مانگ کی تو میرا یہ شک اور بھی پکا ہو گیا اور اس کے بعد جب تم نے میرا ہی پتہ ٹھکانا پوچھا تو اس وقت میں نے تیری آنکھوں کی طرف دیکھا اور مجھے یقین ہو گیا کہ یہ گپتیشوری سُندری ہے۔ پورا معاملہ اس وقت صاف ہو گیا جب میں نے یہ رومال دیکھا۔"

سُندری کو خیال آیا کہ بچن سنگھ کے پھانسی لگنے کے بعد اس نے رومال کے کونے میں یہ الفاظ کروشیے سے بنائے ہوئے تھے "بدنصیب سُندری کے گمشدہ تاج کی آخری نشانی۔"

اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے بدنصیب شام داس پھر بولا۔ "بیٹی۔ اصل میں تو اس پہچان کی شروعات ایک طرح سے اس وقت سے شروع ہو گئی تھی جب میں نے تجھے سٹیشن پر پکڑا تھا۔ تیری آنکھوں کی طرف نظر پڑتے ہی تیری ماں (گوردئی) کی تصویر سامنے آ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں بالکل تیری جیسی تھیں۔ دوسرے لفظوں میں کل اٹھارہ انیس برس بعد تیری ماں کو تیری ہی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ لیکن اکثر خود بخود لوگوں کے چہرے ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں اس لیے اس طرف زیادہ غور نہیں کیا۔ لیکن بیٹی تیری ساری زندگی کی کہانی سنتے ہوئے اس رومال کا ذکر تو میں نے کہیں نہیں سُنا۔"

سندری نے آنکھیں نیچی کر کے کہا "پتا جی۔ کیا آپ نے سُنا نہیں تھا۔ جب بابے روڈو کی جھونپڑی میں مَیں رہتی تھی تو وہ ایک دن آئے تھے۔ جس دن ہماری سندریا گم ہو گئی تھی۔ میں جب رونے لگی تھی تو انھوں نے رومال نکال کر میری آنکھیں پونچھی تھیں۔ یہ وہی رومال ہے جو اس کے بعد سے میرے ہی پاس رہا۔ بس یہی ان کی ..." کہتے کہتے سُندری کی آنکھیں چھلک پڑیں اور گلا بھر آیا۔

بابو نے ٹھنڈی سانس بھر کر پھر پوچھا "لیکن بیٹی تم نے تو اس میں لکھا ہے کہ سندری دریا میں چھلانگ لگا کر ڈوب گئی تھی ؟"

"میں واقعی ڈوب گئی تھی لیکن مری نہیں تھی۔ مجھے ایک بوڑھے ملّاح نے دریا سے نکال کر بچا لیا تھا۔ وہ بڑا نیک آدمی تھا۔ میں اُسے کبھی نہیں بُھلا سکتی۔"

"اور بٹیا پھر تم امرتسر آگئیں؟"

"جی ہاں۔"

"اور اپنا بھیس کیوں بدل لیا؟"

"اس کی کئی وجوہات تھیں۔ ایک تو پولیس کے ڈر سے۔ کیوں کہ میں نے تین خون کیے تھے۔ دوسرے اُن کا حکم تھا ماں کی پرورش کرنے کا۔ اس لیے ماں کے واسطے کچھ پیسے ادیب بن کر کمانا چاہتی تھی۔ تیسرے میں یہ بھی چاہتی تھی کہ دیگر کتابوں کے علاوہ میں اپنی آپ بیتی بھی لکھوں جس میں اپنے ظالم سماج کے سفید خون کی تصویر کشی کروں، جس سے دنیا کو کچھ فائدہ پہنچے۔ اور چوتھا کام تھا آپ کو... "کہتے کہتے سُندری رک گئی اور اُس کی آنکھیں نیچی ہو گئیں۔

بابو نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے پھر کہا "تو بیٹی اب تو تیرے سارے کام پورے ہو گئے؟"

کچھ دیر چپ رہنے کے بعد سُندری بولی "جی ہاں سب کام اور اب میں مطمئن ہوں۔"

"تو اب تم ہمیشہ کے لیے میری آنکھوں کے سامنے رہو گی نا!"

"ہاں پتا جی۔ جب تک زندہ رہوں گی آپ کے پاس ہی رہوں گی۔"

بابو نے محبت سے بے بس ہو کر کہا "میں اپنی بیٹی کے لیے ابھی جا کر کپڑے سلوا لاؤں گا اور تم اپنا یہ حلیہ بدل لینا۔"

"ہاں پتا جی۔ میں کل اپنا یہ حلیہ ضرور بدل لوں گی اور اپنے اصلی رنگ میں..."

"تجھے اس روپ میں دیکھ کر میں کس قدر خوش ہوں گا۔"

"پتا جی آپ کو ضرور خوش ہونا چاہیئے۔ اگر آپ کا دل خوش نہ ہونا چاہے تب بھی خوش ہونا۔ ایک تو میری کامیابی کی خوشی میں اور دوسرے میرے اصلی روپ میں ظاہر ہونے کی خوشی میں۔"

"واہ میری بھولی بچی۔ میرا دل کیوں نہ خوش ہو گا۔ یہ بھی کوئی بات ہے؟"

"واہگورو کرے ایسا ہی ہو۔"

"ہاں تو بٹیا۔ ادھورے باب کا باقی حصّہ۔"

"وہ کل صبح آپ کے سامنے ہو گا۔"

پھر کچھ دیر ٹھہر کر سُندری بولی "لیکن آپ نے اپنا حال تو کچھ نہیں بتایا۔"

"بیٹی۔ میرے حالات ایسے گناہ آلودہ اور بُرائیوں سے بھرے ہیں کہ تیرے سامنے وہ میری زبان پر آ بھی نہیں سکتے۔ شکر ہے کہ میں نے تمھیں بتا نہیں دیے۔ صرف اتنا ہی بتاتا ہوں کہ جب میں تیری ماں کو موت کے منہ میں چھوڑ کر اور سب کچھ سمیٹ کر بھاگ آیا تھا تو کچھ دن بھٹکنے کے بعد مجھے ریلوے میں نوکری مل گئی۔ وہ بھی اتفاق کی بات تھی۔ ریلوے ملازموں کی ان دنوں ہڑتال چل رہی تھی اور ڈاک گاڑی کے علاوہ سب گاڑیاں بند تھیں۔ آخر ریلوے نے کام چلانے کے لیے نئی بھرتی شروع کی اور مجھے اس طرح ایک جگہ مل گئی۔ اور نام اپنا میں نے اس لیے بدل لیا تھا کہ میری پچھلی زندگی ایسی خطرناک تھی جس سے مجھے کئی طرح کے خطرے معلوم ہوتے تھے۔ یہ بھی ڈر تھا کہ پچھلی جعل سازیوں اور بُری حرکتوں کی وجہ سے کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑے۔"

... ...

اس کے بعد شام داس بازار جا کر اس کے لیے کپڑے لے آیا۔ دونوں کافی رات گئے تک دُکھ سُکھ کی باتیں کرتے ہوئے سو گئے۔

صبح جب شام داس سُندری کے کمرے میں گیا تو اس نے دیکھا کہ زنانہ لباس میں ملبوس سندری لمبی تان کر سو رہی تھی۔ اس نے آوازیں دیں۔ پھر جھنجھوڑا لیکن وہ نہ بولی۔ نہ ہی ہلی جُلی۔ اس نے جب اس کے مُنہ سے کپڑا ہٹایا تو سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ سُندری آخری نیند سو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر نور بکھرا ہوا تھا۔ ہونٹوں پر کامیابی کی مسکراہٹ تھی۔ کل والا رومال اس کی چھاتی پر تھا جسے اس نے دونوں ہاتھوں سے کچھ ایسے ڈھنگ سے پکڑ رکھا تھا جیسے عرصے تک بچھڑنے کے بعد کوئی اپنے محبوب کا ہاتھ پکڑتا ہے۔ رومال کا رنگ گہرا لال ہونے کی وجہ سے بابو شام داس فوراً نہ سمجھ سکا کہ کوئی اور چیز اس رنگ کو اور بھی گہرا کر رہی ہے۔ رومال کے نیچے اُسے کل والا کٹار کا دستہ دکھائی دیا جس کا سارا پھل اس کی چھاتی میں گھسا ہوا تھا۔

بابو کے حلق سے چیخ نکل گئی اور وہ پھپھک پھپھک کر رونے لگا۔ اس وقت اس کی نظر تپائی پر رکھے ہوئے کچھ کاغذوں پر پڑی۔ یہ سُندری کی آخری چٹھی تھی جو اس طرح تھی

میرے محترم پتا جی!

مجھے پتہ ہے کہ آپ بہت دھیرج اور حوصلے والے آدمی ہیں اور ساتھ ہی روحانیت سے بھی واقف ہیں۔ میں اتنی جلدی آپ سے بچھڑ رہی ہوں اس کا دُکھ آپ کو کم نہیں ہوگا۔ لیکن پتا جی! اگر اس سلسلے میں آپ میری حالت کا اندازہ لگائیں گے تو آپ کے دل کو یقیناً قرار آ جائے گا۔

آپ کو پتہ ہے۔ اپنی زندگی کے سرتاج کے بغیر میں نے آخری دو ڈھائی سال کس طرح گزارے ہیں،

یہ بھی ان کے حکم کی تعمیل میں۔ ان کے حکم میں یہ طاقت تھی کہ میں ان سے بچھڑ کر بھی اب تک زندہ رہی۔ نہیں تو میرے لیے ان سے بچھڑ کر ایک سانس لینی بھی دوبھر تھی۔

لیکن پتا جی۔ اتنا کچھ ہونے پر بھی ایک بات مجھے گم صم سا کر دیتی ہے۔ مجھ سے ایک گناہ ہو چکا ہے، صرف گناہ ہی نہیں اپنے مالک کی حکم عدولی بھی۔ اس کے بدلے واہیگورو تو مجھے سزا دے گا ہی لیکن مجھے ڈر ہے کہ پتہ نہیں وہ مجھے معاف کریں گے یا نہیں۔

وہ گناہ ہے بالا سنگھ اور اس کے تین ساتھیوں کی جانیں لینے کا۔ لیکن میں اس وقت اندھی ہو گئی تھی۔ غصے اور ہنسا نے میری عقل گم کر دی تھی۔ انھوں نے مجھے سمجھانے کی حد سے زیادہ کوشش کی تھی اور میں سمجھ بھی گئی تھی لیکن پھر بھی پتہ نہیں کیا ہو گیا کہ میں یہی سوچنے لگی کہ ان کے خون کا بدلہ لینے کا اس سے بڑھ کر اور کوئی طریقہ نہیں۔ لیکن مجھے آج پتہ چلا ہے، پتا جی۔ آپ کی طرف دیکھ کر۔ میری آج آنکھیں کھلی ہیں کہ بدلہ لینے کا سب سے اچھا اور قدرتی ڈھنگ یہی ہے کہ جس طرح کا بدلہ میں نے آپ سے لیا ہے۔ یعنی کس طرح میری تخلیقات کو پڑھ کر آپ کی زندگی کا رُخ بدل گیا ہے۔ یہی ہتھیار اگر میں ان قاتلوں پر استعمال کرتی اور دل کی جگہ دماغ اور چھری کی جگہ قلم سے کام لیتی رہتی تو نہ صرف ان کی زندگی ہی بدل جاتی بلکہ اور بھی کئی بھٹکے ہوئے سیدھے راستے پر آجاتے۔ لیکن گزرا وقت ہاتھ نہیں آتا۔ اس لیے پتا جی آپ خالقِ کائنات کے حضور میں یہی پرارتھنا کریں کہ وہ مجھ پر رحم کرے۔

میرے لیے ان کا حکم تھا کہ جب تک ان کی بوڑھی ماں کی طرف سے بے فکر نہ ہو جاؤں تب تک اُن کے پاس نہ جاؤں۔ اس لیے پتا جی۔ اب جب آپ مجھے مل گئے ہیں تو میں اپنی ساس کی طرف سے ہمیشہ کے لیے بے فکر ہو گئی ہوں اور یہ بوجھ آج سے آپ کے کندھوں پر ہے۔

اس کے علاوہ اپنی ماں کا جو فرض میرے ذمے تھا اس کو بھی اتار چلی ہوں۔ اس کی آتما ۔ جو آپ کے لہو سے شانت ہونا چاہتی تھی، آپ کے آنسوؤں سے اس سے بھی زیادہ شانت ہو گی۔ اس کی مجھے پوری امید ہے۔

چوتھا فرض جو میرے ذمے تھا وہ تھا اپنی آپ بیتی کو ناول کی شکل میں لکھ کر پتھر دل اور بے رحم سماج کا جیتا جاگتا خاکہ کھینچ کر دنیا کے سامنے رکھنا۔ یہ کام بھی پورا ہو گیا ہے۔ اب میں اپنی زندگی کے سارے فرض مکمل کرنے کے بعد جسم کا برتن اس سماج کے سر پر پھوڑ کر اپنے پریتم کے چرنوں میں جا رہی ہوں۔

میرے پیارے پتا جی! آپ نے خود ہی رات کو کہا تھا کہ میں بیٹی تجھے اصلی روپ میں دیکھ کر خوش ہوں گا اس لیے مجھے امید ہے کہ آپ اپنے وعدے کو ضرور نبھائیں گے اور مجھے میرے اصلی روپ میں دیکھ کر ضرور خوش ہوں گے۔

یں زندہ رہ کر اپنے باپ کے سائے کی خوشی نہیں حاصل کر سکی لیکن پتاجی میری زندگی اب اُس ڈوری کی طرح تھی جس کے بغیر چرخا نہیں کاتا جا سکتا۔ اور پھر ٹوٹا ہوا دل کتنی چوٹیں برداشت کر سکتا ہے؟ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس وقت میں ایک مفرور خونی کی حیثیت میں ہوں۔ اس لیے پھانسی لگنے کے بجائے چھری کھانے کو زیادہ بہتر سمجھتی ہوں۔

میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ جب تک زندہ رہوں گی آپ کے پاس ہی رہوں گی۔ وہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میرا اقرار آخر تک سچا ثابت ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ادھورے باب کو پورا کرنے کی بھی آپ نے کئی بار تاکید کی تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ میری کتاب اور میری زندگی اصل میں دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ اس لیے جہاں آج میرے ناول کا ادھورا باب مکمل ہوتا ہے اس کے ساتھ ہی میری زندگی کے ناول کا بھی ادھورا باب مکمل ہوگیا ہے۔

میرے محترم پتاجی! آشیش دیجیے کہ میں سورگ میں جا کر اپنے پریتم کے گلے لگ کر اس طویل ہجر کے دکھ کو بھول جاؤں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے سرتاج کی خدمت کرتی رہوں۔

میرے پیارے پتاجی۔ آپ کی بچی کی طرف سے آخری پرنام۔ زندگی میں پہلی اور آخری بار مل کر ہمیشہ کے لیے بچھڑنے والی راستے کی ایک مسافر۔

آپ کی

سُندری

Form No,] Book No............

UNIVERSITY LIBRARY, ALLAHABAD

Date Slip

The borrower must satisfy himself before leaving the counter about the condition of the book which is certified to be complete and in good order. The last borrower is held responsible for all damages.

An overdue charge will be charged if the book is not returned on or before the date last stamped below.

The University Library
Allahabad
Accession No. 308136
Call No. 844-u
251
(Form No. L 28 1,00,000—72)

اس سلسلے کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کی ہر زبان کی کچھ منتخب معیاری اور عام پسند کتابوں کا ترجمہ دوسری ہندوستانی زبانوں میں کیا جائے اور اس کے ذریعہ اس خاص علاقے اور وہاں کے رہنے والوں کی تہذیب، اُن کے رہن سہن، رسم و رواج، غم اور خوشی کا تعارف دوسرے علاقوں کے پڑھنے والوں سے کرایا جا سکے۔ کتابوں کا انتخاب اِسی مقصد کے پیشِ نظر کیا جائے گا اور عام طور پر کتابیں حالیہ دور اور عصری ادب سے لی جائیں گی۔

ہمارے ملک میں بہت سی زبانیں ہیں لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ پڑوسی زبانوں کے اظہارِ خیال یا تہذیبی اور سماجی دھاراؤں سے ہم بہت کم واقف ہیں اور اس طرف توجہ بھی کم دی گئی ہے۔ یورپ جیسے برِاعظم میں جہاں الگ الگ ملک ہیں اور اُن کی زبانیں بھی مختلف ہیں یہ ممالک اس سے کہیں زیادہ روابط رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کو ادبی اور تہذیبی سطح پر متاثر کرتے ہیں۔

ہمیں اُمید ہے کہ اس قسم کے ربط سے ہمارے مختلف لسانی علاقوں کے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے میں مدد ملے گی اور وہ ایک دوسرے کو زیادہ سمجھ سکیں گے۔ قومی یکجہتی کے کام میں بھی اس سے مدد ملے گی۔

844
251 U